تحریک ختمِ نبوۃ

(1934ء تا 1953ء)

یادداشتیں، آپ بیتی

ماسٹر تاج الدین انصاری رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب انیف کاشر

Marfat.com

Marfat.com

تحریک ختم نبوت

1934ء تا 1953ء،

یاداشتیں آپ بیتی

988
M.303

اثرِ خامہ

ماسٹر تاج الدین انصاری رحمتہ اللہ علیہ

ترتیب

انیف کاشر

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

297-44
21
159134

نام کتاب — تحریک ختم نبوت

اثرِ خامہ — ماسٹر تاج الدین انصاریؒ

ترتیب — انیف کاشر

ناشر — احرار فاؤنڈیشن پاکستان

قانونی مشیر — چودھری محمد ظفر اقبال (ایڈووکیٹ)

کمپوزنگ

سن اشاعت — جنوری 2015ء

تعداد — 1000

قیمت...... 320

ملنے کا پتہ — ﴿احرار فاؤنڈیشن پاکستان﴾

69/C حسین سٹریٹ نیو مسلم ٹاؤن وحدت روڈ لاہور 042-35912644

رویم پبلشرز، الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور 0333-4181813

راوی پبلشرز، الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور 0345-4233071

بخاری اکیڈمی، مہربان کالونی ایم۔ڈی چوک ملتان 0300-6326621

مکتبہ معاویہ، جامع مسجد روڈ چیچہ وطنی ضلع ساہیوال 040-5482253

Marfat.com

انتساب

تحریک ختم نبوت کے پہلے شہید

سیدنا حبیب ابنِ زید انصاری رضی اللہ عنہ

شہدائے جنگِ یمامہ

شہدائے 1934ء

شہدائے 1953ء

شہدائے 1974ء

اور

دیگر تمام شہدائے ختم نبوت کے نام

☆☆☆☆

Marfat.com

PANJAB
UNIVERSITY
LIBRARY

Marfat.com

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	ماسٹر تاج الدین انصاری رحمتہ اللہ علیہ اور تحریک ختم نبوت انیف کاشر	1
2	ماسٹر تاج الدین انصاری رحمتہ اللہ علیہ تب وتاب جاودانہ ڈاکٹر محمد عمر فاروق	5
3	تحریک ختم نبوت اور ماسٹر تاج الدین کا اسلوب نگارش پروفیسر خالد لاہوری	8
4	پسِ منظر (تحریک تحفظ ختم نبوت) چوہدری افضل حق رحمتہ اللہ علیہ	11
5	گزارشِ احوال واقعی	19
6	تحریک ختم نبوت	20
7	تبلیغ کانفرنس کے بعد	20
8	حکم مل گیا	22
9	مجھے کیا کرنا چاہیے؟	23
10	گل نور	25
11	مرزا محمود کی سخت گیری	27
12	خلیفہ محمود کی مخالفت	28
13	قادیان کے مسلمان	28
14	قادیان میں احرار کا مدرسہ اور کارخانہ	30
15	مرزا محمود کی بوکھلاہٹ	31
16	قادیان سے آٹھ میل دور شاہ صاحب کی تقریر	32
17	پابندی کی وجہ	33
18	قادیان میں داخلہ	34
19	قادیانی محل کی سیر	35
20	لٹھ بند مرزائی رضا کاروں کا مسجد میں داخلہ	36
21	رب جی یا رب جی قادیان	39
22	ہفت روزہ اخبار	41
23	گل نور کی آزمائش	42

Marfat.com

24	اخبارات میں مقدمے کی روداد	46
25	مرزائیوں میں انتشار	47
26	خوفناک سازش	50
27	خطرناک کہانی	52
28	مسجد شہید گنج کا حادثہ	53
29	پاکستان میں تحریک تحفظ ختم نبوت	54
30	تحریک تحفظ ختم نبوت پاکستان میں	56
31	احرار کیا کرتے؟	57
32	حکومت کی پریشانی	58
33	حضرت امیر شریعتؒ کی رہنمائی	61
34	کشمیر کا راستہ	63
35	گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر	64
36	فرقان بٹالین	66
37	کارتوس ختم ہو گئے	67
38	صاحبزادہ سید فیض الحسن	69
39	قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم کی تشریف آوری	71
40	تین مرزائی اُمیدوار	72
41	چک جھمرہ میں مرزائیوں کی غنڈہ گردی	74
42	سیالکوٹ یعنی سر ظفر اللہ کی جنم بھومی میں دردناک واقعہ	79
43	دو اہم گرفتاریاں	84
44	شیخ صاحب جیل میں بیمار پڑ گئے	86
45	بلا مقابلہ نشستوں کی پیشکش	87
46	یوم تشکر	88
47	تحریک تحفظ ختم نبوت	89
48	کراچی میں قادیانیوں کا جلسہ	91

Marfat.com

49	حکومت بھی حرکت میں آ گئی	93
50	خواجہ ناظم الدین نے سر ظفر اللہ کو روکا	93
51	رمضان المبارک کیا آمد	95
52	صاحبزادہ سید فیض الحسن کی گرفتاری	99
53	حضرت مولانا ابوالحسنات کی تائید	100
54	انتقام	105
55	خداوندانِ جیل	107
56	میں جب جیل میں تھا تو باہر کیا ہو رہا تھا	110
57	کنونشن کا دوسرا دور	111
58	مجلس عمل کا قیام	116
59	مجلس عمل کی مکمل تشکیل	117
60	مرزا محمود کو خواب آیا	118
61	خواب کی تعبیر	119
62	دوسرا خطرناک واقعہ	122
63	سر ظفر اللہ خان کی لمبی تقریر	130
64	52ء گزر گیا	131
65	مرزائیوں کا پراپیگنڈہ	134
66	ملتان کا فائرنگ کیس	137
67	خواجہ ناظم الدین سے ملاقات	147
68	بھگت سنگھ کی پھانسی	148
69	مجلس عمل آل مسلم پاکستان کنونشن کی تیاری	152
70	مودودی صاحب کی جماعتی عصبیت	158
71	الٹی میٹم	166
72	خواجہ ناظم الدین کی لاہور آمد	168
73	مرزائیوں کا کالج	170

Marfat.com

74	خواجہ صاحب سے ملاقات	171
75	شیخ حسام الدین کی دہلی روانگی	174
76	کراچی میں تحریک تحفظ ختم نبوت	175
77	لاہور میں جلسۂ عام	176
78	کراچی میں جلسۂ عام	182
79	حضرت امیر شریعتؒ کا خطاب	186
80	گرفتاری	188
81	جیل کی مصیبت	193
82	کراچی جیل سے روانگی	197
83	بوبھت ڈاکو	203
84	خواجہ ناظم الدین کی برطرفی	205
85	ہمارا شغل	215
86	اچانک ملاقات	217
87	رمضان المبارک	219
88	قیدیوں کی درجہ بندی	221
89	عدالت کا نوٹس	222
90	لاہور میں حالات کی رفتار	227
91	عظیم الشان جلسہ	232
92	مولانا بہاء الحق قاسمی	242
93	کرفیو آرڈر	243
94	داستانیں	250
95	میاں ممتاز محمد خان دولتانہ	252
96	بیانِ صادق	256

Marfat.com

ماسٹر تاج الدین انصاری رحمۃ اللہ علیہ اور ''تحریکِ ختم نبوت''

انیف کاشر

ماسٹر تاج الدین انصاری ایک فکر، ایک تحریک، ایک جذبے اور ایک منفرد سوچ کا نام ہے۔ وہ دین و سیاست کی یکجائی پر یقین رکھنے والی سیاسی و مذہبی شخصیت کے حامل تھے۔ ''مجلس احرار اسلام'' کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہراوّل دستے کے اُن عمائدین میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک نصب العین اور ایک آدرش کے لیے اپنی زندگی گزار دی۔ 1920ء سے پہلے وہ لدھیانہ کے صاحب ثروت اور متمول افراد میں سے ایک تھے۔ انہوں اپنی املاک و جائیداد فدایانِ اسلام کی نذر کر دی۔ اُن کے شیشہء دل پر نہ کبھی گرد ملال آئی اور نہ جبین نیاز پر کبھی کوئی شکن اُبھری۔ وہ سراپا احرار اور مردِ مومن اور بطل حق آگاہ تھے۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے فرعون صفت، شداد طینت اور قہر ہامانی رکھنے والے حکمران اُن کا سامنا کرنے سے کتراتے اور گھبراتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے قول و عمل کی صداقت و جرأت ایمانی سے دہر کے چہرے کو روشن کیا۔

ماسٹر صاحب پکے مؤحد اور سچے عاشق رسول ﷺ تھے۔ ''مجلس احرارِ اِسلام'' کی تحریک ختم نبوت کے روح رواں رہے۔ انہوں نے اپنے قول و عمل اور فکر و قلم سے ردِّ مرزائیت کا علم اپنی آخری سانسوں تک بلند کیے رکھا۔

'' تحریک ختم نبوت'' ماسٹر تاج الدین انصاری کی ایک ایسی کتاب ہے جسے ہر کہ و مہ اور ہر عمر کے مرد و زن باالاشتیاق پڑھیں گے۔ گو بظاہر یہ یادداشتیں ہیں مگر اردو ادب کی دیگر نثری اصناف کی رو سے اسے دیکھیں تو یہ کئی اصناف کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ اس کثیر الاجہت تصنیف میں تحریک قادیاں کے ہر گوشے اور ہر پہلو پر خامہ فرسائی کی گئی ہے جو لائقِ صد ستائش ہے۔

ماسٹر صاحب نے اپنی زندگی میں ہی سب سے پہلے مجلس احرار کے ترجمان روزنامہ '' آزاد'' کے 1956ء کے بعض شماروں میں اس کی چند اقساط شائع کرائیں پھر 1956ء کے اوائل اور 1957ء کے اواخر میں مجلس کے ترجمان روزنامہ ''نوائے پاکستان'' میں ماسٹر صاحب کی نظر ثانی کے بعد یہ کتاب بالاقساط شائع ہوئی۔ ایک صاحب نے من مانی کرتے ہوئے اس کتاب کے مندرجات میں قطع و برید کی۔ اس کے تحریفانہ عزائم کے پس پردہ ایک تو اس کی ذاتی انا کی تسکین تھی اور دوسرے وہ اس تحریک کا سہرا اپنے دل پسند افراد کے سر باندھنے کے خواہش مند تھے۔ ''تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ'' کے مصداق اس کے ارادوں کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ہم خالد جانباز مرزا مرحوم مغفور کے بہت ممنونِ احسان ہیں کیونکہ انہوں نے

Marfat.com

اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہماری بہت اعانت کی ۔ انہوں نے احرار کے مایہ ناز سپوت مرزا غلام نبی جانباز مرحوم کی ذاتی لائبریری احرار کے سپرد کردی۔ راقم کو بڑی تگ و دو کے بعد انہی اخبارات میں سے اصل متن نہایت خستگی کی حالت میں دستیاب ہوا جسے بڑی حزم و احتیاط سے کمپوز کیا گیا ہے اور اب یہ یادداشتیں پہلی مرتبہ اپنی اصلی حالت میں کتاب کے صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔

اس تصنیف میں ماسٹر تاج الدین انصاری نے ''قادیاں'' گاؤں کے مسلمانوں کی اجیرن کی گئی زندگی کا نقشہ کھینچ دیا ہے اور مرزا محمود کی منتقم مزاجی اور شقاوتِ قلبی بھی بے نقاب کردی ہے۔ مزید یہ کہ قصرِ خلافت میں خلیفہ نے جو گل کھلائے اُن کا بیان ہے۔ مولوی مہر الدین اور ان ایسے متعدد مجاہدین احرار کی جاں سپاری اور جذبہء عشق مصطفوی ﷺ کا ایمان افروز تذکرہ بھی ہے اور اُن راسخ العقیدہ مسلمانوں کا بھی مذکور ہے جو عالم فاضل نہ ہوتے ہوئے بفیض نبی خاتم ﷺ میدان مناظرہ کے شہسوار بنے۔

'' قادیاں'' کو دارالفساد، کفرستان اور بیتِ خباثت بنانے والے اور پھر اس کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے کا مذموم ارادہ رکھنے والے شر پسندوں کے فکری تشنج اور ذہنی کوڑھ پر ضربِ کلیمی لگانے والوں کی داستان عزم و استقلال ہے۔ یہ اُن عظیم ہستیوں کا تذکرہ بھی ہے جنہوں نے تحریک ختم نبوت ﷺ یا ردِّ مرزائیت میں تن من دھن کی بازی لگادی۔

''تحریک ختم نبوت'' ایک ایسی کتاب ہے جو ہر دو تحاریک (1934ء اور 1953ء کی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ ماسٹر جی نے مرزائیت کا کچا چٹھا کھولنے کے ساتھ ساتھ اُن مصائب و آلام کو بھی طشت از بام کیا ہے جو مجلس احرار اسلام اور دیگر جماعتوں کو 1934ء اور 1953ء میں برداشت کرنا پڑے۔ جب یہ یاد داشتیں تحریر کی جارہی تھیں تو اُس وقت بہت سی شخصیات بقید حیات تھیں، اسی لیے وہاں حال کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مگر اب جب یہ کتاب پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہے تو ماسٹر تاج الدین انصاریؒ کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تقریباً نصف صدی بیت چکی ہے اور وہ شخصیات جن کا اس کتاب میں مذکور ہے وہ بھی مدت گزری داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں۔ تاہم اس کتاب کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کیونکہ ان چہروں کا موجود یا نا موجود ہونے سے حقائق و واقعات کی صحت متاثر نہیں ہوتی۔

ماسٹر تاج الدین انصاری کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ان شخصیات کی دلیری، بے باکی، اولوالعزمی، جذبہ جہاد اور اخلاص عمل کی کھلے بندوں ستائش کی ہے۔ مصائب سے ٹکرانے اور طالع آزماؤں کو زمین بوس کرنے میں جن شخصیات نے تن من دھن قربان کردیا، ان کی تعریف میں ماسٹر صاحب نے بخل سے کام نہیں لیا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری نے کمال مہارت اور چابکدستی سے ان چہروں کو بھی بے نقاب کردیا

Marfat.com

ہے جنہوں نے شہدائے ختم نبوت سے غداری کی اور حکومت وقت کے آلہ کار اور مخبر نا ہنجار بن کر تحریک ختم نبوت کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ماسٹر صاحب نے ایک ایک کر کے سب گماشتوں کے خوب لتے لیے ہیں۔

''تحریک ختم نبوت'' اُن مسلمانوں کی دینی اور نیم سیاسی جدوجہد سے عبارت ہے جنہوں نے عزم و ہمت کا خود پہن کر، صداقت وحوصلہ مندی کی سپر اٹھا کر، جرأتِ ایمانی اور اعلیٰ قدروں کی شمشیر سے شجرِ مرزائیت پر ضربِ کاری لگائی اور اس کی بیخ کنی میں حیاتِ مستعار کے روز وشب صرف کر کے دنیا اور عاقبت میں سروخروئی کا تاج پہنا۔

تحریک ختم نبوت (1953ء) پاکستان کے فکری اور نظریاتی استحکام کی مسلسل جدوجہد ایک ایسا مرحلہ تھا جو آنے والے ادوار میں سیاسی معاملات کے تعین کے ضمن میں عمل فیصل ثابت ہوا۔ اپنوں اور بیگانوں نے اس تحریک کو سبوتاژ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ تحریک ختم نبوت (1953ء) کے حوالے سے انہوں نے آقائے دو جہاں، سرور کائنات، فخر موجودات کی ناموس پر قربان ہونے کے حوصلے ،ولولے اور جذبے کو سراہنے کے ساتھ ساتھ جابر حاکمان وقت کے ظلم و جور اور قہر وتشدد کی دلدوز داستان بھی رقم کر دی ہے۔ انہوں نے بیگانوں کی منفی سوچ کے علاوہ اپنوں کی احمقانہ سوچ کی قلعی بھی کھول دی ہے۔ ایک نام نہاد اسلامی جماعت کے ''صالحین'' اور اُس کے سرخیل نے عام مسلمانوں کی سماعتوں میں کئی انداز سے زہر پاشی کی۔ انہوں نے اپنی کج فکری کا ثبوت دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ تحریک ختم نبوت پاکستان میں فرقہ واریت کا زہر پھیلا رہی ہے۔ اگر غیر جانب داری اور عدل وانصاف سے دیکھا جائے تو یہ کہنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ اس تحریک نے امت مسلمہ کے جملہ فرقوں کو منظّم اور یک جہت کر کے اتحاد امت کا ایک عظیم الشان ثبوت دیا اور یہ باور کرایا کہ ''عمل سے فارغ ہوا مسلمان کر کے تقدیر کا بہانہ'' کا مسئلہ ہو یا ''فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں'' کا معاملہ ہو، مگر جب ناموس رسالت کے تحفظ کا مرحلہ آئے تو پھر حرم کی پاسبانی کے لیے مسلم ایک ہو جاتے ہیں۔

ماسٹر تاج الدین انصاری نے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات اور کاروانِ احرار کے عمائدین و کارکنان کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اپنی باطنی کیفیات بھی کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ اُنہوں نے نہ صرف فرنگی گماشتوں اور ان کے آقاؤں کی چیرہ دستیوں کو طشت از بام کیا ہے بلکہ ان کے نفسیاتی محرکات کا تجزیہ بھی کر دیا ہے۔ ماسٹر صاحب قلم کی حرمت کی پاسداری پر ایمان کامل رکھتے تھے۔ اُن کی تحریر کا بے ساختہ پن اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ صداقت، عدالت اور شجاعت کا علم بلند رکھنا مجاہدین کا ہی کام ہوتا ہے۔

Marfat.com

ماسٹر صاحب نے اعلائے کلمۃ الحق کے مشن میں اپنی زندگی گزاری ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سر ظفر اللہ خان قادیانی اور اس کے گماشتوں نے سیاسی قوت کے زعم میں بہت قابل مذمت طرز عمل اپنایا۔ انہوں نے جس طریقے سے سازشوں کے جال بُنے ماسٹر صاحب نے ان تزویراتی ہتھکنڈوں کو اپنے مخصوص انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ یہ لوگ مسلم لیگ کے آڑ میں مرزائیت کی تبلیغ کے لیے پاکستان میں نقب لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

7، ستمبر، 1974ء کو قادیانیوں، مرزائیوں یا احمدیوں کو جب غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تو انہوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر یہ لوگ مسلمان ہیں تو کیا یہ اس تاریخی حقیقت سے انکار کریں گے کہ انہوں نے 1927ء میں ''کلمۃ الفیصل'' کے عنوان سے اُمتِ مسلمہ سے رشتہ ناتا، بیاہ ونکاح، نماز جمعہ اور نماز جنازہ میں اپنی مکمل علیحدگی کا باضابطہ اعلان بھی کیا تھا۔ مزید یہ کہ 1940ء میں ضلع گورداسپور کی مردم شماری کے خانے میں اپنی شناخت مسلمان یا احمدی مسلمان نہیں بلکہ فقط ''احمدی'' کے طور پر درج کروائی تھی۔

سر ظفر اللہ خاں نے مرزائیت کی تبلیغ کے ضمن میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ مولانا مودودی نے اس دور میں ایک کتاب ''بیان حقیقت'' قلم بند کی تھی۔ مودودی صاحب نے اپنی تحریروں اور اپنی تقاریر میں در بطنِ کلمہ بھی اور پھر علی الاعلان بھی تحریک ختم نبوت کو ایک فتنے سے موسوم کیا تھا۔ اُن کے اس عمل سے جملہ مسلمانانِ عالم کے دل پر چھری چل گئی۔ ایسی گستاخی کا ارتکاب تو مرزائیوں نے بھی نہیں کیا تھا مگر موصوف کے حلقہءِ اطاعت کے احباب نے بیگانوں سے بھی زیادہ اوچھا وار کر دیا اور اپنے ہی نشیمن پر بجلی گرادی۔ جو لوگ تحریک ختم نبوت میں حصہ لینے والوں کو محض اَحراریوں اور خود غرض غنڈوں کی تحریک خیال کریں ایسے ''صالحین'' کو اگر آستین کے سانپ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اِنہی ایام میں ماسٹر تاج الدین انصاری رحمتہ اللہ علیہ نے ''بیانِ صادق'' کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا جس کا دیباچہ قائد احرار جانشین امیر شریعت' سید ابو معاویہ ابوذر بخاریؒ کی جنبش قلم کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ اس کتابچے کے مندرجات میں بہت سی باتیں وہی ہیں جو بعد ازاں ماسٹر جی نے ''تحریک ختم نبوت میں رقم کی تھیں۔ باایں ہمہ اس کتابچے کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ اس میں کچھ ایسے امور بھی زیر بحث آئے ہیں جو ''بیان صادق'' میں درج ہیں۔ گویا یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ ''بیان صادق'' ایک ایسی تحریر ہے جو مولانا مودودی کی ''بیان حقیقت'' کے جواب میں رقم کی گئی۔ ''بیان صادق'' کے عنوان سے شائع ہونے والے کتابچے کا دوسرا ایڈیشن 1969ء میں طبع ہوا تھا۔ اب وہی کتابچہ نظریہءِ ضرورت اور قندِ مکرر کے طور پر اس کتاب میں بطور ضمیمہ شامل کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

ماسٹر تاج الدین انصاری ___ تب وتابِ جاودانہ

ڈاکٹر محمد عمر فاروق (تلہ گنگ)

''مجلس احرار اسلام'' کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ برصغیر میں یہ واحد جماعت ہے جو عقیدہ ءِ ختم نبوّت کے تحفظ اور قادیانیت کے فتنے کے سدِّ باب کے لیے 1929ء میں قائم کی گئی۔ اس کے قیام میں محدث کبیر علامہ سید انور شاہ کاشمیریؒ کا اصولی مشورہ کارفرما تھا۔ چونکہ اکابر احرار بالخصوص حضرت امیر شریعتؒ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ پہلے ہی تحفظ ختم نبوّت کے محاذ پر گرانقدر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔۔ اسی لیے علامہ سید انور شاہ کاشمیریؒ نے 1930ء میں پانچ سو علماء کی معیت میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو فتنہ ءِ قادیانیت کے استیصال کے لیے ''امیر شریعت'' نامزد فرمایا۔

1931ء میں ''مجلس احرار اسلام'' نے کشمیری مسلمانوں کی آزادی کے لیے پہلی عوامی تحریک ''تحریک کشمیر'' چلائی۔ اس وقت قادیانی جماعت نے کشمیر کے مسلمانوں کو مرتد بنانے کے لیے ایک مذموم منصوبہ بنایا اور بظاہر کشمیریوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک جماعت ''کشمیر کمیٹی'' کا ڈول ڈالا۔ احرار رہنماؤں نے قادیانیوں کے سازش کا بروقت ادراک کرلیا اور اپنے تدبر و فراست، جرأتِ ایمانی اور تاریخی صبر آزما جدوجہد سے قادیانیوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

احرار نے 1934ء میں قادیانیوں کے مرکز ''قادیان'' میں فاتحانہ قدم رکھا کہ جہاں پر کسی مسلمان کو دم مارنے کی اجازت نہ تھی مگر وہاں پر ایک عظیم الشان پہلی ''احرار تبلیغ کانفرنس'' کے کامیاب انعقاد کے بعد مسجد ختم نبوّت، (مدرسہ) جامعہ محمدیہ اور غریب مسلمانوں کے روزگار کے لیے کپڑا بننے والی دستی کھڈیاں قائم کی گئیں۔ احرار کے فاتحانہ یلغار اور لگاتار جدوجہد نے قادیانیوں کے لیے بڑھتے ہوئے مظالم اور ارتدادانہ سرگرمیوں کا راستہ روک دیا۔ قادیاں کا غریب مسلمان جو قادیانیوں کے جبر و استبداد کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ احرار کی مجاہدانہ مساعی کی بدولت حوصلہ مند ہوا اور بالآخر قادیانی دہشت گردوں کے سامنے سر اُٹھا کر اور سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ ''مجلس احرار اسلام'' کی اس تحریک تحفظ ختم نبوّت کو جہاں دیگر اکابر احرار کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہیں ایک فقیر منش، انتہائی حوصلہ مند، صاحب تدبیر انسان اور شیر صفت مجاہد حضرت ماسٹر تاج الدین انصاری رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ولولہ انگیز قیادت کا

Marfat.com

شرف بھی حاصل تھا۔ جنہوں نے قریباً ڈیڑھ برس تک قادیان میں مقیم رہ کر وہاں اپنی فہم وفراست اور حکمت وبصیرت کے ہتھیاروں سے قادیانی امت اور اس کے خانہ ساز نبی کے جانشین آمروں کو تگنی کا ناچ نچائے رکھا۔ یہ حضرت ماسٹر جیؒ ہی کے داؤ پیچ کا نتیجہ تھا کہ چند ماہ کے مختصر دورانیے میں:

۱۔ قادیانیوں کے ظلم وتعدّی کا طوفان رُک گیا۔

۲۔ قادیاں کے نادار اور مظلوم مسلمانوں کا اعتماد بحال ہوا اور وہ قادیانی سفّاکوں سے آنکھیں چار کر کے ان کے مقابل فولادی چٹان کی مانند اِستادہ ہو گیا۔

۳۔ قادیانی قیادت کے فرعونی ہتھکنڈے بیکار ہونے لگے اور ظلم ودرندگی کا سیلاب تھم گیا۔

چشمِ فلک نے قادیاں کی تاریخ میں یہ نظارہ پہلی مرتبہ دیکھا کہ قادیانی پوپ پال مسٹر بشیر الدین اور اس کی قادیانی مشینری بری طرح پسپا ہوئی اور قادیانی ذریۃ البغایا ہزیمت اُٹھا کر اپنے ہی زخموں کو چاٹنے پر مجبور ہو گئی۔ یہاں تک کہ ماسٹر جی کے اشارے پر ایک گداگر زادے محمد حنیف نے قادیاں کے بنی زادے یعنی مرزا قادیانی کے ''صاحب زادے'' مرزا شریف احمد کو سائیکل سے گرا کر اُن کے ''متبرک مقامات'' کی اچھی طرح ٹھکائی کی۔ قادیانی فرزند کی اس کھلے عام ''مرمت'' اور دن دیہاڑے ذلت ورسوائی نے قادیانی رعب ودبدبے کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ قادیانی رائل فیملی کی اس سربازار بے عزتی، اور جگ ہنسائی نے خود قادیانی قیادت کو اپنی ہی امت مرتدہ کی نظروں میں بے وقعت کر ڈالا۔ حتیٰ کے سر ظفر اللہ خان کی والدہ اس واقعہ کی شکایت لے کر وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن کی بیوی کے پاس جا پہنچی تھی۔

پاکستان بنا تو ''مجلس احرار اسلام'' نے انتخابی سیاست کو خیر باد کہہ دیا اور اپنی تمام تر سرگرمیوں کو تحفظ ختم نبوت کے لیے وقف کر دیا۔ جب 1953ء میں قادیانی پاکستان کے اقتدار پر شب خون مارنے کے درپے تھے تو مجلس احرار اسلام کے رہنماؤں نے تمام مکاتبِ فکر کو ساتھ ملا کر ایک مضبوط دینی محاذ تشکیل دے دیا اور کل جماعتی مجلس عمل، ''تحفظ ختم نبوّت'' کے پلیٹ فارم سے ایک عظیم الشان تحریکِ مقدس تحفظ ختم نبوّت کا آغاز کیا۔ وقت کی مسلم لیگی حکومت نے اس پُرامن تحریک کو فوج کے سہارے پر کچل ڈالا اور ختم نبوّت کے پروانوں پر وحشیانہ تشدد اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا گیا۔ ''مجلس احرار اسلام'' کو خلاف قانون قرار دے کر دس ہزار احرار کارکنوں اور مجاہدین ختم رسالت کو شہید کر کے قادیانی غداروں کی خوشی کا سامان کیا گیا۔ ریاستی جبر وتشدد اور فوج اور پولیس گردی کے سہارے پر بظاہر تحریک کو

Marfat.com

دبا دیا گیا لیکن حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے خوب فرمایا تھا کہ:

"میں نے اس تحریک کی صورت میں مسلمانوں کے دلوں
میں ایک ٹائم بم رکھ دیا ہے جو وقت آنے پر پھٹے گا اور اس
کی تباہی سے مرزائیت کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

مردِ مجاہد کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور اکابر و کارکنانِ احرار اور تمام مسلمانوں کی قربانیوں کے صلے میں 7، ستمبر، 1974ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔ سُرخ پوشانِ احرار سرخرو ہوئے۔ "فتح قادیاں" (1934) کے بعد "فتح ربوہ" کی کامیابی احرار جگر داروں کا مقدر بنی۔ 27، فروری، 1976ء کو قادیانیوں کے شہر ربوہ (چناب نگر) میں مجلس احرار اسلام نے فاتحانہ قدم رکھا اور وہاں مسلمانوں کی پہلی مسجد، مسجد احرار اور مدرسہ ختم نبوّت کا سنگ بنیاد، جانشینِ امیر شریعت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاریؒ اور مولانا سید عطاء المحسن بخاریؒ کی قیادت میں رکھ کر اپنی زریں روایات کا احیاء کیا۔ الحمد للہ قافلہءِ احرار، تحفظ ختم نبوت کا علم لے کر اب بھی پاک و ہند اور یورپ میں رواں دواں ہے۔

"اَحرار فاؤنڈیشن لاہور" نے اپنے تابناک ماضی کی یادوں کو تازہ رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔ ماسٹر تاج الدین انصاریؒ کی یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ ماسٹر جی اگرچہ احرار زعماء کے ساتھ تحریکِ ختم نبوّت (1953) کی ابتدا میں کراچی سے گرفتار کر لیے گئے تھے۔ لیکن انہوں نے بعد ازاں اپنے رفیقوں کی روایات کو قلمبند کرنے کے ساتھ ساتھ تحریک کے آغاز اور بعد کے واقعات کو کہ جن کے وہ عینی شاہد تھے، بڑی عمدگی سے تحریر فرمایا ہے۔ اِس لیے تحریکِ ختم نبوت کے صفِ اوّل کے رہنما کی حیثیت سے ماسٹر جی کی تصنیف "تحریک ختم نبوّت" کے واقعات و حالات اور حقائق کا ایک بلاشبہ انتہائی مستند ماخذ اور تاریخی اثاثہ ہے جسے پہلی مرتبہ شائع کیا جا رہا ہے۔ جو یقیناً اس مستحسن کام کرنے والوں کے لیے باعث صد شرف و نجاتِ دائمی اور حضرت ماسٹر جیؒ کے لیے صدقہ جاریہ اور توشہ ءِ آخرت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کارکنانِ احرار کو اپنے قابل فخر اکابر احرار اور خُلد نشیں شہدائے ختم نبوّت کے مقدس و مطہر مشن پر تادمِ واپسیں قائم رکھے اور تحفظ ختم نبوّت کے صدقے نجاتِ اُخروی سے بہرہ مند فرمائے، آمین، بجاہ النبی الکریم وآلہ واصحابہ اجمعین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Marfat.com

''تحریک ختم نبوت'' اور ماسٹر تاج الدین انصاری کا اسلوب نگارش

(پروفیسر خالد لاہوری)

ماسٹر تاج الدین انصاری کی کتاب ''تحریک ختم نبوت'' ان کی تحریک قادیان 1934ء سے تحریک ختم نبوت 1953ء تک کی یادداشتوں پر مبنی کتاب ہے۔اس میں سادگی وسلاست کا التزام رکھا گیا ہے مرقع نگاری ومحاکات کے باوصف واقعات یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے پردہ سکرین پر فلم چل رہی ہوتی ہے۔ ماسٹر صاحب نے اپنی تحریر میں محاورات کا استعمال بہت کم کیا ہے۔اس سے ان کے برجستہ پن کو نقصان نہیں پہنچا۔عبارت آرائی اور لفظی حسن وشکوہ کے چکر میں تشبیہ ومحاورہ کا بے جا استعمال نفس مضمون کو مجروح کر دیتا ہے۔ چونکہ ماسٹر صاحب مقصدیت کے قائل ہیں اس لیے ان کی تصنیف ''تحریک ختم نبوت'' اور دیگر نگارشات ان کے مقصدی ادب کی آئینہ دار ہیں۔ ماسٹر صاحب لمحہ موجود کی بات کرتے کرتے ماضی کے اوراق دکھانے لگتے ہیں۔وہ ماضی اور تاریخ کے گوشوں کی اس خوش اسلوبی سے نقاب کشائی کرتے ہیں کہ ہمارا حال اور استقبال بھی اس سے مستنیر ہو جاتا ہے۔ان کے اسلوب کا یہ پہلو کہ ماضی اور مستقبل پہلو بہ پہلو چلتے جائیں واقعی لائق صد تحسین ہے۔ ہمارے اسلاف کی عظمت اور ماضی کی درخشندگی بجا مگر مستقبل کی تابناکی اگر لکھاری کی سوچوں کا محور بنے تو تحریر کی عظمت کو سلام کہنا پڑتا ہے۔

سچے لکھارے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے باک ہوتا ہے اور بے لاگ بات لکھتا ہے۔ کسی منصب یا شخصیت سے ڈرنا اور خوف زدہ ہونا اس کے خمیر میں نہیں ہوتا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری کی نگارشات میں بے خوفی کا یہ وصف خوف خدا کی ہی دین ہے۔خشیت الٰہی کو اپنے قلب میں جگہ دینے والے دنیاوی رکاوٹوں اور مصائب کو پائے استحقار سے ٹھوکر مار کر گزر جاتے ہیں۔ استعماری حکومت سے متصادم ہونا اور ان کے بہی خواہوں کے لتے لینا کارے دارد۔لیکن ماسٹر صاحب اس معاملے میں سرخرو اور سرفراز رہے ہیں۔ان کی زندگی حبیب جالب کے اس شعر کی تفسیر تھی ؎

لاکھ کہتے رہیں ظلمت کو نہ ظلمت لکھنا
ہم نے سیکھا ہی نہیں پیارے بہ اجازت لکھنا

''تحریک ختم نبوت'' صنف کے اعتبار سے یادداشتوں پر مشتمل آپ بیتی ہے مگر اردو ادب کی دیگر نثری اصناف کی رو سے اسے دیکھیں تو یہ کئی اصناف کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ مضمون نگاری، روداد نویسی ،رپورتاژ، خاکہ نگاری، مرقع نگاری، شخصیہ نگاری اور سفرنامہ نگاری۔اس ایک کتاب کی کئی جہات ہیں

Marfat.com

۔اس کثیر الاجہت تصنیف میں ایک وصف ایسا ہے جو ہر پہلو لائق ستائش ہے اور وہ سادگی ۔ سادگی اور سلاست ایک ایسی خوبی ہے جو صفحۂ اول سے شروع ہو کر آخر تک قائم رہتی ہے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری نے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات اور کاروان احرار کے عمائدین و کارکنان کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اپنی باطنی کیفیات بھی آشکار کر دی ہیں ۔اُنہوں نے فرنگی گماشتوں اور ان کے آقاؤں کی چیرہ دستیوں کو طشت از بام بھی کیا ہے اور ان کے نفسیاتی محرکات کی بھی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ماسٹر صاحب نے قلم کی حرمت کی پاسداری کی ہے، تحریر کا بے ساختہ پن اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ صداقت، عدالت اور شجاعت کا علم بلند رکھنا مجاہدین کا ہی کام ہوتا ہے۔

ماسٹر صاحب نے اعلائے کلمۃ الحق کے مشن میں اپنی زندگی گزاری ہے۔انتخابات میں جب مرزائی سرکاری مشینری کا حصہ ہوتے ہوئے ہار گئے تو ماسٹر صاحب اس موقع پر لکھتے ہیں:

> ''غرض یہ کہ مرزائیت کی اس نچلی شکست نے ختم نبوت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ مرزائیوں پر اوس پڑ گئی۔ اقتدار میں حصہ دار ہوتے ہوئے وہ فقیروں اور بے نواؤں کے گروہِ احرار سے بری طرح شکست کھا گئے۔''
>
> (تحریک ختم نبوت)

مرزائیت پھیلانے والے عناصر کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''پاکستان میں مرزائیت کا دارومدار مرزا محمود کی دماغی قابلیت اور سر ظفر اللہ کے بل بوتے پر تھا ورنہ مرزائیت میں کوئی کشش ہے نہ جاذبیت ۔ چنانچہ ربوہ میں فیصلہ ہوا کہ کراچی میں کھلے بندوں تبلیغ مرزائیت کے لیے جلسۂ عام منعقد ہو جس میں سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان تقریر فرمائیں۔اس حکم کی تعمیل میں مسلم لیگ کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان فتنہ ارتداد پھیلانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔''
>
> (تحریک ختم نبوت)

ماسٹر صاحب کا تحریر کے کسی خاص دبستان سے تعلق نہیں ہے۔ انہیں لکھنو سے غرض ہے نہ دلی سے۔وہ اپنے دبستان آپ ہی مبتدی اور آپ ہی خاتم۔ان کے اسلوب میں ایک مخصوص چٹخارہ اور خاص چاشنی ہے۔ بنا برایں ہر موضوع کے مضمون کے مطالعہ سے یک گونہ اہتزاز و مسرت ہوتی ہے۔ عام گفتگو کے دوران غصہ اور خوشی کے جذبات جس طرح ادا کیے جاتے ہیں اس کی زندہ مثالیں ماسٹر تاج

Marfat.com

الدین کی تحریر میں ارزاں ہیں۔ ماسٹر صاحب کی تحریر بہ اعتبار موضوع نہایت سنجیدہ ہوتی ہے لیکن ان کا جوش بیان اور اسلوب کا شگفتہ پن اور الفاظ کی برجستگی ان کی تحریر کے حسن میں اضافہ کر دیتی ہے۔ ان کا انداز نگارش منطقیانہ اور مدلل ہوتا ہے۔ اُن کی تحریر میں پختگی ہے اور بندش الفاظ، روانی، سلاست اور فصاحت پوری طرح کام لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی مرحلے پر قاری بوریت محسوس نہیں کرتا۔ غیر فصیح الفاظ اور غیر بلیغ انداز تحریر سے عبارت کا حسن ماند پڑ جاتا ہے مگر ماسٹر صاحب اس پہلو سے پلو بچا کر نکلتے ہیں۔ سادگی اور روانی کا سحر اپنے اوج پر ہوتا ہے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری نے اپنے محسوسات کے بیان میں کسی بھی نوعیت کی مصلحت کی ملمع کاری نہیں کی۔ بے دھڑک اور بے لاگ انداز میں اپنے جذبات بیان کر دینا ان کا وتیرہ ہے۔ ان کی تحریروں میں لفظی تصویر کشی بہت دلفریب ہے۔ جب وہ کسی اور زمانے کی بات کرتے ہیں تو ان کا تخیل اپنی خاص سحر کاری دکھاتا ہے اور جب وہ اپنے زمانے کی بارے میں بات کرتے ہیں تو تشبیہات واستعارات کا استعمال بہت عمدہ ہوتا ہے۔ بے شک تشبیہ کے لیے تخیل کی بلند پروازی ضروری ہے مگر تشبیہ دینا بنفسہٖ خوبصورت عمل ہے۔ تخیل کی کارفرمائی نے ان کی تحریر کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

تحریر کا بنیادی اصول ہے کہ مطلب اور ضرورت کی بات کرنی چاہیے۔ غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا جائے۔ جو بات دل میں ہو اُسے نہایت سادہ اور سلیس انداز میں دوسروں تک پہنچایا جائے۔ نامناسب تفصیلات اور مترادفات کا بے دریغ استعمال عبارت کے حسن کو گہنا دیتا ہے۔ ماسٹر تاج الدین نے بھی مدعا نگاری کو ہی اوّلیت دی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں خلوص اور صداقت ہے۔

ماسٹر تاج الدین کی تحریر کا ایک تخصص ان کا جوش بیان ہے جو ان کے احساس کمال اور احساس عظمت کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں میں جذبہ عشق رسول ﷺ اور ان کی اسلام سے محبت پر دال ہے۔ اس معاملے میں وہ بات بڑے اعتماد اور وثوق سے کرتے ہیں۔ یہ اعتماد ان کے اسلوب کو توانائی کے جوہر سے ہمکنار کرتا ہے۔ ماضی میں مسلمانوں نے محبت رسول ﷺ کے ضمن میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں ماسٹر صاحب عہد حاضر کے مسلمانوں میں وہی جذبہ ایمانی دیکھنے کے تمنائی ہیں۔ وہ ان اسباب وعلل کی ٹوہ لگاتے ہیں جن کے سبب اسلاف کی میراث گنوا دی گئی اور آسمان نے ثریا سے زمین پر ہم کو دے مارا۔ ان کی تحریر کے مندرجات مسلمانوں میں عظمت رفتہ کے نقوش اس لیے واضح کرتے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں مستقبل کی راہیں اجالی جائیں۔ توحید ورسالت پر کامل ایمان رکھنے والے دنیاوی جلب زر اور منصب وجاہ کی قطعی پروا نہیں کرتے۔ مختصر یہ کہ ماسٹر تاج الدین انصاری رحمتہ اللہ علیہ لکھاریوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو سیدھی اور کھری بات کرتے ہیں۔

Marfat.com

پس منظر

(تحریک ختم نبوت)

چودھری افضل حق رحمتہ اللہ علیہ

انہیں اپنے حال کو بدلنے کا کوئی احساس نہیں یہ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خود علماء انقلابی سیرت سے ناآشنا ہیں۔ اور وہ اب تک مذہب کی اموی اور عباسی عقائد کے مطابق تشریح کر رہے ہیں۔

تاہم کسی کی بے خبری یا کسی گروہ کا تعصب واقعات کو نہیں بدل سکتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نئے دور کے انقلابی تھے۔ درانتی اور کلہاڑا تو اب مزدوروں کی نشانی بنا۔ جس نے سرمایہ داری پر پہلے کلہاڑا چلایا اور قومی امتیاز کے ان ریشوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جس نے انسان کو انسان سے علیحدہ کر دیا تھا۔ صرف سرمایہ ہی طبقات پیدا نہیں کرتا بلکہ انسانوں میں گروہ بندی کرنے والے اور بھی محرکات ہیں۔ ان سے بڑا ذریعہ مختلف نبیوں پر ایمان ہے۔ قومیں خدا پر ایمان کے نزاع پر مختلف نہیں بلکہ مختلف نبیوں پر ایمان لانے سے الگ الگ ہیں۔ پہلے آمدورفت کے وسائل کی کمی کی وجہ سے ہر ملک کی ایک الگ دنیا تھی۔ الگ الگ پیغمبروں کے ذریعے ہر ملک کی روحانی تربیت ضروری تھی۔ ایک ملک میں بیٹھ کر سب ملکوں میں پیغام پہنچایا جا سکتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہوا۔ آپ نے (لا نبی بعدی) میرے بعد کوئی نبی نہیں کا اعلان کر کے دنیا کو اتحاد کا مژدہ سنایا کہ آئندہ نبیوں کی بناء پر قوموں کی تربیت ختم ہوگئی۔ آؤ ایک محکم دین کی طرف آؤ۔ یہ سب کے حالات کے مطابق ہے۔ اسلام تمہارے سارے عوارض کا نسخہ ہے۔ زمانے نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بتدریج دُور دُور کے ملک آمدورفت کے سلسلوں میں آسانیوں کے باعث نزدیک تر ہو گئے۔ اب دور دراز کے ملک ایک شہر کے محلوں سے بھی قریب معلوم ہونے لگے ہیں۔ اس لیے ملک ملک کے لیے علیحدہ پیغامبر کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اب انسانی دماغ کافی نشوونما پا چکا تھا۔ لوگ اپنا بھلا برا خود سمجھنے لگے۔ اب ایک سچائی پیش کرنا کافی ہے۔ باقی معاملہ لوگوں کی سمجھ پر چھوڑنا کفایت ہے۔ مذہب کی سچائی اب سمجھ سے بالا نہیں بلکہ تعصب کے باعث اسے قبول کرنے میں دقت ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آتے ہی اہل دنیا کی عقل اور علم نے حیرت انگیز ترقی کی۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے معنی یہ تھے کہ اب انسانیت سن شعور کو پہنچ چکی ہے اب کسی سکول ماسٹر کی ضرورت نہیں جو لوگ دنیا کے حالات کا مطالعہ کر سکے ہیں۔ سچی اور جھوٹی بات میں فرق کر کے وہ صحیح راہ تلاش کر سکتے ہیں۔ اب مکمل سچائی یعنی اسلام ہم تک پہنچ گیا۔ اب کسی نبی کی

Marfat.com

ضرورت نہ رہی اگر ہم نبوت کا سلسلہ ابھی تک جاری مان لیں تو پھر مختلف نبیوں پر ایمان کے باعث قوموں، ملکوں پر اور انسانیت میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہے گا۔ پہلے تو ملک ملک ایک الگ دنیا تھی۔ الگ الگ نبیوں کی ضرورت تھی، اب جب دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ویلج کی شکل میں رہتی ہے تو نبوت کے مختلف دعویداروں کا آنا دنیا کو تقسیمِ بلاضرورت کرنے سے کم نہ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لا نبی بعدی کا ارشاد دنیا کے لیے رحمت کا پیغام اور انسانیت کے لیے خوشخبری تھی۔ ہندوستان کی سرزمین عجیب ہے۔ قادیان میں مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ تیس، چالیس برس مسلمانوں کی توجہ تعمیری کاموں کی بجائے اس متنبّی کی طرف لگی رہی۔ ایک حصہ کٹ کے الگ ہو گیا۔ انگریزی حکومت کے زیرِ سایہ جہاں چھوٹے بڑے نواب پرورش پا کر سرکار کے گن گاتے ہیں۔ اسی طرح حکومت کو اعتراض نہ تھا اگر متعدد نبی اور کئی ایک سرکاری ولی پیدا ہو کر ان کے دعا گو بنے رہیں۔ انہیں امور سلطنت میں سہولت درکار تھی۔ مسلمانوں کو قابو میں رکھنے کی تدبیروں میں سے یہ بھی حکومت انگریزی کی کارگر تدبیر تھی کہ ان کے روحانی اداروں پر خوامخواہ قابض ہوں اور یوں سرکار انگریزی کی وفاداری مسلمانوں کا جزو مذہب بن جائے۔ پنجاب اور سندھ میں ہر پیر خاندان سرکاری تعلقہ داری اور وظیفہ خواری پر پرورش پا رہا ہے۔ یہ تو پیر تھے مگر حکومت کو قادیان کا پیغمبر ہوا خواہی کے لیے مل گیا۔ مسلمان سیاسی اور مذہبی طور پر انگریزی غلامی پر مطمئن ہو گئے۔ مسلمانوں کی موجودہ مدہوشی کی بڑی وجہ انگریز کی یہ کامیاب تدبیر ہے۔ پھر تو ساری اسلامی آبادی حکومت کی منقولہ جائیداد بن کر رہ گئی۔ جہاں سے اٹھائیں، جہاں ڈالیں مخالفت کی ایک آواز نکالنا مشکل تھی، انگریزی حکومت کی سب سے زیادہ حمایت قادیان کی جماعت کو حاصل تھی۔ یہ تائید اتنی زیادہ تھی کہ اکثر سرکاری محکموں میں وہ بہت اثر و رسوخ کے مالک ہو گئے۔ بعض جگہ تو سارے کا سارا ضلع ان کے اثر و رسوخ میں آ گیا۔ لوگ حکومت کی تائید حاصل کرنے کے لیے قادیان کی تائید حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ محکمہ سی آئی ڈی تو الگ رہا۔ قادیان مرزائی حکومت کو تفصیلی خبریں پہنچاتے تھے۔ حکومت وقت کے خلاف آزادی کی ہر آواز کو دبانے کے لیے اس جماعت کے افراد سب سے پیش پیش تھے اس لیے لوگ قادیانی آواز کو حکومت کی آواز کی صدائے بازگشت سمجھتے تھے اور بے حد خائف تھے۔ یہ لوگ معمولی ایجی ٹیشن کو بڑھا چڑھا کر سرکار کے دربار میں بیان کرتے تھے۔ انتخابات میں حال یہ تھا کہ ہر امیدوار قادیان کی حمایت حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ جسے یہ تائید حاصل ہو گئی اسے گویا سرکاری تائید حاصل ہو گئی۔ پس قادیانی تحریک کی مخالفت سیاسی اور مذہبی دونوں وجوہ کی بناء پر تھی۔ جس اسلامی جماعت نے مسلمانوں کو آزاد

Marfat.com

اور توانا قوم دیکھنے کا ارادہ کیا ہو۔ اسے سب سے پہلے اس جماعت سے ٹکرانا ناگزیر تھا۔ اس جماعت کے اثر ورسوخ کو کم کیے بغیر آزادی کا تصور ناممکن تھا۔ شاید ہماری آئندہ نسلیں قادیانیوں کے خلاف ہماری جدوجہد کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں اس طرح کی غلطی کھائیں۔ جس طرح مذہب سے بیزار اور اشتراکیت کا شیدائی کھا رہا ہے۔ تعجب ہے کہ اقتصادی مساوات کے حامی لوگ صرف ہمارے مذہبی رجحانات کو دیکھتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ احرار سرمایہ داری کے مضبوط قلعے پر حملہ آور ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان کا مذہب آشنا طبقہ احرار کی قادیان کے خلاف جدوجہد کو استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے ہاں ایک طبقہ ہمیں مذہبی دیوانہ اور خود کو فرزانہ خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مذہب افیون ہے اس لیے قوئ مضمحل ہو جاتے ہیں اور زندگی کے اصل مسائل کو سمجھنے کی قابلیتیں اور کامیاب جدوجہد کی فرصتیں کم ہو جاتی ہیں مگر مذہب کیا ہے؟ خدا کے متعلق ایک خاص تصور اور عقیدہ، کوئی گروہ اس کا اقرار کر کے مذہبی ہے اور کوئی انکار کر کے زندیق۔ منکرِ خدا بھی تو خدا کے متعلق سوچتا ہے۔ وہ خدا کے اقراری کے خلاف ایسے ہی جذبات رکھتا ہے۔ جیسے منکرِ خدا کے خلاف ماننے والا۔ پس نفی واثبات کی عملی دنیا میں بحث فضول ہے کیونکہ انہی اعتبار سے دونوں کا مرجع ومرکز خدا ہی ہے۔ سب اسی کے متعلق نفی واثبات میں سوچتے ہیں۔ اس لیے ہمیں مذہبی دیوانہ کہنے والے خود بھی اسی طرح خطاب کیے جانے کے مستحق ہیں لیکن عمل کی دنیا میں جو کمزور ہے وہ بے شک اپنے مذہب میں کمزور ہے۔ پس احرار، اسلام کو دنیا و آخرت کی سیڑھی سمجھتے ہیں۔ مذہبی دیوانہ ہونا ہمارے لیے کچھ چڑ نہیں۔ بشرطیکہ عمل کی دنیا میں ہم مبارک سپاہی ثابت ہوں اگر ہم کام چور اور بے ہمت ہیں تو بے شک مذہب اسلام کے افیونی ہونے کا ہم ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔ احرار پختہ عمل مذہب کے دیوانے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سرکاری نبی اور سرکاری ولی اس دور میں کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ صرف اس لیے کہ وہ مسلمانوں میں وہی انتشار اور نئے نئے گروہ پیدا کرنے کا باعث ہوں اور کہیں مسلمانوں کی قوت ایک جگہ جمع نہ ہونے پائے۔

نئی نبوت کے دعویٰ کے ساتھ مسلمانوں کا ایک حصہ مستقل طور پر کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ وہ سب مسلمان کہلانے والوں کو کافر کہتے ہیں اور ہر دم ان کی بیخ کنی کے درپے رہتے ہیں کیونکہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو کافی نہیں سمجھتے جو مرزا صاحب پر ایمان نہ لائے۔ ان کے لیے وہ مسلمان بھی یہودی اور عیسائی کی طرح ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو قریبی دشمن سمجھتے ہیں۔ جس کو سب سے پہلے نیچا دکھانا وہ اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری قیاس کرتے ہیں۔ اگر ان کے مسلمانوں کے ساتھ باہم روابط ہیں تو وہ اس لیے کہ سیاسی طور پر مسلمانوں کا جزو بنا رہنا ان کو بے حد

Marfat.com

مفید ہے۔ اگر مسلمانوں سے علیحدہ رہیں تو ہندوستان میں انہیں کوئی دو کوڑی کو نہ پوچھے۔ اب وہ اکثر سرکاری محکموں میں نمایاں حیثیتوں میں نظر آتے ہیں۔ مرزائی ہم مسلمانوں سے اتحاد رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کی ملازمتوں اور سیاست پر ان کا قبضہ رہے اور ان کی جڑ کاٹنے میں بھی آسانی ہو۔ عیسائی گو اہل کتاب ہیں مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے باعث ہم ان کو مذہبی لحاظ سے مخالف گروہ خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح مرزائیوں کا ہمارے متعلق خیال ہے۔

اس زمانے میں ہر قوم یہ حق سمجھتی ہے کہ اپنے اندر ففتھ کالمسٹ سے خبردار رہے اور ان کی سازشوں سے بچے۔ ان کی میٹھی میٹھی باتوں اور ان کی ہمدردیوں سے دھوکہ نہ کھائے۔ دشمن کا مقابلہ آسان ہے مگر بغلی گھونسوں کا کوئی علاج نہیں۔ بجز اس کے کہ انسان ہر وقت چوکس رہے۔ ہم مرزائیوں کے بحیثیت انسان مخالف نہیں نہ ان کی عزت و آبرو کے دشمن ہیں۔ البتہ ان کی معرفت سے بچنا اپنا قدرتی حق سمجھتے ہیں۔ مرزائیت میں اگر فاش خامیاں نہ بھی ہوتیں اور وہ غلط دعووں کا عبرت انگیز مرقع نہ بھی ہوتی تو بھی نبوت کا دعویٰ بجائے خود اسلام پر ضربِ کاری اور مسلمانوں میں انتشارِ عظیم پیدا کرنے کا سبب ہے۔ اس دعویٰ کے ساتھ ہی یہ گروہ مسلمانوں کی کڑی نگرانی کا سزاوار ہو جاتا ہے پس ہم نے دیکھا کہ مرزائی لوگ:

1- برٹش امپریلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔
2- وہ اعلیٰ طبقے کا ذہن رکھتے ہیں۔
3- وہ مسلمانوں میں ایک نئی گروہ بندی کے طلبگار ہیں جو مسلمانوں کی جمعیت کو ٹکڑوں میں بانٹ دے گی۔
4- وہ مسلمانوں میں بطور ففتھ کالمسٹ کام کرتے ہیں۔

اکثریت کے ارادے مخفی نہیں ہوتے مگر کمزور اور اقلیتوں کے لیے جو اکثریت کے خلاف محاذ بنانا چاہیں ضروری ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو مخفی رکھیں۔ ان احتمالات کے پیشِ نظر خیال آتا تھا کہ ان مخالفینِ اسلام کی نگرانی ضروری ہے۔ قادیان میں مسلمانوں پر مظالم کی دلخراش داستان متواتر ہمارے قانون تک پہنچ رہی تھی۔ مرزائی لوگ باہر سے آ کر دھڑا دھڑ وہاں آباد ہو رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے اور غریب ہونے کے باعث مسلمانوں پر باہر سے آئے ہوئے سرمایہ دار مرزائی عرصہ حیات تنگ کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ قادیانی خلیفہ کے ایما پر ہو رہا تھا۔ تمام ہندوستان کے علماء فتویٰ بازی تو کرتے تھے مگر مقابلے کی جان نہ تھی۔ بٹالہ ضلع گورداسپور میں دردِ دل رکھنے والے مسلمانوں نے

Marfat.com

''شبان المسلمین'' نام کی ایک جماعت بنائی۔ جسے گورداسپور کے ایک مشہور اور امیر خاندان نے بہت سہارا دیا۔ حاجی عبدالرحمٰن اور حاجی عبدالغنی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ حاجی عبدالرحمٰن صاحب زندہ ہیں اور مہاجر کی حیثیت سے اندرون لاہور میں مقیم ہیں۔ حاجی عبدالغنی اس تحریک کے سلسلے میں تقسیم ملک سے بہت پہلے شہید ہو گئے تھے۔ انجمن شبان المسلمین ہر سال اہتمام کے ساتھ علماء کو باہر سے بلا کر نہایت شان سے تبلیغی جلسے کرتی رہی ایک سال ایسا ہوا کہ بٹالہ کے سالانہ اجلاس کے خاتمہ پر علماء ایک دن کے لیے قادیان بھی تشریف لے گئے۔ ان علماء کا قادیان جانا سرکاری نبوت کے حامیوں کو ایک آنکھ نہ بھایا دوسرے سال انہوں نے مار پیٹ کی پوری تیاری کر لی چنانچہ مرزائی نوجوان بوڑھے علماء پر ٹوٹ پڑے؟ لاٹھیوں کا مینہ برسایا؟ ان کا بند بند توڑا؟ کس کی رپٹ کہاں کی رپورٹ؟ تھانہ مرزائیوں کا بیل تھا؟ دادرسی کی کیا توقع تھی۔ یہ بیچارے جوں توں کر کے بٹالہ پہنچے جو قیامت ان پر گزری تھی اس کی داستانِ دردلوگوں کو سنائی۔ پھر کئی سال کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ کوئی عالم قادیان کی جانب مارچ کرے۔

احرار کا قادیان میں داخلہ (اکتوبر 1934ء)

جس طرح بے کسی کشمیر کی غریب آبادی کی مصیبتوں کو دیکھ کر فریاد و فغاں کر رہی تھی اور ہم اس کے دردناک نالوں کو سن کر اٹھے۔ اسی طرح ہم نے قادیان کے تباہ حال اور ستائے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی پکار کو سُن کر کان کھڑے کیے۔ قادیان کے مرزائی سرمایہ دار کو یقین تھا کہ زمین کے دردناک نالے آسمان کے خداوند تک نہیں پہنچتے۔ انہیں دنیا کے خداوندوں کا سہارا تھا اور وہ من مانی کارروائیاں اسی لئے کرتے کہ حکام تک ان کی رسائی تھی لیکن دیکھو۔ یوں ہوا کہ گویا آسمان کے خداوند نے کہا کہ اے اربابِ غرور! یہ تمہاری متشددانہ زندگی کی انجیل کے اوراق اب بند ہو جانے چاہئیں۔ پس اس نے جھوٹے مسیحا اور اس کے حالیوں موالیوں کے مظالم کو روکنے کے لیے ایک خاک نشینوں کی جماعت کے دل میں تحریک کی۔ جس نے چند والنٹیر نوجوانوں کو قادیان بھیجا تا کہ مسلمانوں کی مساجد میں جا کر نماز ادا کریں لیکن ایسا نہ کرنا کہ کہیں مرزائیوں کی عبادت گاہ میں جا گھسو اور مرزائیوں کو تم پر تشدد کرنے کا معقول بہانہ مل جائے لیکن قادیانی مرزائیوں کو مسلمانوں کی مسجد میں آوازہِ اذان کی برداشت کہاں تھی۔ مسلمانوں پر ان کا لاٹھی کا ہاتھ رواں تھا ہی، آئے اور لاٹھی کے جوہر دکھانے لگے بے دردوں نے لاٹھیوں سے احرار والنٹیر نوجوانوں کو اس قدر پیٹا کہ پناہ بخدا۔ بزدل، دشمن پر قابو پا کر ایسے ہی غیر شریفانہ مظاہرے کرتا ہے۔ والنیٹر جان سے بچ گئے مگر مدت تک ہسپتال میں پڑے رہے۔

Marfat.com

اس کے بعد احرار نے بٹالہ کانفرنس کر کے حکومت اور قادیانی اربابِ اقتدار کو للکارا۔ مرزائیوں اور سرکار نے سمجھا کہ احرار کی خاک میں شعلے کہاں۔ پروا تک نہ کی۔ کسی مرزائی کی گرفتاری عمل میں نہ آئی لیکن اتنا ہوا کہ رپورٹروں نے حکام اور مرزائی صاحبان سے کہہ دیا کہ احرار کی کشمیر کی یلغار کو سامنے رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ گرد میں سوار نکل آئیں۔ احرار جس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، پھر پیچھا نہیں چھوڑتے اور ہموار کر کے دم لیتے ہیں۔ مار کھا کے چپکے بیٹھ جانا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ اس لیے جولائی 1934ء میں امرتسر میں ورکنگ کمیٹی قائم ہوئی۔ فیصلہ ہوا کہ جو ہو سو ہو قادیان میں مستقل دفتر کھولنا چاہیے۔ معلوم کیا کہ ہم میں کون ہے جو علم میں پورا اور عمل میں پختہ ہے جو موت کی مطلق پروا نہ کرے اور اللہ کا نام لے کر کفر کے غلبے کو مٹانے کے عزم لے اس جگہ اقامت اختیار کرے اور مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں کی نگرانی کرے خدا نے مولانا عنایت اللہ کو توفیق دی۔ وہ شادی شدہ نہ تھے۔ اس لیے جماعت کو یہ غم نہ تھا کہ ان کی شہادت کے بعد کنبے کا بوجھ اٹھانا ہے اور بچوں کی پرورش کا کام کرنا ہے۔

غرض خطرات کے ہجوم میں مولانا کو ردِ مرزائیت کا کام سپرد کیا گیا۔ دارالکفر میں اسلام کا جھنڈا گاڑنا معمولی سی اولوالعزمی نہ تھی۔ افسوس مسلمانوں نے دنیا کے لیے زندہ رہنا سیکھ لیا ہے اور ان کے سارے تبلیغی ولولے سرد پڑ گئے ہیں۔ اب جبکہ فتنہ مرزائیت نے سر اٹھا لیا تو انہوں نے کوئی مصلحت اختیار کی۔ باوجودیکہ مرزائی مسلمانوں کو صریح کافر کہتے ہیں یہاں تک کہ جنازہ تک پڑھنے کے روادار نہ تھے لیکن لوگ انہیں انگریز کا چہیتا سمجھ کر منہ نہ آتے تھے۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے تو حد کر دی تھی۔ وہ اس خانہ برانداز قوم کا تعاون حاصل کرنے کو حصول ملازمت کا ضروری مرحلہ خیال کرتے تھے۔ بہت ہیں، جنہوں نے دنیا حاصل کرنے کے لیے دین کو فروخت کر دیا۔ دین فروشوں کا گروہ ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ قوموں کے زوال میں اس گروہ کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مرزائی لوگ انسانی فطرت کی اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھاتے رہے۔ ضلع گورداسپور کے سارے حکام ان کا اسی وجہ سے پانی بھرتے تھے کہ قادیانی گروہوں کی رسائی انگریزی سرکار تک ہے۔ ضلع کے حکام کے ذریعے عوام کو مرعوب کرنا، سرکار کا وفادار فریق بنا کر تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازمتوں کے سبز باغ دکھانا ان کا کام تھا۔ انگریزی سلطنت کی مضبوطی کو دیکھ کر اور سرکار سے مرزائیوں کا گٹھ جوڑ دیکھ کر کسی تبلیغی جماعت کا حوصلہ نہ تھا کہ وہ خم ٹھونک کر میدانِ مقابلہ میں نکلتی۔ اللہ نے احرار کو توفیق دی کہ وہ حق کا علم لے کر نکلے۔ مرزائی متعدد قتل کر چکے تھے۔ قادیان میں انہیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ مولانا عنایت اللہ کو قادیان کے بازار میں دفتر لے دیا گیا۔ قادیان میں احرار کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سرخ جھنڈے کو دیکھ کر مرزائی

Marfat.com

روسیاہ ہو گئے۔ آہ ان کے سینوں کو توڑتی نکل گئی یہ ان کی پامالی کا دن تھا۔ مرزائیوں نے اپنی اُمیدوں کا جنازہ نکلتے دیکھا تو سر پیٹنے لگے۔ سرکار کی دہلیز پر سر رکھ کر پکارے! حضور قادیان مرزائیوں کی مقدس جگہ ہے۔ احرار کے وجود سے یہ سرزمین پاک کر دی جائے۔ جب مرزائیت نصرانیت کا سہارا ڈھونڈنے نکلی تو ہم نصرانیوں اور مرزائیوں کے اتحاد سے ڈرے ضرور مگر خُدا کو حامی و ناصر سمجھ کر اس کے تدارک میں لگ گئے۔ ڈرنا اور ہمت ہار دینا عیب ہے۔ ڈرنا اور پہلے سے زیادہ چوکنے ہو کر کام کرنا بڑی خوبی ہے۔ بساطِ سیاست پر فرد کو بڑھا کر اس کو تنہا چھوڑنا غلطی ہوتی ہے۔ ہم نے اوّل ان احباب کی فہرست تیار کر لی جو مولانا عنایت اللہ کی شہادت کے بعد یکے بعد دیگرے یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے کے اندر قادیان پہنچ جائیں کیونکہ مرزائیوں نے قادیان کو قانونی دسترس سے پرے ایک الگ دنیا بنا رکھا تھا۔ جہاں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں پر بلا خطا مظالم توڑے جاتے تھے۔ قتل ہوتے تھے مگر مقدمات عدالت تک نہ جا سکتے تھے۔ دوسرے ہم نے فوراً مولوی عنایت اللہ کے نام قادیان میں مکان خرید دیا۔ تاکہ مرزائیوں اور حکام کا یہ عذر بھی جاتا رہے کہ مولوی صاحب موصوف ایک اجنبی ہیں اور ان کا قادیان سے کوئی تعلق نہیں۔ تیسرے قادیان کی تقدیس کے دعویٰ کو باطل کرنے کے لیے ہم نے احرار تبلیغ کانفرنس قادیان کا اعلان کر دیا اس پر تو گویا قادیانی ایوان میں زلزلہ آ گیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مرزائی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور سر حکام کے پاؤں پر رکھ دیا کہ تمہاری خیر ہو ہماری خبر لو۔ خانہ خراب ہوا جاتا ہے۔ ہم سے کہا گیا کہ کانفرنس سے باز رہو قادیان میں مرزائیوں کی اکثریت ہے۔ اقلیت کا حق نہیں کہ ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے۔ ہم نے حکام کو جواب دیا سوائے قادیان کے مرزائیوں کی کثرت کہاں پر ہے۔ سب جگہ ان کی تبلیغ بند کر دی جائے۔ اس جوابِ معقول سے وہ لاجواب ہو گئے مگر رخنہ اندازیوں میں برابر مشغول رہے مگر اٹھایا ہوا قدم بھلا واپس ہو سکتا تھا۔ حکومت نے سراسر ناانصافی سے بچنے کے لیے کہا کہ کانفرنس کر لو لیکن مسلح ہو کر قادیان میں داخل نہ ہونا۔ اس میں ہمیں عذر کیا تھا کانفرنس کی کامیابی نے دوست اور دشمن کو حیران کر دیا۔ مرزائی تو جل گئے اور جلدی جلدی حکام کے پاس پہنچے کہ سرکار بخاری نے دل کا خوب بخار نکالا۔ بڑے مرزا صاحب کی توہین کی۔ چھوٹے مرزا کے الگ بخیے ادھیڑے اگر اب مدد نہ کی تو کب کام آؤ گے؟ سرکار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بخاری صاحب کو گرفتار کے کمرہ عدالت میں لا کھڑا کیا۔ خدا کی حکمت گنہگاروں پر مُسکراتی ہے مرزائی تو احرار کو مرعوب کرنے کے لیے عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری پر مقدمہ چلا رہے تھے لیکن قدرت مرزائیت کے ڈھول کا پول کھولنے کے لیے بے تاب تھی۔ خدا کی مہربانی کہ

Marfat.com

مرزائیت کے خلاف وہ ثبوت پہنچے کہ کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ہم میں ایسے ثبوت مہیا کرنے کی صلاحیت ہے۔ ہم نے اس مقدمہ میں مرزائیت کے مذہب واعتقاد پر بحث نہیں کی بلکہ مرزائیت اور اس کے اعمال کو پیش کیا۔ جس سے ابتدائی عدالت بھی متاثر ہوئی۔ اگر چہ اس نے سید عطا اللہ شاہ صاحب کو چھ ماہ کی سزا دے دی۔ تاہم سننے والی پبلک پر گہرا اثر ہوا سب کو یقین تھا کہ شہادت صفائی ایسی مضبوط ہے کہ یہ سزا بحال نہیں رہ سکتی لیکن مرزائی ہیں کہ شاہ صاحب کی سزایابی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کے گھر میں گھی کے چراغ جلائے گئے لیکن سیشن جج مسٹر کھوسلہ نے مرزائیوں کی خوشیوں کو اپنے فیصلہ اپیل میں ماتم سے بدل دیا۔ اس نے وہ تاریخی فیصلہ لکھا جس سے اسے شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ اس فیصلے کا ہر حرف مرزائیت کی رگ جاں کے لیے نشتر ہے اس فیصلہ میں مسٹر کھوسلہ نے چند سطروں میں مرزائیت کی تاریخ لکھ ڈالی۔ اس کے فیصلے کا ہر لفظ دریائے معانی ہے۔ اسکی ہر سطر مرزائیت کی سیاہ کاریوں اور ریا کاریوں کی پوری تفسیر ہے۔ مسٹر کھوسلہ کے قلم کی سیاہی مرزائیت کے لیے قدرت کا انتقام بن کر کاغذ پر پھیلی اور مرزائیت کے چہرے پر نہ مٹنے والا داغ چھوڑ گئی۔ ہر چند انہوں نے ہائی کورٹ میں سر سپرو جیسے شخص کی معرفت چارہ جوئی کی تا کہ مسٹر کھوسلہ کے فیصلے کا داغ دھویا جائے مگر انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ مرزائی آج تک یہی سمجھتے رہے کہ قدرت ظلمِ ناروا کا انتقام لینے میں قاصر ہے مگر اس فیصلے نے ثابت کر دیا کہ خدا کے حضور میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اس فیصلے کو تاریخ احرار میں خاصی اہمیت حاصل رہے گی۔ دراصل یہ فیصلہ مرزائیت کی موت ثابت ہوا۔ جس غیر جانبدار نے اس کو پڑھا وہ مرزائیت کے نقش ونگار کو دیکھ کر اس سے نفرت کرنے لگا۔ علامہ سر اقبال اور مرزا سر ظفر علی کے بیانات نے تعلیم یافتہ طبقے کے رجحانِ خیال کو بدل دیا۔ الیاس برنی نے ''قادیانی مذہب'' لکھ کر مرزائیت کے مقابلے میں اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی لیکن سچ یہ ہے کہ مسٹر کھوسلہ نے جو مرزائیت کے قلعے پر بم پھینکا۔ اس نے کفر کے قلعے کی بنیادیں ہلا دیں ان قلعہ بندیوں کو مسمار کرنے میں آسانی ہوگئی۔ جہاں چار مرزائی بیٹھے ہوں ان میں مسٹر کھوسلہ کا فیصلہ پھینک دو یہ بم پھینکنے کے برابر ہوگا وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ جائیں گے۔''

قارئین کرام مسٹر کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا تاریخی فیصلہ ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر تقسیم ہو چکا ہے۔ آج بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جنہیں اس فیصلے کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا اور جن لوگوں نے اس سے قبل اس تاریخی فیصلے کا مطالعہ کیا ہے وہ بھی اذہان کی تازگی کے لئے اسے ایک بار پھر مطالعہ فرمائیں۔

(ملاحظہ کریں افضل حق چودھری، تاریخ احرار، مکتبہ احرار اسلام لاہور مارچ 1965ء صفحات 176 تا 185)

Marfat.com

گزارش احوال واقعی

میری دلی خواہش تھی کہ تحریک تحفظ ختم نبوت کی تاریخ شجاع آباد میں بیٹھ کر لکھوں شجاع آباد میں مجھے بہت آرام وسکون کا موقع ملتا حافظے پر زور ڈالنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ اس لیے کہ قاضی احسان احمد صاحب احرار کے بلند پایہ مقرر جانے جاتے ہیں اور جو احرار کے ''انسائیکلوپیڈیا'' ہیں۔ وہاں موجود ہوتا تو میری مشکلیں آسان ہو جاتیں میں ایک حوالہ پوچھتا وہ دس اور واقعات مع تحریری ثبوت سامنے رکھ دیتے اب یہ صورت ہے کہ میں لکھتا ہوں پھر سوچتا ہوں اس کے بعد کیا ہوا؟ میرے ایسے تھکے ہارے ضعیف انسان کا حافظہ ہی کیا؟ تاہم زخموں کے نشان رہنمائی کرتے ہیں انہی سے یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زخم کہاں کھایا تھا۔ حافظہ یاوری کرتا ہے تو بات اچھی طرح یاد آ جاتی ہے اور اب جب یاد آتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ابھی ابھی آنکھوں کے سامنے سے گزرا ہے۔ میں اللہ کا نام لے کر لکھ رہا ہوں کمی بیشی کے بعد شجاع آباد ہی میں انشاء اللہ تحریک تحفظ ختم نبوت پر قاضی صاحب کی موجودگی میں نظر ثانی کروں گا تب اس مکمل تاریخ کی نوک پلک درست ہو گی۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ دس بیس سلپیں قلم برداشتہ لکھ دیتا ہوں۔ میرے ایک عزیز دوست نے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ (۱) انسان کے ارادوں کی تکمیل اس کے اپنے بس میں نہیں ہوتی۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کل لکھ بھی سکوں گا یا لکھنے کے لیے زندہ بھی رہوں گا۔

احقر العباد

تاج الدین انصاری

(۱) ماسٹر صاحب کی زندگی میں یہ کام پایہء تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

Marfat.com

تحریک تحفظ ختم نبوت

میرا یہ ارادہ تھا کہ جیل میں بیٹھ کر قید و بند کی تنہائیوں میں اطمینان سے تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے حالات قلم بند کروں۔ قید بھی ہوا، نظر بند بھی رہا مگر میں اپنے اس ارادے کو لباسِ عمل نہ پہنا سکا۔ ارادوں کی تکمیل انسان کے اپنے بس میں نہیں ہوتی۔ خالق کی مرضی کے بغیر تو پتا بھی ہل نہیں سکتا۔ اب لکھنے بیٹھا ہوں، لکھ رہا ہوں، خدا کو منظور ہوا تو مفصل حالات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ یہ تحریک ''احرار'' کا سیاسی سٹنٹ تھا۔ بعض بدطینت یہ بھی کہتے سنے گئے کہ یہ تحریک سیاسی شعبدہ بازوں نے چلوائی تھی۔ جو جیسا ہے ویسا ہی سوچتا ہے:

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

قبل اس کے کہ میں وہ حالات لکھوں جو پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر پیش آئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں پیش آنے والے حادثات اور واقعات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔ عام طور پر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مجھے مفکر احرار چودھری افضل حق مرحوم و مغفور نے خاص مقصد کے لیے قادیان بھیج دیا تھا۔ میں وہاں دو سال رہا ہوں۔ اس دو سال کے عرصے میں میری آنکھوں نے کیا دیکھا؟ اور اس فتنہ انگیز اور ''نبی خیز'' زمین کو دیکھ کر میں نے کیا سمجھا شرح ربط سے بیان کرنے کا ارادہ ہے۔

تبلیغ کانفرنس کے بعد

تبلیغ کانفرنس میں شمولیت کے لیے جب میں پہلی بار قادیان گیا تھا تب مجھے قادیان کو چل پھر کر دیکھنے کا موقع میسر نہ آیا۔ اس لیے کہ حکومت نے باہر سے آنے والوں پر کچھ پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ جگہ جگہ پہرے بٹھا دیئے گئے اور اعلان کر دیا گیا کہ کوئی مسلمان قادیان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ مجھے کانفرنس میں تقریریں سننے یا رونق سے لطف اندوز ہونے کا اتنا خیال نہ تھا جتنا اس فساد انگیز بستی کے اندرونی حالات معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ ایک میل دور ریلوے لائن پر کھڑا دیر تک ''منارۃ المسیح'' کو دیکھتا رہا۔ کانفرنس ختم ہوئی تو میں ایک رات کے لیے وہیں ٹھہر گیا۔ قادیان کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے باتیں ہوئیں۔ میں اِن غیر مرزائیوں کی باتوں میں بڑی دلچسپی لیتا رہا۔ میں ان مٹھی بھر غیر مرزائیوں کی جرأت اور حوصلہ مندی سے بہت متاثر ہوا وہ سودیشی

Marfat.com

نبوت کے خوفناک سازشی ماحول اور شیطانی ہتھکنڈوں سے نبرد آزما تھے اور گوناگوں مصیبتوں کا پامردی سے مقابلہ کر رہے تھے۔ میں وہاں سے سیدھا لاہور چلا آیا۔ یہاں بھی سید عطاء اللہ شاہ صاحب کی تقریر کا بڑا چرچا تھا یوں تو ان کی ہر تقریر ماسٹر پیس ہوتی ہے مگر قادیان میں شاہ صاحب کی طبیعت بالکل حاضر تھی۔ بہت بڑے ہجوم کو حضرت شاہ صاحب نے ایسا مسحور کیا کہ جلسہ گاہ میں سمندر کے مدوجزر کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ قادیان کے اردگرد کی مسلمان آبادی کانفرنس میں اُمڈ کر آ گئی تھی۔ شاہ صاحب کی تقریر نے ملحقہ آبادی کے ایمان مضبوط کر دیئے اور یہی بات مرزا محمود کی پریشانی کا باعث ہوئی۔ قادیان سے واپسی پر لاہور کے مرکزی دفتر میں مجھے چودھری افضل حق صاحب مرحوم و مغفور کی خدمت میں ٹھہرنے کا موقعہ ملا۔ مرحوم اپنے کارکنوں اور رضا کاروں سے ہمیشہ بہت بے تکلف رہا کرتے تھے۔ وہ سب سے دریافت کرتے تھے کہ کہو بھئی کانفرنس کیسی رہی؟ احرار کے رضا کار اور کارکن بڑا منجھا ہوا ذہن رکھتے تھے اور سب کی یہی رائے تھی کہ کانفرنس میں کامیابی تو ہوئی ہے مگر قادیان میں سالانہ کانفرنس ہونی چاہیے۔ اس کانفرنس میں مسلمان ہندوستان کے کونے کونے سے لاناہوں گے۔ دو چار کانفرنسیں ہو گئیں تو مرزائیت کا بھرکس نکل جائے گا۔ میں چونکہ ایک دن کے لیے قادیان ٹھہر گیا تھا۔ وہ مجھ سے بھی دریافت کرتے رہے کہ اس کانفرنس کے بعد کیا ہوگا؟ کانفرنس کے انعقاد سے مرزائیوں پر کیا گزری؟ قادیان کے اردگرد کے لوگوں نے کیا اثر قبول کیا؟ یہی سوالات وہ اپنے مخلص کارکنوں سے کر چکے تھے۔ ہم سب کا جواب تقریباً ملتا جلتا تھا۔ چودھری صاحب خوش بھی تھے مگر وہ باتوں باتوں میں اس خدشے کا بھی اظہار کرتے تھے کہ بڑے خطرناک گروہ سے پالا پڑا ہے۔ انگریز اس کی پشت پر ہے۔ دیکھنا چاہیے، کیا ہوتا ہے؟ میں لدھیانے واپس چلا آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ازسرنو کارخانہ جاری کروں دو سال سیاست سے کنارہ کش ہو کر دولت کماؤں اور پھر سے اس قابل ہو جاؤں کہ جماعت کی کچھ امداد کر سکوں۔ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم و مغفور میرے بچپن کے ساتھی اور بے تکلف دوست تھے۔ اُن سے مشورہ کیا۔ وہ بھی ردوکد کے بعد راضی ہو گئے۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے چودھری صاحب مرحوم نے لاہور بلا بھیجا۔ ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے تمہیں معلوم ہے۔ قادیان میں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے عرض کیا مجھے آپ سے زیادہ کیا معلوم ہوگا۔ کیوں خیر تو ہے؟ فرمانے لگے کہ مرزا محمود بہت کایاں شخص ہے وہ قادیانی خلیفہ ہونے کے علاوہ بڑا پالیٹیشن بھی ہے۔ بڑے جوڑ توڑ کا آدمی ہے ایک طرف اپنے مبلغوں کے ذریعے تبلیغ کا کام چلاتا ہے تو دوسری جانب سیاسی ہتھکنڈوں سے داؤ

Marfat.com

مارتا ہے۔ وہ ہم غریبوں کے دولت کے انبار پر برطانوی حکومت کے سہارے کھڑا ہو کر کشتی لڑتا ہے مولانا عنایت اللہ اپنی بساط سے زیادہ کام کر رہے ہیں۔ وہ جم کر بیٹھ گئے ہیں مگر وہ تنہا ہیں۔ دینی مسائل اور مناظرے میں تو وہ مات نہیں کھاتے۔ بڑی جرأت سے ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں ہمارے پاس ان کی امداد کے لیے ہمارے بہترین رفیق اور مناظر مولانا محمد حیات صاحب کے علاوہ دوسرے اور مبلغ بھی موجود ہیں۔ انہیں بھی بھیج دیا جائے گا مگر میں چاہتا ہوں کہ مرزا محمود کی سیاست کا مطالعہ بھی کر لیا جائے۔ قادیانی تبلیغ اور قادیانی سیاست دو جُدا جُدا محاذ ہیں، جب تک ان دونوں محاذوں پر مقابلہ نہ کیا جائے گا کامیابی نصیب نہ ہوگی اگر خدانخواستہ غفلت سے کام لیا گیا تو مرزائیت برطانوی اقتدار کے سہارے مسلمانوں پر امربیل کی طرح چھا جائے گی۔ میں نے عرض کیا۔ چودھری صاحب کیا ارادہ ہے آپ نے کیا پروگرام بنایا ہے؟ فرمانے لگے تم یوپی تو نہیں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے تو مولانا حبیب الرحمٰن سے مشورہ کیا تھا۔ میں اب کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا میں دو سال کی رخصت چاہوں گا تاکہ اس عرصے میں کچھ دولت کما لوں تب میں اپنے رفیقوں کی امداد بھی کر سکوں گا اور وقتاً فوقتاً ہاتھ بھی بٹاتا رہوں گا۔ وہ میری جانب دیکھ کر سنجیدگی سے فرمانے لگے۔ تم بھی اس طرح سوچتے ہو؟ میں نے عرض کیا پھر کس طرح سوچوں۔ آپ ہی فرمایئے؟ فرمانے لگے ارے اب تو مخالف کے پنجے میں پنجہ ڈال دیا ہے۔ یہ وقت مڑ کر دیکھنے کا ہے؟ مرحوم کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ میں انہیں اس حالت میں دیکھ کر بے قرار ہو جاتا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ چودھری صاحب فرمایئے۔ میرے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا قادیان چلے جاؤ۔

حکم مل گیا

میں نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی اور ہفتے بعد قادیان پہنچ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مولانا عنایت اللہ کو لاہور بلا کر مرحوم چودھری صاحب نے کیا کہا۔ میں احرار کے تبلیغی دفتر میں ٹھہر کر اپنے پروگرام پر غور کرتا رہا۔ مجھے تبلیغ اور مناظروں سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ میں اس کا اہل تھا۔ علماء کی صحبت سے اسلام دل میں تو اُتر جاتا ہے مگر علم دین سے دماغ یکسر کورا رہتا ہے۔ دینی مسائل سمجھنے کے لیے ضروری ہے علماء کے ساتھ سالہا سال زانوئے تلمذ تہہ کیا جائے۔ میں بھلا مولانا عنایت اللہ صاحب کا تبلیغی میدان میں کیا ہاتھ بٹاتا؟ میں اس کام کے لیے تو گیا ہی نہ تھا۔ میرا کام بالکل مختلف تھا۔ میں مسلمانوں،

۱۵۹۱۳۴

Marfat.com

ہندوؤں اور سکھوں سے معمولی واقفیت کے بعد اپنے لئے جگہ کی تلاش میں تھا۔ چند دن بعد میں نے مولانا سے کہا کہ مجھے آپ سے الگ اور مرزائیوں کے قریب رہنا ہے۔ چنانچہ میری اس خواہش کے مطابق ایک ایسا مکان مل گیا جو سنگم پر آباد تھا یعنی جہاں مسلمان محلّہ ختم ہو کر مرزائی محلّہ شروع ہوتا تھا۔ میری رہائش بیچ کے مکان میں تھی۔ ایک دیوار مسلمان کے مکان سے ملحق تھی دوسری دیوار کے سایہ میں مرزائیوں کا گھر تھا۔ اطمینان کا ٹھکانہ مل گیا۔ میں نے مطالعہ شروع کیا۔ ہفتوں مغز پچی کیا مگر مرزائیت کے گورکھ دھندے کا پتہ نہ ملا اس کام میں میرا دل بہت مطمئن تھا اور میں یقین رکھتا تھا کہ میں یہاں خود نہیں آیا اور نہ مجھے چودھری صاحب نے اس ڈیوٹی پر مامور کیا ہے مجھ گنہگار کی خوش نصیبی یہاں کھینچ لائی ہے۔ خدا ضرور میری امداد کرے گا۔ میں خدا کے حبیب ﷺ کی آبرو کے مخالف کو پریشان اور زچ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ مایوسی اور خوف دونوں میرے دل سے نکل گئے۔

مجھے کیا کرنا چاہیے؟

آخر بیٹھ کر مرزائیوں کے منارۃ المسیح کو کب تک دیکھتا رہوں۔ اجنبی ہوں۔ واقفیت کی راہیں تلاش کرنا چاہیں۔ جس گلی میں میرا قیام تھا اس کا نام تھا ''کوچہ شیخاں'' میرِ محلّہ ایک مرزائی تھا مگر مجھ غریب سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔ کچھ دن بعد میں نے گھر سے باہر قدم نکالا بیٹھک کے باہر کرسی بچھا کر بیٹھا۔ محلے کے مسلمان آنے جانے لگے تب مرزائی ہمسایوں کو پتہ چلا، کہنے لگے یہ کمبخت تو احراری معلوم ہوتا ہے۔ ہر حال میں رہگذروں کی نظروں کے سامنے اس لیے آ گیا کہ اجنبیت ٹوٹ جائے مگر واقفیت پھر بھی پیدا نہ ہوئی۔

دیہات سدھار

قادیان میں ''خلیفہ'' صاحب کے مکان یعنی قصرِ خلافت اور خلافت کے متعلقہ دفاتر کے گرد و پیش تو اچھی خاصی صفائی رکھی جاتی مگر عوام کے مکانوں کے آس پڑوس اور گلی کوچوں میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر مرزائیت کی طرح بکھرے نظر آتے تھے۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی میں صفائی کا اچھا انتظام نہ تھا۔ جب میں کانگریسی تھا تو دیہات سدھار کا پروگرام میرا محبوب مشغلہ تھا۔ میرے دل نے فیصلہ کیا کہ مجھے خدمت خلق کے جذبے سے کام شروع کرنا چاہیے۔ پہلے تو میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے ہی مکان کو صاف کرنا شروع کیا، مکان کی چھت سے لے کر نالی تک کو صاف کیا۔

Marfat.com

حتیٰ کہ باہر دروازے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ ہمسایہ مرزائیوں کے مکان اور میرے مکان کی نالی دونوں مکانوں کے باہر ایک گڑھے میں پڑتی تھی۔ گلی میں کوئی فرش نہ تھا۔ اس گڑھے میں غالباً مرزا غلام احمد کی نبوت کے زمانے سے گندہ پانی جمع ہو رہا تھا۔ نیلے رنگ کی متعفن کھاد میں بلبلے اٹھتے تھے، ہوا کے جھونکے جب اس بدبودار کیچڑ کو چھو کر گلی میں سے گزرتے تو محلّے داروں کی مزاج پرسی کر لیا کرتے تھے۔ میرے مکان کے دروازے پر اس نامعقول گندے گڑھے کا وجود میرے دیہات سدھار کے احساسات کو جھنجھوڑتا تھا۔ ایک روز میں نے حوصلے سے کام لیا اور آستین چڑھا کر دونوں ہاتھ اس گڑھے میں ڈال دیئے۔ الامان والحفیظ۔ بدبو کا دماغ سوز بھبکا اٹھا، میری آنکھوں میں پانی آ گیا سر چکرا گیا، دل نے کہا یہ قادیانی نبی کی بستی ہے۔ اپنا کام کرو اِدھر اُدھر مت جھانکو۔ میرے ہاتھوں پر کہنیوں تک نیلے رنگ کے دستانے چڑھ گئے۔ میں کام میں لگا ہوا تھا کہ ہمسائی نے اپنا دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی فقرہ چست کیا۔ کہنے لگیں۔ ”ہم نے سمجھا تھا یہ احراری مولوی ہیں۔ آج معلوم ہوا یہ تو بھنگیوں کے خاندان سے متعلق ہیں۔ کمبخت نے خدمت گزاری کی کیسی بھونڈی قسم کی داد دی۔ وہ یہ فقرہ چست کر کے گلی سے باہر چلی گئی۔ جس گلی میں میرا مسکن تھا اس گلی میں زنانہ مدرسے کی طالبات گزرا کرتی تھیں۔ ہر قسم کے سیاہ برقعے جتنے بھی دنیا بھر میں فیشن ہو سکتے ہیں۔ وہ تمام اس بستی میں موجود تھے ان طالبات کو جانے کس نے بتا دیا کہ میں احراری ہوں وہ نیک بختیں جب بھی مجھے گندے گڑھے پر کام کرتے دیکھتیں۔ مجھ پر چوٹ کیے بغیر نہ جاتیں، نہ تو میں آنکھ اٹھا کر دیکھتا تھا نہ ان کی فقرے بازی پر توجہ دیتا تھا۔ دور سے انہیں آتے دیکھتا اور نگاہیں نیچی کر لیتا۔ دوسرے دن میں نے مسلمان ہمسایوں سے کدال مانگ کر اس سے کیچڑ نکالنا شروع کیا۔ گلی کے ایک کنارے کیچڑ کا ڈھیر لگا لیا۔ تیسرے دن مرزائی ہمسائیوں کے خیالات بدلنے شروع ہوئے اس گھر میں ملکہ کا راج تھا۔ میری ہمسائی دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔ مولوی جی۔ بڑے اچھے آدمی ہو۔ کہو تو ایک مزدور تمہارے ساتھ لگا دوں۔ مدتوں کا گند تھا جو آپ نے ٹھکانے لگا دیا میں نے اسے کہا بہن یہ کام میں خود ہی کر لوں گا ایک مہربانی کیجیے۔ دو دن کی خاطر نالی میں پانی بہانا بند کر دیجیے۔ گڑھا آج صاف ہو کر دوپہر کی دھوپ سے خشک ہو جائے گا۔ میں کل اسے خشک اینٹوں سے پُر کر کے اوپر روڑی اور چونا ملا کر بہت عمدہ فرش بنا دوں گا۔ ہمسائی نے اپنی بہو بیٹیوں کو ڈانٹ پلائی اور متنبہ کر دیا کہ دو تین روز نالی میں پانی نہ گرایا جائے۔ میں نے اس کام سے فراغت پائی تو کوچے کی ناہمواری کی طرف متوجہ ہوا یہ کام

Marfat.com

بھی میں نے اپنے مسکن سے شروع کیا دو چار گز زمین روز ہموار کر لیتا۔ تا آنکہ سارے کوچے کا لیول درست ہو گیا۔ سکولوں کی لڑکیاں اور مرزائی عورتیں جو اونچی ایڑی کے جوتے پہنا کرتی تھیں۔ اس کوچے کی ناہمواری سے اکثر ٹھوکریں کھایا کرتی تھیں۔ اب کوچہ ہموار ہوا تو بے دریغ تیزی سے گزرنے لگیں۔ وہ جو مجھے خواہ مخواہ فقرے بازی کا نشانہ بنایا کرتی تھیں۔ رائے بدل کر اچھے الفاظ میں یاد کرنے لگیں، بعض نے برملا کہا کہ خواہ مخواہ احراریوں کو بدنام کیا جاتا ہے۔ یہ تو بڑے اچھے لوگ ہیں۔ میں نے مرزائیوں کو کوئی مسئلہ سمجھانے کی بجائے دیہات سدھار کی پٹڑی پر ہموار کر لیا۔ ہوتے ہوتے یہ بات ''خلیفہ'' صاحب کے کانوں تک پہنچی وہ بہت ہوشیار آدمی ہیں ان کے کان کھڑے ہوئے میرے گھر پر اپنی سی آئی ڈی کو بھیج دیا۔

گل نور

قادیان میں پیغمبری کا ایک اور دعویدار پیدا ہوا۔ شیطان نے ایک سرحدی پٹھان مسمی احمد نور کے کان میں پھونک ماری وہ بہک گیا اور الہامات بیان کرنے لگا۔ ''خلیفہ'' صاحب نے اسے مدمقابل بننے کا موقع ہی نہیں دیا۔ عام طور پر احمد نور کے خلاف پراپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ شخص مرزا قادیانی کا بے حد عقیدت مند ہے۔ اسے مرزا صاحب کے عشق میں دیوانگی کا دورہ پڑا ہے اسے کچھ مت کہو۔ غرض یہ کہ اس بیچارے کی ''نبوت'' کو تدبیر کے پتھر کے نیچے دبا کر رکھ لیا۔ احمد نور صاحب کے منہ پر ناک نہیں تھی ربڑ کی مصنوعی ناک لگا کر وہ مدتوں پیغمبری کے گیت گنگناتے رہے۔ ان کا بیٹا گل نور بڑا ہوشیار اور صاحبِ تدبیر تھا۔ اسے خلیفہ صاحب نے مجھ پر بطور سی آئی ڈی متعین کر دیا مگر وہ ایسا ہوشیار نکلا کہ میرے پاس براہ راست آنے کی بجائے میرے دوستوں کے سہارے مجھ تک پہنچا۔ وہ مولانا عنایت اللہ صاحب سے بھی راہ رسم رکھتا تھا۔ مجھے چند روز بعد اس پر شک ہوا۔ وہ اعتبار جمانے کے لیے ''خلیفہ'' صاحب کے بارے میں بے سروپا جھوٹی باتیں بتا کر مجھے ہموار کر لینا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی حرکات سے یقین ہو گیا کہ یہ میری نگرانی کرتا ہے۔ مجھے ٹٹولتا ہے۔ جب مجھے قطعی یقین ہو گیا کہ یہ خلیفہ صاحب کا پکا جاسوس ہے تو میں اس سے گھل مل گیا۔ بہت ہی بے تکلفی سے باتیں کرنے گا اور اپنی جگہ چوکس ہو گیا وہ مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش میں تھا اور میں اسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ غرض یہ کہ میرا اور گل نور کا پیچ پڑ گیا مگر یہ بڑا ہی خطرناک کھیل تھا۔

Marfat.com

دوستوں کی تنبیہ

مجھے مولانا عنایت اللہ صاحب نے رازدارانہ انداز میں حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ان کے بعد چند اور دوستوں نے گل نور سے بچ کر رہنے کی تلقین کی۔ میں نے تو مولانا عنایت اللہ سے اور نہ دوسرے احباب سے حقیقت حال کی وضاحت کی بلکہ میں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا اور گل نور کی وکالت شروع کر دی۔ میں جانتا تھا کہ بات کو پر لگیں گے اور یہ شکوک گل نور تک ضرور پہنچیں گے۔اسے میری رائے کا علم بھی ہو جائے گا۔کوئی راز زیادہ دیر راز نہیں رہتا، اگر وہ چند آدمیوں کی زبان تک آ جائے۔میں نے اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو سمجھایا کہ گل نور بہت اچھا دوست ہے وہ میرا بڑا ہمدرد ہے۔وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعے محل کے اندر کی خبریں لاتا ہے۔آپ کو کیا معلوم کہ وہ مجھے کیا کچھ بتا کر جاتا ہے۔ پٹھان جس کا دوست بن جائے، عمر بھر دوستی نبھاتا ہے۔اس قصے کو چھوڑو، میں ایک اچھے دوست کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا، گل نور کو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اسے میری اس رائے کا علم بھی ہو گیا کہ میں گل نور کو کتنا اچھا دوست سمجھتا ہوں۔گل نور مطمئن ہو گیا اور مجھے کچھ کچھ خبردار بھی کرنے لگا۔وہ محلے کی کچھ صحیح باتیں بھی بتانے گا۔دو سچی باتوں کے ساتھ چار جھوٹی باتیں ملا کر معاملے کو گڈ مڈ کر دیتا تھا۔ باتوں کے ڈھیر میں سے سچ تلاش کرنا بڑی دردسری کا کام تھا۔جیسا کہ میں نے عرض کیا، پیچ پڑ گیا تھا۔دونوں جانب سے ڈھیل دی جا رہی تھی جسے اللہ دے جو کام ہم ایک ہفتے بعد کرنا چاہتے تھے اور جس کے ظاہر ہو جانے میں کوئی ہرج نہ تھا، یا جس نے بالآخر ظاہر ہو ہی جانا تھا۔اُسے گل نور سے کہلایا جاتا تھا۔ان اطلاعات کی بہم رسانی سے گل نور زیادہ معتبر اور دربارِ خلافت میں زیادہ رسائی پا رہا تھا۔وہ جس قدر ''خلیفہ'' صاحب کے قریب ہو رہا تھا۔یا اپنے بھائی کے ذریعے باخبر ہوتا تھا۔اس سے مجھے مناسب معلومات مل جایا کرتی تھیں۔

چھ ماہ بعد

میرے پاؤں جم گئے۔ایک روز رات کے تقریباً بارہ بجے کسی نے آہستہ سے میرے مکان کی کنڈی کھٹکائی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سمجھا خواب تھا۔تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی میں چھت پر لیٹا ہوا تھا۔ نیچے اُترا دروازہ کھولا تو دیکھا ہمارا مرزائی محلّہ دار سامنے کھڑا تھا۔اس نے دبی آواز سے کہا۔ مولوی جی اندر آ جاؤں۔ میں نے کہا بسم اللہ۔وہ کمرے میں بیٹھ گیا مگر بالکل مبہوت، سانس پھولا ہوا،

Marfat.com

بالکل گھبرایا ہوا، میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ فرمائیے کیا حکم ہے۔ میں کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ آپ میرے محلّہ دار ہیں۔ آپ کا مجھ پر حق ہے۔ فرمائیے۔ کیسے تشریف لائے؟ کہنے لگا ہم بڑی مصیبت میں ہیں۔ شکایت نہیں کرسکتے یہاں ہماری آبرو محفوظ نہیں مگر ہم اُف تک نہیں کرسکتے۔ میں نے کہا۔ تنہا آپ کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہے؟ اس نے کہا یہاں اکثر لوگ زخمی ہیں خلیفہ صاحب کے کارندے کھلے بندوں بے عزتی کرتے ہیں، آگے کچھ شنوائی نہیں ہوتی۔ میں نے اس سے کرید کرید کر دیکھا۔ مظلوم اور دل برداشتہ لوگوں کے نام اور پتے دریافت کیے وہ مجھے بتا بھی رہا تھا اور ہاتھ باندھ کر یہ بھی کہتا تھا کہ میری آمد کا کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ جب وہ شخص باتیں کر کے میرے ہاں سے اپنے گھر کی طرف چلا تو میں نے دیکھا کہ وہ بار بار پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اس پر خوف طاری ہے اور پاؤں ڈگمگاتے ہیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ قادیان کی بستی میں غلام احمد کے ماننے والوں پر کیا گزرتی ہے۔ بہرحال اس کے بعد کام کی راہیں ہموار ہوگئیں۔

مرزا محمود کی سخت گیری

''خلیفہ'' محمود صاحب بڑے سخت مزاج، خطرناک، منتقم اور سخت گیر انسان ہیں۔ انہیں کسی اپنے مرید پر شک ہو جائے تو سمجھئے کہ اس غریب کی شامت آئی۔ دفتر امور عامہ کے باہر بلیک بورڈ لگا ہوا ہے جو شخص زیر عتاب ہو۔ اس پر شخص مذکورہ کا نام لکھ کر آگے بائیکاٹ لکھ دیا جاتا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک ہی شخص کی وساطت سے کتنے اوروں کا خانہ تباہ ہوتا تھا۔ زار روس کے ہاں جس طرح جاسوسوں پر جاسوس لگا دیئے جاتے تھے۔ تقریباً وہی طریقہ قادیان میں رائج تھا۔ ہر شخص کو اپنی جگہ بڑا چوکس رہنا پڑتا۔ اس صورت حال نے مرزائیوں میں منافقت کا ذہن پیدا کیا۔ اس طرح قادیان کی چھوٹی سی بستی جس کی آبادی بارہ چودہ ہزار نفوس سے کم نہ تھی۔ سیاسی داؤ پیچ کا اکھاڑہ بن گئی ہر مہرے پر مرزا محمود کا ہاتھ تھا۔ وہ مہروں کو ہٹاتا بڑھاتا اور پٹواتا۔ کوئی اس کا ہاتھ روک نہ سکتا تھا۔ ایسے شاطر کو میدان کھلا مل جائے۔ پھر اس سے کون بازی جیت سکے؟

آسانیاں

میرے لیے اس صورت حال نے مشکل کی بجائے آسانیاں پیدا کر دیں۔ مجھے پٹے ہوئے مہروں کو جمع کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے سوچا کہ یہی پٹے ہوئے مُہرے اپنی بساط کی رونق بن سکتے ہیں۔

Marfat.com

''خلیفہ'' محمود کی مخالفت

قادیان کے غیر مرزائی یعنی مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں کو تو خلیفہ صاحب نے مخالف بنا ہی لیا تھا وہ تو سب کے سب خار کھائے بیٹھے ہی تھے۔ خود مرزائیوں کو خلیفہ صاحب سے نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ بعض شریف انسان خود واقعی نبوت کے دھوکے میں بیعت کر بیٹھے تھے۔ زندگی کے نازک گوشوں میں زخمی ہو گئے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جو نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ زخم کو برداشت نہ کر سکے۔ چیخ اٹھے اور مقابلے پر آمادہ ہوئے مگر..... مرزا محمود کا سخت گیر نظام۔ سرکار کی پشت پناہی، آگے کوئی سہارا نظر نہ آیا تو پیچ و تاب کھا کر خاموش ہو گئے مگر زخمی سانپ کی طرح اندر ہی اندر بس گھولتے رہے۔

قادیان کے مسلمان

قادیان میں جب پہلے پہل مجلس احرار نے قدم رکھا۔ مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ مٹھی بھر غریب مسلمان احرار کی نہتی فوج تھی۔ یہ لوگ غریب تو تھے مگر بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ قادیان میں کشمیری مسلمانوں کے دو تین گھر تھے۔ یہ لوگ بڑے بہادر اور جانثار تھے۔ میاں عبداللہ مسلمانوں کی مسجد کے امام اور بڑے باہمت، سمجھدار باحیثیت مسلمان تھے۔ مرزائیوں کے محلے میں ان کا اپنا دو منزلہ مکان بھی تھا۔ ان کے علاوہ ماسٹر عبداللہ ایک باحیثیت آدمی بڑے ہمدرد اور احرار کے خدمت گزار تھے۔ شیخ برادری کے چند گھر تھے۔ غرض یہ کہ قادیان کی مسلمان آبادی جن میں نائی، دھوبی، چھوٹے دکاندار، درزی، رنگریز جو بھی تھے احرار کے ہمدرد کارکن اور رضا کار، سبھی کچھ یہی لوگ تھے۔ ان لوگوں کا خلوص او ختم نبوت کا پختہ عقیدہ احرار کا بہترین سرمایہ تھا۔ یہی ہماری فوج تھی اور یہی ہمارا خزانہ تھا۔ انہی غریبوں میں عبدالحق نامی ایک نوجوان احرار کے جلسوں کا گلی کوچوں میں ٹین بجا کر اعلان کیا کرتا تھا۔ ایک اور سمجھدار مسلمان نوجوان تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام، ان کا پختہ مکان مرزائیوں کے محلے میں تھا۔ یہ نوجوان بڑا دلیر تھا۔ ابتداء میں اس کی جرأت اور دلیری نے احرار کو قادیان میں پاؤں جمانے میں بڑا کام دیا۔

قادیان کا تاریخی مسلمان

مولوی مہر الدین مرحوم، مرزا غلام احمد آنجہانی کے زمانے سے مرزائیت کے خلاف صف آراء تھے۔ غربت کے باوجود مولوی مہر الدین مرزائیت کا مقابلہ کرتے رہے۔ بارہا انہیں مرزائی بہادروں نے پیٹا، ڈرایا دھمکایا مگر وہ ڈٹے رہے۔ مولوی مہر الدین تو پھر بھی مولوی کہلاتے تھے مگر یہ حقیقت معلوم

Marfat.com

کر کے مسلمانانِ پاکستان حیران ہوں گے کہ قادیان کے نائی اور سقّے بھی ردِ مرزائیت کے سلسلے میں اچھے خاصے مناظر تھے۔ اَن پڑھ ہونے کے باوجود وہ مرزائیوں کو مسائل میں ایسا الجھاتے کہ انہیں لاجواب ہو کر میدانِ مناظرہ سے بھاگنے میں عافیت معلوم ہوتی۔ چند موٹے موٹے مسائل اور وزنی اعتراضات ان قادیان کے مسلمانوں نے رٹ رکھے تھے۔ انہی سے وہ اپنے ایمانوں کو بچائے ہوئے تھے پھر یہ بات بھی ہے کہ ان لوگوں کے بزرگوں نے مرزا صاحب کو اپنی آنکھوں کے سامنے نبی بنتے دیکھا۔ خلیفہ صاحب کی حرکتوں سے وہ بخوبی آگاہ تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ قصرِ خلافت میں کیا کیا گُل کھلتے ہیں۔ مرزائیوں نے مسلمانوں پر رعب تو جما رکھا تھا مگر قادیان کے مسلمان مرزائیوں کو پکا کافر اور مرتد سمجھتے تھے۔ یہی اسلامی جذبہ اور بنیادی عقیدے کی پختگی تھی۔ جس نے احرار کے مبلغوں اور کارکنوں کو بہت سہارا دیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کشمیری خاندان میں چودھری امام دین کشمیری اور ان کے بڑے بھائی بہت جری اور حضرت امیر شریعت کے مخلص فدائیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس خاندان کا ایک پڑھا لکھا نوجوان خواجہ عبدالحمید بٹ مرزائیوں کی نئی پود کا خوب واقف تھا۔ وہ مرزائیوں ہی کے سکول میں تعلیم حاصل کر کے میٹرک کے امتحان میں پاس ہوا۔ یہ نوجوان گل نور کا دوست اور میرا دستِ راست تھا۔ بڑا ذہین اور معاملہ فہم نوجوان تھا۔ وہ جب پاکستان آیا تو سیدھا لودھراں چلا گیا۔ یہاں اس نے اپنا اچھا خاصا اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ لودھراں میونسپلٹی کا انتخاب ہوا تو عبدالحمید لودھراں میونسپلٹی کا صدر منتخب ہو گیا۔ قادیان کے مسلمانوں کی یہ مختصر سی فہرست جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا محمود کے مقابلے میں احرار کی طاقت بظاہر آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

مرکزی امداد

چودھری افضل حق مرحوم و مغفور لاہور میں بیٹھ کر قادیان کی ڈائری سے حالات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مولانا عنایت اللہ انہیں تبلیغی میدان کی کیفیت سے آگاہ کرتے اور کبھی کبھار لاہور آ کر مرحوم سے ہدایات حاصل کر کے قادیان واپس چلے جاتے تھے۔ چودھری صاحب نے تبلیغی میدان کو وسعت دینے کا پروگرام بنا لیا ایک مکان مولانا عنایت اللہ صاحب کے نام پر خریدا جا چکا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ احرار قادیان کے باشندے بن گئے۔ دل میں خلوص اور ارادے نیک ہوں تو قدرت امداد کرتی

Marfat.com

ہے۔ انہی دنوں حضرت امیر شریعت سید عطاءاللہ شاہ صاحب بخاری نے دہلی کی تبلیغ کانفرنس میں مسلمانانِ دہلی سے قادیان کے محاذ کے لیے امداد کی اپیل کی۔ ایک مخیّر اور نیک دل معزز خاتون نے زمین خریدنے کے لیے چھ ہزار روپے کا چیک بھیج دیا۔ زمین خرید لی گئی۔ کچھ اور رقم آئی تو کچھ اور زمین خریدی گئی۔ غرض یہ کہ احرار نے مضبوطی سے کفرستان میں جھنڈا گاڑ دیا۔

قادیان میں احرار کا مدرسہ اور کارخانہ

مسلمانوں کے بچے مرزائی سکول میں پڑھنے کے لیے مجبور تھے احرار نے ایک مدرسہ کھلوا دیا۔ اب یہ مشکل سامنے آئی کہ کاروبار کے لیے مرزائیوں کے تعاون کی ضرورت رہتی تھی۔ یہ سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ احرار کا ذہن ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ کامیابی کے بغیر تعمیری کام کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جا سکتی۔ آئے دن کی پکڑ دھکڑ سے فرصت ملے تو تعمیری کام بھی ہو سکتے ہیں۔ بہر حال مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے۔

ہینڈلوم یعنی دستی کھڈیاں

بالآخر بیکار مسلمان نوجوانوں کو کام پر لگانے کے لیے احرار کو دیسی کپڑے کا کارخانہ بھی جاری کرنا پڑا چنانچہ ہینڈلوم پر کپڑا تیار ہونے لگا اس طرح کچھ تعمیری کام بھی شروع ہو گیا۔ مرزا محمود نے یہ دھندا پہلے سے کر رکھا تھا۔ مرزائیوں کی آبادی بڑھی تو ان کے ہاں بھی ہینڈلوم پر کپڑا بننے لگا مگر کہاں غریب جماعت اور کہاں قادیان کا رجواڑہ؟ ہمارا ان کا اس میدان میں مقابلہ ہی کیا تھا۔ تاہم احرار نے اچھی طرح پاؤں پسار لیے۔

مولانا محمد حیات

چودھری افضل حق صاحب مرحوم و مغفور نے تبلیغی محاذ کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے احرار کے بہترین مناظر مولانا محمد حیات صاحب کو قادیان بھیج دیا مولانا محمد حیات درویش منش انسان اور بلند پایہ مناظر ہیں۔ قادیانی مبلغ ان کے نام سے گھبراتے تھے۔ مولانا محمد حیات کی سادہ اور پاکیزہ زندگی قابلِ رشک ہے۔ انہیں دیکھ کر سلف صالحین کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ مناظروں کے علاوہ مولانا موصوف نے قادیان میں درس و تدریس کا کام بھی جاری کیا۔ ان کی زندگی بہت ہی مختصر ہے کھدر کی قمیض کُرتا اور ٹوپی، سردی کا موسم آیا تو کمبل اوڑھ لیا۔ قادیان میں احرار کا مقابلہ بڑی سج دھج والی جماعت سے تھا۔

Marfat.com

ہم سب نے مولانا کو مجبور کیا کہ وہ کوٹ بنوالیں۔ مولانا نے انکار کر دیا۔ تب حضرت شاہ صاحب سے کہلوایا گیا۔ مولانا نیم رضا ہوئے۔ سالہا سال کی کوششوں کے بعد مولانا محمد حیات صاحب ایک روز کوٹ میں ملبوس نظر آئے مگر مولانا اس طرح محسوس کرتے تھے کہ ان کے جسم کو پرائی امانت نے ڈھانپ رکھا ہے۔ یعنی اپنا کوٹ مولانا کو پرایا نظر آتا تھا۔ ایسے نیک فعال اور سادہ مزاج لوگ کہاں ملتے ہیں۔ مولانا محمد حیات بڑے بہادر اور حوصلہ مند انسان ہیں۔ وہ بارہا جیل جا چکے ہیں مگر اُن کی زبان پر اِن قربانیوں کا تذکرہ بہت کم آتا ہے۔ بہرحال مولانا محمد حیات صاحب کی قادیان میں موجودگی سونے پر سہاگے کا کام دے گئی۔ احرار کے دفتر میں مرزائی مناظر آ کر مات کھا جایا کرتے تھے مگر ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی تھیں۔ اس لیے وہ شکست کھا کر تسلیم نہ کرتے تھے۔

مرزا محمود کی بوکھلاہٹ

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مرزا محمود بڑے کایاں آدمی ہیں۔ وہ بھی حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کی سی آئی ڈی بڑی مستعد تھی۔ جھوٹی سچی رپورٹوں کی بھرمار ہوئی تو وہ سیدھے لاہور پہنچے۔ تاکہ حکومت کو مداخلتِ بے جا پر اُبھار سکیں۔ چنانچہ وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر سید عطاء اللہ صاحب بخاری پر قادیان میں داخلے کی پابندی لگوا دینے میں کامیاب ہو گئے۔ احرار نے اندر اور باہر دونوں محاذوں پر جنگ شروع کر دی۔ باہر بھی جلسے ہوتے اور قادیان کے لیے الگ پروگرام بن گیا۔ یعنی ہر جمعے باہر سے ایک عالم جاتا اور راستے ہی میں یعنی بٹالہ پہنچ کر پکڑا جاتا۔ اس طرح صاحبزادہ فیض الحسن صاحب، مولانا محمد قاسم شاہجہان پوری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے علاوہ کارکنوں نے قادیان کی طرف رخ کیا۔ جانباز اور ان کے دوسرے ساتھی گرفتار ہونے لگے۔ مرزا محمود کی تدبیر کا اُلٹا اثر ہوا۔ بالآخر یہ پابندی ڈھیلی پڑ گئی۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب قید ہو چکے تھے۔ مرزا محمود کا بس چلتا تو وہ انہیں جیل سے باہر آنے کا موقع ہی نہ دیتا مگر برطانوی قوم بڑی ترکیب اور احتیاط سے چلنے والی قوم ہے اس نے مرزا صاحب کی کھلم کھلا امداد تو کی مگر قانون سے آگے قدم نہیں بڑھایا۔ ضلع گورداسپور میں ردِ مرزائیت کی تحریک دیہاتوں تک پھیل چکی تھی۔ قادیان سے باہر بٹالہ احرار کا مضبوط قلعہ تھا۔ یہاں حاجی عبدالرحمٰن صاحب رئیس بٹالہ اور ان کا خاندان احرار کی پشت پناہی پر موجود تھا۔ میں جب کبھی زیادہ پریشان ہوتا یا تھک جاتا تھا تو دو ایک روز کے لیے بٹالے چلا آتا۔ حاجی صاحب کا گھر میرا

Marfat.com

ریسٹ ہاؤس تھا۔ تازہ دم ہو کر پھر دارلفساد قادیان میں جا پہنچتا۔ حضرت شاہ صاحب قید سے رہا ہو کر جب امرتسر تشریف لے آئے تو قادیان کے لوگوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر قادیان تشریف لانے کی دعوت دوں۔ میرا قادیان سے اِس غرض کے لیے آنا تھا کہ خلیفہ صاحب نے قادیان اور لاہور کے ڈانڈے ملا دیئے۔ پیامی پر پیامی آنے جانے لگے حتیٰ کہ اس تگ و دو کے نتیجے میں حکومت پنجاب نے حضرت شاہ صاحب پر قادیان میں داخلے کی پابندی لگا دی۔ حکم ہوا کہ قادیان مرزائیوں کا مقدس مقام ہے (یعنی مرزائیوں کا کعبہ ہے) آٹھ میل کے رقبے میں بخاری صاحب کو داخل ہونے کی ممانعت ہے۔ دراصل یہ پابندی خلیفہ محمود اور حکومت پنجاب کا اعترافِ شکست تھا۔ اس حکم سے علاقے بھر میں اُداسی چھا گئی مگر اس کا یہ ردعمل ہوا کہ اس علاقے میں شاہ صاحب کی محبوبیت اور ردِ مرزائیت کے خلاف جذبے میں اضافہ ہو گیا۔

قادیان سے آٹھ میل دور شاہ صاحب کی تقریر

جب قادیان کے گرد و پیش کی آبادیوں میں مرزائیت کے خلاف بے پناہ نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا تو قادیان کے مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ وہ اس پر راضی ہیں کہ شاہ صاحب آٹھ میل دور کسی جگہ تشریف لے آئیں۔ ہم سب وہاں حاضری دے کر بخاری صاحب کے مواعظ حسنہ سے مستفیض ہوں گے چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک روزہ کانفرنس کا بندوبست کیا جائے یہ گاؤں سیدوں کی بستی ہے۔ سادات کی رگِ عصبیت پھڑک اٹھی اُن میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ہمارے معزز سید بھائی پر حکومت نے قادیان میں داخل ہونے کی پابندی لگائی ہے۔ ہمارے ہاں کانفرنس کا اہتمام ہو تو ہم خود بندوبست کریں گے۔ لیجیے کام بن گیا۔ اردگرد کے علاقے سے مسلمان جوق در جوق آ پہنچے۔ مجھے یاد ہے کہ قادیان کے مسلمانوں کا قافلہ مسانیاں کے لیے پیدل ہی چل پڑا کوئی دوست ایک اونٹ بھی لے آیا کبھی مجھے اور کبھی مولانا عنایت اللہ کو اونٹ پر سوار کرایا گیا۔ بہرحال جب ہم مسانیاں پہنچے تو دیکھا چاروں طرف مسلمانوں کے گروہ چلے آ رہے ہیں۔ بہت بڑا اجتماع ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب نے یہاں بڑے ہی پیارے انداز میں مسئلہ ختم نبوت بیان فرمایا۔ علاقے کے مسلمانوں میں بڑے پاکیزہ جذبات پیدا ہو گئے۔ مرزائیت کی تبلیغ کا سیلاب رُک گیا حضرت شاہ صاحب نے کفر کے اس سیلاب کے سامنے ایسا بند باندھا جسے مرزائیت توڑ نہ سکی۔

Marfat.com

دوسرا جلسہ

قادیان کے مغرب کی جانب جب مسانیاں کے کامیاب جلسے کا چرچا ہوا تو مشرقی جانب کے مسلمانوں نے اپنے ہاں جلسے کے انعقاد کا بندوبست کیا حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں التجا کی گئی کہ وہ موضع بھامڑی میں تشریف آوری کی منظوری دیں تا کہ علاقہ بھر میں اعلان کیا جا سکے منظوری کے بعد میں ایک روز کے لیے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ کافی عرصے سے پابندی لگ رہی ہے آپ کب تک قادیان کے گرد گھومتے رہیں گے؟ شاہ صاحب نے فرمایا جن ہاتھوں نے کفر کا یہ پودا لگایا ہے۔ وہ حفاظت بھی کر رہے ہیں۔

پابندی کی وجہ

مرزائیوں نے حکومت پنجاب کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر سید عطا اللہ شاہ بخاری قادیان میں داخل ہوں گے تو سخت فساد ہوگا۔ حکومت نے اس خدشے کا یقین کر لیا اور مسلسل پابندی لگ گئی۔ حکومت اور مرزائی دونوں کو یقین ہو گیا کہ اب بخاری صاحب قادیان نہیں آئیں گے میں نے خود بھی قادیان میں پراپیگنڈہ کیا کہ اب ہم نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ شاہ صاحب کو قادیان سے دُور ہی رکھا جائے۔ دُور دیہات میں جلسے کر کے ہمیں بہت کامیابی ہوتی ہے جب مرزائیوں اور حکومت کو یقین ہو گیا کہ احرار پابندی برداشت کر گئے ہیں۔ پابندی کی معیاد ختم ہونے پر نئی پابندی نہ لگائی گئی تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ شاہ صاحب بھامڑی کے جلسے میں آئیں تو کسی کو بتائے بغیر انہیں اچانک قادیان میں لے آؤں اور قادیان کے گلی کوچوں میں پھرا کر اچانک جلسہ کر لیا جائے اور پھر شاہ صاحب کو واپس امرتسر بھیج دیا جائے۔ گو میرا پروگرام بڑا خطرناک تھا مگر اس پروگرام کے بغیر مرزائیوں کے جھوٹے پراپیگنڈے کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

موضع بھامبڑی میں جلسۂ عام

میں اس ارادے سے بھامبڑی پہنچ گیا۔ رات کو زبردست جلسہ ہوا شاہ صاحب نے تقریر فرمائی تو مجمع جھوم جھوم گیا۔ کافی دیر تک تقریر ہوئی، جلسے کے بعد اسی گاؤں میں رات گزری، میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنے فیصلے سے خبردار نہیں کیا۔ صبح اذان ہوئی تو میں نے نماز کے فوراً بعد اُس لاری والے کے پاس پہنچا جس لاری میں بٹالے سے حضرت شاہ صاحب بھامبڑی تشریف لائے تھے۔ میں نے

Marfat.com

ڈرائیور سے کہا کہ اگر سیدھے راستے کی بجائے قادیان کی طرف سے ہو کر بٹالے چلو تو کیا لو گے؟ ڈرائیور رات کو شاہ صاحب کی تقریر سن چکا تھا اس نے جواب میں کہا: مولوی صاحب ایک پیسہ فالتو لینا حرام ہے۔ میری جان بھی حاضر ہے۔ جونہی اس نے رضامندی کا اقرار کیا میں شاہ صاحب کے پاس پہنچا۔ میں نے ان کو نہیں بتایا کہ میرا ارادہ کیا ہے؟ شاہ صاحب بخاری عادتاً اگلی سیٹ پر بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے ہمت سے کام لیا اور شاہ صاحب سے پہلے ڈرائیور کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا لاری چل پڑی شاہ صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شاہ صاحب کی تقریر بھی دلپذیر ہوتی ہے ان کی باتیں بھی دلچسپ ہوتی ہیں۔ باتوں باتوں میں موڑ آ گیا۔ جہاں سے ایک سڑک بٹالے کو جاتی ہے۔ دوسری قادیان کو، ڈرائیور نے میری طرف دیکھا میں نے اسے اشارہ کیا کہ ہمت کرو ہماری باتیں جاری رہیں۔ لاری نے خراٹے بھرنے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ ہم قادیان کے قریب پہنچ گئے۔ لاری آہستہ ہوئی کیونکہ ہم قادیان کی حدود میں پہنچ گئے تھے۔ جونہی لاری نے ریلوے لائن کو کراس کیا۔ لاری ذرا اچھلی شاہ صاحب فرمانے لگے ارے ہم کہاں آ گئے؟ ہمارے راستے میں ریلوے لائن تو تھی نہیں۔ جب لاری نشیب کی جانب اتری تو سامنے مرزا محمود کے ماموں ڈاکٹر محمد اسماعیل صبح کی سیر کے لیے ٹہلتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا۔ شاہ صاحب یہ ہیں مرزا محمود کے ماموں اور ادھر دیکھیے۔ یہ ہے ''منارۃ المسیح''۔ شاہ صاحب کا چہرہ مارے خوشی کے جگمگا اٹھا۔

قادیان میں داخلہ

ہماری لاری جب قادیان کی آبادی میں جا کر رکی۔ مسلمان، ہندوؤں اور سکھوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دفتر لے جانے کی بجائے ہم شاہ صاحب کو چودھری امام دین کے گھر پر مرزائیوں کے قریب لے گئے۔ جوان بوڑھے اور بچے شاہ صاحب کی زیارت کے لیے گھروں سے نکل آئے اور چودھری امام الدین کی بیٹھک کے سامنے جمع ہو گئے۔ قادیان کے مسلمانوں نے عید کی سی خوشی منائی۔ ہندو، سکھ اور مسلمان دوڑے چلے آ رہے تھے۔ یہاں کا پروگرام بھی میرے ذہن میں تھا مرزائیوں میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو حضرت شاہ صاحب کو کسی بہانے قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ باقی وہ تھے جو مرزا صاحب کے خاص الخاص معتبر تھے۔ ہم نے اپنے ہجوم کو کم کیا اور لوگوں کو منت سماجت سے بیٹھک کا دروازہ خالی چھوڑنے کو کہا تا کہ مرزائی راہگذر حضرت شاہ صاحب کی زیارت کر سکیں۔

Marfat.com

قادیان کی پولیس

قادیان کی پولیس چوکی کا ایک سکھ تھانیدار انچارج تھا۔ حضرت شاہ صاحب کی اچانک تشریف آوری سے تھانیدار بیچارہ گھبرا گیا۔ دوڑا دوڑا آیا اور مجھے دریافت کرنے لگا۔ جی ماسٹر صاحب کیا غضب کر دیا آپ حضرات نے، مَیں تو مارا جاؤں گا۔ خدا کے لیے بتاؤ۔ کیا پروگرام ہے۔ میں نے کہا سردار جی کیوں گھبراتے ہو۔ یہ تو سرا ہے چائے کا پروگرام ہے۔ بس جونہی چائے سے فارغ ہوئے حضرت شاہ صاحب اسی لاری میں بٹالے روانہ ہو جائیں گے اور کوئی بات نہیں۔ تھانیدار دوڑا دوڑا مرزائیوں کے ہاں پہنچا اور انہیں بتایا کہ وہ جا رہے ہیں۔ مرزا محمود مطمئن ہو گئے اگر میں پروگرام کا کوئی بھی حصہ اپنے ساتھیوں کو بتا دیتا۔ تبھی کام خراب ہو جاتا۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ شاہ صاحب تھوڑا سا آرام کریں گے۔ اتنے میں تم کھانا تیار کرا دو۔ شاید ہم ان کو یہاں کھانا کھلا کر روانہ کریں۔ پولیس والے باہر لاری کے پاس جمع ہو گئے ہیں کہ روانگی کے وقت کوئی گڑبڑ نہ ہو جب دو گھنٹے گزر گئے تو تھانیدار صاحب پھر تشریف لائے۔ میں نے کہا کھانا تیار ہو رہا ہے۔ بس گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد کھانا کھلایا اور پروگرام ختم ہوا۔ گھبرائیے نہیں۔ وہ بیچارہ پھر لاری کے پاس جا پہنچا۔ مرزا محمود کو پھر تسلی ہو گئی۔

قادیانی محل کی سیر

کھانے سے فارغ ہوئے تو میں نے حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا کہ اب آپ باہر تشریف لے آئیں۔ وہ باہر آنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے عبدالحق کو الگ لے جا کر آہستہ سے کہا کہ تم مسلمان محلوں میں اعلان کر دو کہ احرار کی مسجد میں حضرت شاہ صاحب تقریر فرمائیں گے۔ مسجد میں جلدی پہنچ جاؤ۔ عبدالحق بھاگا ہوا گیا اور ٹین اور ڈنڈا لے کر بازار میں اعلان کے لیے نکل آیا۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا باہر تشریف لے آئیے۔ وہ باہر آئے تو لاری کی جانب جانے کی بجائے ہم نے مرزائیوں کی انارکلی کا رخ کیا۔ یہ سڑک سیدھی قصرِ خلافت کو جاتی تھی۔ پولیس باہر لاری کے پاس تھی مرزا محمود کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ حضرت شاہ صاحب اس جانب کا رخ کر سکتے ہیں۔ ایک ہجوم شاہ صاحب کے جلو میں آ رہا تھا۔ اگر خلیفہ محمود کو وقت سے پہلے پتہ چل جاتا تو وہ ضرور کوئی حرکت کر بیٹھتے مگر انہیں تب پتہ چلا۔ جب حضرت شاہ صاحب ان کے محل کے سامنے تھے۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا اوپر قصرِ خلافت پر بھی نگاہ ڈالیے اور دیکھیے آپ کا مدمقابل اس کھڑکی

Marfat.com

میں چلمن کے پیچھے بیٹھا ہے۔ شاہ صاحب مستانہ وار بڑھتے چلے گئے۔ محل کے نیچے سے ہماری مسجد کا راستہ تھا۔ یہ بہت شارٹ کٹ تھا مگر ہم کبھی اس راہ سے گزرے نہ تھے، نہ ہی مسلمانوں کو ادھر سے گزرنے کا حوصلہ تھا۔

مسجد میں جلسہ

ہم سب مسجد میں جا پہنچے چند منٹ کے اندر تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ حضرت شاہ صاحب نے مسحور کن لے میں تلاوت کلام پاک شروع کی تو سامعین پر وجد طاری تھا۔ ختم نبوت پر تقریر شروع ہو گئی۔

مرزا محمود کی مجلس مشاورت

شاہ صاحب کی بہت قریب سے زیارت کے بعد مرزا محمود کے طوطے اُڑ گئے۔ جاسوسوں پر لعن طعن ہوتی رہی مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ بہت ہوشیار آدمی ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ احرار نے میدان مار لیا۔ وہ پراپیگنڈہ جس سے حکومتِ پنجاب کو گمراہ کر رکھا تھا۔ شاہ صاحب کی تشریف آوری اور قصرِ خلافت کی راہ سے گزرنے کے باعث جھوٹا ثابت ہو گیا۔ مرزا محمود نے آخری کوشش کی اور اپنے لٹھ بند رضا کاروں کو حکم دیا کہ مسجد میں چلے جاؤ، جلسے میں گھس جاؤ اور اعتراضات کر کے جلسہ درہم برہم کر دو۔

لٹھ بردار مرزائی رضا کاروں کا مسجد میں داخلہ

اچانک مسجد کے دروازے میں مرزائی نوجوانوں کا ہجوم نظر آیا۔ حضرت شاہ صاحب کو خدا نے بڑی سمجھ بوجھ اور اعلیٰ صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے۔ جونہی حضرت شاہ صاحب نے مرزائی نوجوانوں کو دروازے میں دیکھا فرمایا کہ راستہ دے دو، اندر آنے دو، ان نوجوانوں کو۔ بعض مسلمان نوجوانوں نے غصے میں مرزائیوں کی جانب دیکھا مگر شاہ صاحب کی فراخ حوصلگی دیکھ کر وہ سب خاموش رہے۔ شاہ صاحب نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم آگے سمٹ کر آ جاؤ اور ان حضرات کے لیے جگہ دے دو۔ مرزائی نوجوان تو لڑنے آئے تھے مگر حضرت شاہ صاحب کے اخلاق کی بلندی نے انہیں ٹھنڈا کر دیا۔ پھر جو شاہ صاحب نے تقریر شروع کی تو دس پندرہ منٹ بعد مرزائی نوجوان بھی جھومنے لگے۔ ایک جگہ حضرت شاہ صاحب نے تقریر کرتے ہوئے لفظ مرزائی استعمال کیا تو ایک مرزائی

Marfat.com

نوجوان چمک کر بولا: شاہ صاحب ہمیں مرزائی مت کہو۔ ہم احمدی ہیں۔ شاہ صاحب نے انہیں احمدی کہنا شروع کر دیا مگر شاہ صاحب نے تقریر فرمائی۔ علم و عرفان کے موتی بکھیرے اور مسئلہ اس خوبصورتی اور اس پیارے انداز میں سمجھایا کہ سامعین عش عش کر اٹھے۔ تقریر کے خاتمے پر حضرت شاہ صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے بیچارے مرزائی بھی پھنس گئے ان کو دعا میں شامل ہونا پڑا۔ حضرت شاہ صاحب نے درد بھرے دل سے دعا مانگی۔ عجیب سماں تھا۔ جلسہ ختم ہوا اور ہم سب دوسرے راستے یعنی بازار کی راہ سے لاری تک پہنچ گئے۔ لاری بستی سے باہر کھڑی تھی۔ لاری چلنے لگی تو تکبیر کے نعروں کے ساتھ مجلس احرار، ختم نبوت اور حضرت امیر شریعت زندہ باد کے نعرے لگے۔ خدا جانے مرزا محمود کا کیا حال ہوا ہوگا؟ یہ ہماری پہلی فتح تھی اور مرزا محمود کی پہلی شکست۔

جلسے کے گہرے اثرات

قادیان میں حضرت شاہ صاحب کے جانے اور جلسہ کرنے کا یہ اثر ہوا کہ اخبارات نے مقالے لکھے۔ جلسوں میں حکومت کی مرزائیت نوازی اور مرزائیوں کے جھوٹے پراپیگنڈہ کا تذکرہ ہوا تو حکومت مجبور ہوگئی کہ وہ خود کو غیر جانبدار ثابت کرے۔ اس واقعے سے یہ بھی ہوا کہ اوپر کا دباؤ کم ہوگیا مگر اندر خانے خود کاشتہ پودے کی آبیاری بدستور جاری رہی۔ ہمارے حوصلے بلند ہوگئے۔ ہمارے مبلغ کھلے میدان میں جلسہ کر کے مسئلہ ختم نبوت سمجھانے لگے۔ جوں جوں فضا سازگار ہوتی گئی۔ تبلیغ کا کام زوروں پر شروع ہوگیا۔ احرار نے ایک لاؤڈ سپیکر بھی خرید لیا۔ اس لاوڈ سپیکر کے ذریعے قادیان کے گلی کوچوں میں حق آواز پہنچنے لگی۔ مولانا عنایت اللہ صاحب اور مولانا محمد حیات رات کو کسی مناسب مقام پر لاؤڈ سپیکر لگا کر مسئلہ ختم نبوت پر تقریر کر لیا کرتے۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ خلیفہ محمود صاحب بھی اپنا ایمان تازہ کر لیا کرتے تھے۔ وہ بھی اپنے محل میں بیٹھے بیٹھے کلمہ حق سن لیتے تھے۔

مرزائیوں کے ٹھاٹھ

مگر ان سب باتوں کے باوجود مرزائیوں کا اس قدر رعب تھا کہ پولیس بھی ان سے مرعوب تھی اور قادیان کے غیر مرزائیوں پر بھی ایسا رعب تھا کہ انہیں ہر وقت مرزائیوں کے عتاب کا دھڑکا لگا رہتا۔ خاندان ''نبوت'' کا تو اس قدر رعب تھا کہ انہیں دیکھ کر اُمتِ مرزائیہ بھی کانپ جاتی تھی۔ خلیفہ محمود کے چھوٹے بھائی میاں محمد شریف اس معاملے میں بڑے دلیر تھے۔ وہ کچھ دن شاید فوج میں بھی گزار آئے

Marfat.com

تھے۔ ویسے وہ چھوٹے بھائی ہونے کی وجہ سے ناز پروردہ بھی تھے۔ ان میں اچھی خاصی اکڑفوں تھی۔ مسلمانوں پر بھی ان کا اچھا خاصا رعب تھا۔ خلیفہ صاحب کبھی پیدل نہیں نکلتے تھے۔ وہ قصرِ خلافت کے دروازے پر کار میں بیٹھتے۔ یہ جس طرح آپ اپنے بڑے وزیروں یا گورنروں کو نکلتا دیکھتے ہیں۔ آگے آگے موٹر سائیکل پھر جیپ کاریں پھر کاریں پھر گورنر صاحب یا وزیراعظم یا صدر صاحب انہیں کے طمطراق سے گزرتے تھے۔ اچھی موٹر سائیکل یا جیپ کاریں نہ سہی سائیکل سوار ہی سہی۔ انہی کو آگے لگا کر ہٹو بچو سرکار حضور اقدس خلیفہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ لوگ دورویہ کھڑے ہو جاتے۔ کسی کھڑکی کا دروازہ بند ہو جاتا کوئی نیک بخت زیارت کے لیے پٹ کھول کر رکھتی۔ یوں ترکیبوں سے ساری بستی پر مرزائیوں نے رعب جما رکھا تھا۔ یہ رعب بھی بہت زبردست رکاوٹ تھی جب تک یہ رعب اٹھ نہ جائے لوگ دل کی بات زبان پر کیسی لائیں؟ اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اس کے اظہار کی جرأت کہاں سے لائے؟ تاہم رعب میں اس روز جنبش ضرور آئی جس روز حضرت شاہ صاحب نے قادیان پہنچ کر قصرِ خلافت سے گزر کر جلسہ عام میں مسئلہ ختم نبوت پر تقریر کی مگر یہ تو حضرت شاہ صاحب کی بزرگی اور کرامت تھی کہ وہ ان مرزائیوں کو جو مرنے مارنے کے لیے لٹھ لے کر آئے تھے۔ مسئلہ ختم نبوت اچھی طرح سمجھا کر دل و دماغ میں بٹھا کر لے گئے۔ شاہ صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد مرزا محمود نے پراپیگنڈے کیے اور دوبارہ ''ہوا'' باندھنے کے جتن کیے۔ میری نگرانی بہت سخت ہو گئی مگر میں وہاں کرتا ہی کیا تھا۔ جس پر مجھے قادیان سے نکلوایا جاتا۔

مرزائیوں کا حج

مرزا محمود کی سی آئی ڈی یعنی گل نور صاحب نے میرے ہاں ڈیرے ڈال لیے۔ جس سے مجھے کچھ مشکل بھی پیش آئی۔ مرزائیوں کا سالانہ جلسہ جسے وہ دراصل حج سمجھتے تھے۔ سر پر آ رہا تھا۔ کم و بیش پانچ سات ہزار مرزائی بیرون جات سے قادیان میں آیا کرتے تھے۔ ہمیں یہ دقت درپیش تھی کہ جب مرزائیوں کا تین دن کا جلسہ ہو گا تو ہمیں بھی حق کی آواز بلند کرنا چاہیے۔ مولانا عنایت اللہ صاحب سے مشورہ ہوا کہ ہم بھی لٹریچر تقسیم کریں اور ہو سکے تو جلسے بھی کریں۔ مرکز کے پاس مرزائیوں کے مقابلے میں اس قدر فنڈ نہ تھا کہ مرزائیوں کے لٹریچر کا لٹریچر سے مقابلہ کیا جائے۔

Marfat.com

رَبّ جی یا رَبِّ قادیان

ایک برہمن نوجوان مسمی برہمچاری اور چند اور ہندو دوست میرے مکان پر آیا کرتے تھے۔ برہمچاری صاحب میرے مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رَبّ جی رَبّ جی کا ورد کیا کرتے تھے۔ان کے دوستوں نے ورد سے متاثر ہو کر انہیں رب جی کہنا شروع کر دیا۔ میں نے ایک روز برہمچاری صاحب سے کہا کہ آپ نے خود بھی اپنے کو رب جی کہلوانا پسند کیا ہے یہ تو اچھی بات نہیں۔ برہمچاری صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ میں قادیانی رب جی ہوں۔ رب جی کہلانا اتنا خطرناک نہیں جتنا خواہ مخواہ نبی بن جانا خطرناک ہے۔رب جی کہلانے والا مر جائے تو قضیہ ختم ہو جاتا ہے مگر نبی کا معاملہ الٹا ہے۔ بالکل مختلف ہے۔آپ نہیں دیکھتے، ہمارے ہاں قادیان میں کیسا فساد کھڑا ہو گیا ہے؟ میں یہ سن کر خاموش ہو گیا۔اس لیے کہ میرے نزدیک مرزا غلام احمد کی نبوت بھی ایک سیاسی مذاق ہی تھا جس سے مسلمانوں کے دل مجروح ہوئے اور عالمگیر فساد کھڑا ہو گیا مگر اس بستی میں سبھی قسم کی گنجائشیں موجود تھیں جونہی جلسہ قریب آیا۔رَبِ قادیان نے پر پرزے جھاڑے ایک لمبا ترشول، لمبا چوغہ، ماتھے پر تلک اور منہ پر داڑھی، عجب ہیئت بنائے، وہ میرے مکان پر آ دھمکا۔ میں نے کہا۔ بھئی برہمچاری آج تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ کہنے لگا ہمارے نبی کا عرس ہونے والا ہے۔ یہ سب تیاریاں اس دن کے لیے ہیں۔

رَبِ قادیان تھانے میں

چند روز بعد میں اپنے مکان پر موجود تھا۔ مجھے ایک دوست نے اطلاع دی کہ تھانے میں رَب جی نے آپ کو بلایا ہے۔ میں تھانے پہنچا تو دیکھا کہ باہر کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ اندر رب جی بھی موجود ہیں اور ان کے برابر والی کرسی پر قادیانی ناظر امور عامہ اور چند اور مرزائی بزرگ تشریف فرما ہیں۔ قصہ یہ ہوا کہ ''رب قادیان'' ایک سٹول بغل میں دبائے ہاتھ میں چنے جور گرم والی گھنٹی لیے مرزائیوں کے جلسہ کے قریب جا دھمکے اور انہیں اپدیش دینے لگے۔ مرزائیوں نے اسے تفریح کا سامان سمجھا۔ کسی منچلے مرزائی نے رَبِ قادیان پر اعتراض کیا کہ رب پاؤں سے لنگڑا بھی ہوتا ہے؟ برہمچاری نے حاضر جوابی کا شاندار ریکارڈ قائم کر دیا۔ ایسا الزامی جواب دیا کہ مرزائی بھنا گئے۔ کسی نے پھر اعتراض کیا کہ ذرا اپنے ٹیڑھے پاؤں کی طرف تو دیکھیے۔ رَبِ قادیان نے اس پر ایک آسمانی وقوعہ کہہ سنایا۔ غرض یہ کہ

Marfat.com

برہمچاری نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ نبوت وغیرہ محض دھوکہ ہے اس میں حقیقت ہوتی تو ہم اسے سب سے پہلے قبول کرتے۔ دوسرے دن پھر برہمچاری جلسے کے قریب جا حاضر ہوئے۔ مرزا صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے حالیوں موالیوں کو بھیجا کہ برہمچاری کا دماغ درست کرو۔ یہ حضرات برہمچاری سے الجھے تو معاملہ تھانے تک جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی برہمچاری نے کہا کہ دیکھیے ماسٹر صاحب مجھے تبلیغ سے روکا جا رہا ہے۔ مرزائی اپنے نبی کی تبلیغ کا کام کر سکتے ہیں مگر مجھے خود اپنی تبلیغ سے روکا جا رہا ہے۔ میں خاموشی سے فریقین کی باتیں سنتا رہا۔ مرزائیوں نے تھانیدار سے کہا کہ صاحب ہماری رپورٹ لکھیے۔ یہ برہمچاری خود کو رَبِ قادیان کہہ کر ہماری دل آزاری بھی کرتا ہے اور اِس نے نقص امن کا اندیشہ بھی پیدا کر رکھا ہے۔ اس کی ضمانت لیجیے۔ اس پر میرا ذہن اپنے کیس کی جانب گیا میں نے مرزائی نمائندے کی تائید کر دی برہمچاری نے حیرانی سے میرا منہ تکنا شروع کیا۔ تھانیدار صاحب بھی حیران تھے کہ میں مرزائیوں کی تائید کر رہا ہوں جب وہ رپورٹ درج کرانے لگے تو میں نے اپنی تائید کی وجہ بتائی پھر تو رپورٹ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ میرے ہمراہ ہمارے مخلص کارکن حافظ محمد خان تھانے میں موجود تھے۔ میں نے تھانیدار صاحب سے کہا کہ ہمارے حافظ صاحب یہ رپورٹ لکھوانے آئے ہیں کہ غلام احمد نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے اور یہ مرزائی حضرات کھلے بندوں اس نبوت کاذبہ کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ان سب کی ضمانتیں ہونی چاہئیں۔ تھانیدار صاحب نے قلم سنبھالا اور فریقین سے کہا کہ دونوں رپورٹوں کی نوعیت ایک ہی ہے۔ آپس میں بات کر لیجیے۔ پھر رپورٹ لکھوایئے۔ مرزائیوں نے مجھ سے بات کی، برہمچاری کو رضامند کیا گیا، سمجھوتے کے بعد فریقین رپورٹ لکھائے بغیر تھانے سے واپس آ گئے۔ برہمچاری کو ہم نے سمجھایا کہ بھئی ان کے جلسے کے قریب نہ جاؤ۔ ذرا پرے ہی رہو اور بہتر یہ ہے کہ تم اب خاموش ہی رہو کیونکہ یہ لوگ فساد پر آمادہ ہو گئے تو مٹھی بھر لوگ ان کا کیسے مقابلہ کریں گے۔

بہرحال باہر سے آئے ہوئے مرزائیوں میں سے بعض بھولے بھالے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ بھئی یہ ''رب جی'' بعض باتیں تو بڑے مزے کی کر رہا تھا جو متذبذب تھے یا جن مسلمانوں کو باہر سے ہموار کرنے کے لیے لایا گیا تھا۔ انہیں قادیان کا سارا کھیل ہی فراڈ معلوم ہوا۔ بہرحال رَبِ قادیان، قادیان سے باہر بھی جلسے کرنے لگا اور ان کے جلسوں میں اچھی خاصی حاضری بھی ہونے لگی۔ برہمچاری سُلجھے صاحب بڑے سُلجھے ہوئے انسان ہیں وہ پاکستان کی سیر بھی کر گئے ہیں یہاں وہ سید مظفر علی شاہ شمسی کے

Marfat.com

مہمان تھے۔ایک روز میرے ہاں بھی چائے پر تشریف لائے تھے۔

ہفت روزہ اخبار

انہی دنوں قادیان سے ہفت روزہ اخبار بھی جاری کیا۔ اس میں خواب تو میں لکھا کرتا تھا۔مضامین عالم سیاہ پوش لکھا کرتے تھے ڈیکلریشن رب قادیان کے نام تھا۔ مجھے دو تین خواب آئے تھے کہ مرزا صاحب نے خفا ہو کر شاید بددعا کی۔ اسی وقت برہمچاری سے اخبار کی ضمانت طلب کر لی گئی۔ ہمارے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی کہ ضمانت داخل کر دیتے۔ اخبار بند ہو گیا۔ ورنہ مجھے خواب آنے لگے تھے۔ میرے خواب مرزا محمود کے رویا کے جواب میں آیا کرتے تھے۔ ہم پھر نہتے ہو گئے۔ ''الفضل'' مرزا صاحب کے رویا شائع کرتا رہا۔ مرزا محمود کے خوابوں کو سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔ ہمیں قادیان کی نبی خیز زمین نے اس قابل بنا دیا تھا کہ مرزا محمود کے خواب کی صحیح تعبیر بتا سکیں۔ مذہبی حیثیت کا وہ رعب جو مرزائیوں نے بڑی محنت سے جما رکھا تھا۔ اُسے رب قادیان کے اعلان نے مجروح کر دیا مگر مادی طاقت کا رعب علیٰ حالہ قائم تھا۔ احرار کے مبلغوں نے قربانی اور حوصلہ مندی سے اس رعب کو کم تو کر دیا مگر جب تک بے رعبی نہ ہو، جمی ہوئی ہوا کا اُکھڑنا محال ہے۔ قصرِ خلافت میں گڑبڑ ہوئی اندر کی باتوں کو باہر لانا خلافِ مصلحت بھی ہے اور اخلاق اور شرافت بھی ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

اچانک حادثہ

مجھے اپنے مکان میں بیٹھے قادیان کے اندرونی حالات کی اکثر خبریں مل جایا کرتی تھیں۔ میں اب قادیانی فضاؤں کو سونگھ کر بتا سکتا تھا کہ درجہ حرارت کیا ہے؟ مولانا عنایت اللہ صاحب دورے پر تشریف لے گئے۔ حافظ محمد خان اپنے وطن دس پندرہ روز کے لیے رخصت پر چلے گئے۔ باقی مبلغ باہر مناظروں پر چلے گئے۔ میں اپنے مکان میں اکیلا تھا۔ میرے پاس نور گل بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان دھڑام سے میرے صحن میں آ کودا۔ وہ اچانک وارد ہوا۔ ہاتھ میں لاٹھی۔ سانس کچھ پھولا ہوا۔ کم بخت نے خود ہی ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی۔ میں گل نور کے لیے چائے بنا رہا تھا۔ چائے دانی میں چائے ڈال کر انگیٹھی پر دودھ رکھنے لگا کہ یہ واقعہ ہوا۔ گل نور نے کہا حنیف کیا ہوا حنیف نے جواب دیا ''گل تہاڈے نبی دا پتر لمبا پا کے آیا واں'' (میں تمہارے نبی کے بیٹے کی پٹائی کر کے آیا

Marfat.com

ہوں) میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ارے ظالم یہ کیا کیا تو نے؟'' اور پھر ایسی حرکت کر کے یہاں کیوں چلا آیا۔ حنیف اٹھارہ بیس سال کا نوجوان ایک گداگر کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ جمعرات کو ''فضل مولا'' کی صدا لگا کر مسلمانوں کے گھروں سے روٹیاں مانگ کر لے جایا کرتا تھا۔ اس حنیف کا ایک بڑا بھائی تھا مگر وہ قادیان میں بہت کم رہا کرتا تھا۔ ہم نے سنا کہ وہ ڈاکو تھا۔ بہر حال لوگ اس کی بہادری اور جرأت کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ شاید ایسا ہی ہو میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس واقعے سے میرے تو حواس باختہ ہو گئے۔ میں نے خیال کیا کہ جاسوس میرے پاس موجود ہے اور یہ کم بخت حنیف گڑبڑ کر کے میرے ہی گھر کو خانہ انوری سمجھ کر آ کود اب گل نور نے چشم دید گواہ بن جانا ہے۔ میں خواہ مخواہ ملوث ہو کر دھر لیا جاؤں گا۔ واقعہ یہ ہوا کہ اس سے قبل حنیف کو غریب سمجھ کر مرزا شریف احمد نے ڈانٹا بھی اور شاید ایک آدھ چپت بھی رسید کی۔ یہ بات بہت دن بعد جب حنیف اس مقدمہ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے خود مجھے بتائی خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ بات درست بھی تھی یا نہیں۔ کیا معلوم کم بخت نے جھوٹ بولا ہو (واللہ اعلم بالصواب) میں کچھ دیر تو گھبرایا رہا مگر چند منٹ بعد میں سنبھل گیا۔

گل نور کی آزمائش

میں نے گل نور سے کہا کہ دیکھو بھئی گل نور میرے تمام ساتھیوں نے مجھے بہکانا چاہا اور تمہارے خلاف بہت کچھ کہا اور کھلے لفظوں میں کہا کہ گل نور خلیفہ محمود کی سی آئی ڈی ہے مگر تمہیں معلوم ہے کہ میں نے انہیں کیا جواب دیا کہ اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ میں صحیح سمجھا تھا۔ وہ بولا درست کہتے تھے۔ گل نور کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ بے شک آج میں بھی آپ کو یقین دلا دوں گا کہ آپ ہی نے سچ سمجھا تھا۔ بات ختم ہو گئی میں نے کہا۔ گل نور اب ہم کیا کریں۔ اس کم بخت کے بچے نے تو غضب ہی کر دیا۔ یہ آج ہمارے مکان سے پکڑا جائے تو پھر میں آج قرآن بھی سر پر اٹھا کر کہوں کہ میرا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کون یقین کرے گا اور تو اور میرے اپنے ساتھی کبھی یقین نہ کریں گے۔ یار بڑا غضب ہو گیا۔ کوئی ترکیب بتاؤ۔ گل نور نے حنیف سے دریافت کیا کہ واقعہ کیا ہے اور بتاؤ کہ وہاں کون کون تھا۔ حنیف نے بتایا کہ صاحبزادہ شریف احمد سائیکل پر سوار آ رہے تھے۔ میں میاں عبداللہ کے مکان کے باہر چبوترے پر بیٹھا تھا۔ یہ دیکھیے میری ران پر پھوڑا نکلا ہوا ہے اور اس لاٹھی کے سہارے چل کر وہاں تک پہنچا تھا۔ میں اٹھ کر بازار کی جانب چلنے لگا۔ پیچھے سے صاحبزادہ صاحب

Marfat.com

میرے سر پر آ گئے۔ وہ چند روز قبل مجھے بے عزت کر چکے تھے۔ میں لنگڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے ان کی آواز آئی اوحرامزادے! راستہ چھوڑ کر چلو جونہی میں نے ان کی صورت دیکھی اور پہچانا۔ مجھے پہلا واقعہ بھی یاد آ گیا اور تازہ گالی نے بھی مجھے گرما دیا مجھے اپنا زخم بھی بھول گیا۔ میں نے جونہی وہ مجھ سے آگے بڑھنے لگے میں نے گھما کر حصہ اسفل پر لاٹھی رسید کی وہ چکرا کر گرے۔ منہ دوسری طرف تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دو ایک اور رسید کر دیں اور لپک کر گلی میں سے ہوتا ہوا دوسری جانب بھاگ نکلنے کی بجائے ادھر چلا آیا۔ مجھے میاں صاحب نے بھی نہیں پہچانا اور نہ اس وقت وہاں کوئی اور موجود تھا۔ میں نے کہا۔ ظالم تو نے ہمیں تو پھنسا دیا حنیف نے کہا۔ ''واہ مولوی جی تساں ڈردے او آکھوتے میں میدان وچہ جا کھلواں'' (واہ مولوی صاحب اگر آپ ڈرتے ہیں تو میں ابھی جا کر میدان میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔) کم بخت کی جرأت نے ہم دونوں کو گرویدہ کر لیا۔ گل نور نے مشورہ دیا کہ استرے سے حنیف کے زخم لگا دیئے جائیں اور پھر کہہ دیا جائے کہ میاں احمد نے چاقو سے حملہ کیا تب حنیف نے بھی لاٹھی استعمال کی۔ حنیف نے کہا کہ لائیے میں خود ہی زخم لگا لیتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ لو آغا تم ابھی چائے پیو اور پھر جس طرح کہو گے۔ کر لیا جائے گا ابھی تک بازار میں صرف شور اور ہنگامہ تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس نے مارا؟ کیوں مارا اور ملزم کدھر گیا یا ملزم کون تھا۔ چائے کے بعد میں نے گل نور سے کہا۔ آغا ارے بھئی اگر کوئی ادھر آ نکلا تو غضب ہو جائے گا۔ خدا کے لیے تم چپکے سے کھسک جاؤ۔ میں حنیف کو استرا دیتا ہوں۔ یہ خود ہی زخم کر لے گا۔ آغا نے حنیف کو تاکید کر دی کہ دیکھنا زیادہ گہرے زخم نہ لگا لینا ایک زخم ذرا گہرا ہو اور دو تین معمولی زخم ہوں۔ بس گزارہ ہو جائے گا۔ لو میں جا رہا ہوں۔ یہ کہا اور جانے لگا۔ میں نے اسے پھر تاکید کی کہ راز افشا نہ ہو۔ وہ چلا گیا۔ حنیف کی گمشدگی اس کے جاتے ہی حنیف نے مجھ سے کہا۔ لاؤ استرا میں نے اسے کہا کہ خبردار کسی زخم کی ضرورت نہیں۔ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کا ارتکاب کرنا چاہتے ہو گل نور بیگانہ آدمی ہے۔ آؤ میں تم کو دوسری جگہ پہنچا دوں۔ میرے مکان سے کچھ فاصلے پر اسی کوچے میں ایک مسلمان دکاندار کا گھر تھا۔ وہ بٹا لے گیا تو مجھے کہہ گیا کہ میں اپنے مکان کے باہر کنڈی لگا۔ کر اوپر سے چک ڈال چلا ہوں۔ دھیان رکھنا رات کی گاڑی سے نہ آ سکا تو کل آؤں گا میں نے حنیف کو کہا کہ میرے پیچھے آؤ۔ چک اٹھا کر دروازہ کھولا۔ اسے اندر داخل کر کے کہا کہ پچھلے کمرے میں چلے جاؤ، میں نے اوپر سے چک ڈال دی اور اپنے مکان پر واپس آ گیا۔ کچھ دیر بعد ہڑتال ہو گئی۔ مرزائی مسلح ہو کر میدان میں آ گئے۔ تھانہ بھی حرکت میں آ گیا

Marfat.com

مسلمان گھبرا گئے۔ رات کو مرزائیوں نے میرے مکان کے دونوں جانب لٹھ بند مرزائی رضا کاروں کا پہرہ لگا دیا۔ پولیس بھی گلی کوچوں میں گشت کرنے لگی۔ غریب جان سے مارا جائے۔ مرزائی سر بازار تھانیدار کی پگڑی اچھالیں۔ غریبوں کی آبرو لٹ جائے۔ کوئی نہیں پوچھتا مگر بڑے آدمی کی نکسیر پھوٹ جائے تو ہڑتال ہو جاتی ہے۔ بستی بھر میں ہلڑ بازی ہوتی ہے۔ خلاف قانون چھریاں چاقو لاٹھیاں اور اسلحہ ہاتھ میں لے کر بے گناہوں کو دھمکایا جائے، قانون خاموش رہتا ہے۔ حکام کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ اس واقعے سے قادیان میں سناٹا چھا گیا رات کی تاریکی نے دہشت کے اثرات کو زیادہ گہرا کر دیا۔

صبح ہوئی تو تھانے سے پولیس کی گارڈ کے ہمراہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی تشریف لے آئے۔ میں نے علی الصبح چوبارہ کی کھڑکی کو کھول کر باہر جھانکا تو دیکھا کہ قادیان کا تھانیدار گلی میں سے گزر رہا ہے۔ میں نے تھانیدار کو آواز دی اجی سردار صاحب۔ کیا ماجرا ہے؟ تھانیدار نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور کہا کہ آپ کو معلوم نہیں۔ بڑا غضب ہو گیا۔ چھوٹے میاں صاحب کو کسی نے مارا ہے۔ میں نے کہا۔ ایسے واقعات تو یہاں ہر روز ہوتے ہیں۔ کبھی گاردیں باہر سے نہیں آئیں۔ کبھی پہرے نہیں لگتے۔ بڑا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ میاں صاحب کو چوٹ آ گئی ہے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دیں۔ ساری بستی کو پریشان کرنے کے کیا معنی، تھانیدار نے مجھے اشارے سے کہا خاموش رہو۔ تھانیدار چلا گیا۔ صبح کا وقت تھا میں نے مسلمان ہمسایوں کو آواز دے کر باہر بلوایا اور انہیں کہا کہ تمہیں کیا سانپ سونگھ گیا ہے؟ ارے بھئی کیا ہو گیا ایک شخص کو کسی نے مارا ہے۔ اس پر یہ سناٹا کیوں ہے۔ کام کاج شروع کرو؟ جاؤ اپنی دوکانیں کھولو۔ کیا قیامت آ گئی ہے؟ میں نے زور زور سے بلند آواز میں باتیں شروع کر دیں۔ لوگ چلنے پھرنے لگے۔ اس کے بعد بازار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ عجیب عجیب باتیں سننے میں آئیں۔ بہر حال حالات نارمل ہو گئے۔ دن نکل آیا۔ صبح سویرے ''الفضل'' نکلا جس میں درج تھا کہ شریف احمد کو سر بازار لاٹھیوں سے پیٹ ڈالا۔ میں نے اندرونی کمرہ جہاں بیٹھ کر گل نور اور حنیف نے چائے پی تھی۔ مقفل کر دیا اور خود اوپر چلا گیا تھا۔ دن کے وقت گل نور آیا اور مجھ سے دریافت کرنے لگا کہ حنیف کا کیا بنایا۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ حنیف نے زخم گہرے کر لیے تھے۔ میں نے اسی وقت اسے گورداسپور کے ہسپتال بھجوانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ صبح ہسپتال میں داخل ہو گیا ہو گا۔ گل نور آ کر بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔

Marfat.com

''الفضل'' کا ضمیمہ

شام کو ''الفضل'' کا ضمیمہ نکلا جس میں درج تھا کہ ملزم نے اپنے جسم پر خود ہی زخم لگا لیے تھے اور اب وہ گورداسپور کے ہسپتال میں داخل ہے۔ میں نے خبر پڑھی تو مجھے بے اختیار ہنسی آئی کہ سی آئی ڈی بڑی ہوشیار ہے۔ رات کو گل نور پھر ملنے آیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ مرزائیوں کی موٹر سول ہسپتال گورداسپور روانہ ہو چکی ہے۔ صبح موٹر بے نیل مرام واپس آ گئی۔ گل نور صبح کے وقت آیا تو میں نے اسے بتایا کہ حنیف کے ساتھی) بڑے بے وقوف اور بے حوصلہ لوگ ہیں۔ گورداسپور کی بجائے اسے بٹالے لے گئے۔ اس خبر کو پا کر الفضل نے ضمیمہ نکالنے کی بجائے تصدیق کر لینا ضروری خیال کیا۔ چنانچہ مرزائی کارندے بٹالے کے ہسپتال میں حنیف کے زخموں کی مرہم پٹی دیکھنے کے لیے ہسپتال کا کونہ کونہ تلاش کرتے رہے۔ بات ٹھنڈی پڑ گئی۔

حاجی عبدالرحمٰن کا گھر

دوسرے دن میرے ہمسائے نے بٹالے سے واپسی پر مکان کھولا تو اسے معلوم نہ تھا کہ آفت کا پرکالا حنیف اس کی پچھلی کوٹھری میں موجود ہے۔ وہ شام کو حقہ لے کر میرے مکان کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ بڑا مطمئن تھا۔ میں نے سمجھا اس نے ابھی تک حنیف کی زیارت نہیں کی۔ میں نے اسے اوپر بلا لیا۔ چھوٹے میاں صاحب کی مرمت کا قصہ شروع ہوا تو وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگا اور کہنے لگا کہ اچھا ہوا۔ میں یہاں موجود نہ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ بھئی شیخ جی! میاں صاحب کو کس نے مارا؟ اس نے کہا۔ اجی مرزائیوں کا آپس ہی کا قصہ ہوگا۔ وہ اطمینان سے حقے کے کش لگاتا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ بالآخر میں نے اسے بتایا کہ اس طرح اچانک یہ واقعہ ہوا۔ بیچارہ دوکاندار تو تھا ہی، گھبرا گیا۔ منتیں کرنے لگا میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ تمہاری طرح میں بھی خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہوں۔ کم بخت نے ہمیں بلاوجہ خراب کیا۔ میں اس کے مکان پر پہنچا۔ اندر جا کر آواز دی کوئی جواب نہ ملا مجھے بڑی فکر ہوئی کوٹھری میں داخل ہو کر دیکھا تو وہ سو رہا تھا۔ اسے جگایا اور عرض کیا کہ حنیف صاحب اب یہاں سے کھسک جاؤ وہ جان گیا اس نے کہا کہ میری تھوڑی سی امداد کر دو مجھے بٹالے کسی اچھے ٹھکانے پر پہنچا دو۔ جہاں جا کر میں پولیس کے سامنے پیش ہو کر صحیح صحیح بات بتا کر اقبال جرم کر لوں گا کہ میں نے میاں صاحب کی تواضع کی ہے۔ حاجی عبدالرحمٰن بڑے دلیر اور بڑے ہی بہادر انسان ہیں۔ چنانچہ حنیف ان کے ہاں راتوں رات جا پہنچا۔ صبح کو وہ تھانے میں حاضر تھا۔ مقدمہ چل

Marfat.com

پڑا۔ حاجی صاحب نے حنیف کی ضمانت کرادی۔ اس قصے میں ہم بالکل بے قصور تھے۔ خلیفہ محمود کو بھی اپنے معتبر آدمی کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ حنیف نے سب کچھ خود ہی کیا ہے مگر وہ کم بخت ضمانت پر رہا ہوا تو تیسرے دن بٹالے سے سیدھا میرے ہاں آ پہنچا۔ گل نور اس وقت بھی موجود ہی تھا۔ حنیف نے آتے ہی زنانے دار سلام کیا۔ ہم نے پوچھا۔ کیوں بھئی اب کیا ہے؟ کہنے لگا۔ اجی اب کوئی بات نہیں میں پیش ہو گیا تھا مقدمہ چل پڑا ہے۔ حاجی صاحب نے ضمانت کا بندوبست کر دیا ہے۔ ایک وکیل کا بندوبست بھی ہو گیا ہے حاجی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ میری بڑی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ وہ بڑے دلیر آدمی ہیں۔ لوگوں کو بلا بلا کر مجھے دکھاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ''صاحبزادہ محمد حنیف'' ہیں اور گل نور اس کی باتیں سن کر ہنسنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ بابا تم وہیں رہتے۔ یہاں آ کر کیا لینا تھا؟ یہ تو مرزائیوں کا قلعہ ہے۔ مگر حنیف نہ مانا۔ کہنے لگا مولوی جی میں اس لیے یہاں واپس آیا ہوں کہ لوگ یہ نہ کہیں حنیف بھاگ گیا۔

اخبارات میں مقدمے کی روداد

اخباروں نے حنیف کے مقدمے کی سرخیاں خوب جمائیں۔ اس قسم کے عنوان سے خبریں شائع ہوئیں۔ ''صاحبزادہ محمد حنیف اور صاحبزادہ محمد شریف کا مقدمہ''۔ مجھے یاد ہے۔ بعض اخباروں نے صاحبزادوں پر تبصرہ میں لکھا کہ دونوں صاحبزادگان نذر نیاز ہی پر گزارا کرتے ہیں۔ ایک اعلیٰ پیمانے پر نذر وصول کرتا ہے ایک گھٹیا طریقے سے نذر کی بجائے خیرات پر اکتفا کرتا ہے۔ بہر حال قدرت نے ایک فقیر کے بیٹے کے ہاتھوں ہوا خیزی کا سامان کر دیا۔ مقدمہ چل رہا تھا مگر حنیف پیشی بھگت کر قادیان چلا آتا تھا۔ میں نے حنیف سے کہا کہ میاں حنیف تم کام کیا کرو۔ ماشاء اللہ جوان ہو۔ دست و بازو سے کما کر کھانا چاہیے۔ اس نے کہا۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کاروبار کروں۔ آموں کا موسم آ گیا۔ حنیف نے آم خرید کر (چھابڑی) خوانچہ لگا لیا۔ حنیف بڑا دلیر تھا۔ وہ خوانچہ لے کر مسلمانوں کے محلّہ سے ہوتا ہوا مرزائی محلوں میں پہنچ کر شرطی مٹھا (شرطیہ میٹھا) کی آواز لگانے لگا۔ کوئی خریدتا یا نہ خریدتا۔ مرزائیوں نے محسوس کیا کہ ہمارے حضرت صاحب کا مخالف قادیان میں کھلے بندوں دندناتا پھرتا ہے۔ غضب ہو گیا۔ یہاں تو تھانیداروں کو ہماری منشا اور اجازت کے بغیر بازاروں میں چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ اسی غصے میں خلیفہ صاحب کے ایلچی تھانے پہنچے تھانیدار نے حنیف کو بلا بھیجا۔ وہ میرے پاس آیا۔ میں بھی ساتھ چلا گیا۔ تھانیدار نے حنیف کو کہا کہ تم مرزائی محلوں میں کیا لینے جاتے ہو؟ حنیف نے کہا جناب میں کچھ لینے نہیں جاتا بلکہ شرطیہ میٹھے آم دینے جاتا

Marfat.com

ہوں۔تھانیدار نے منع کیا اور کہا کہ مرزائی خفا ہوتے ہیں تم ادھر مت جایا کرو۔ میں نے بھی حنیف کو منع کیا مگر میں نے تھانیدار سے دریافت کیا کہ شاہراہ عام پر حلال روزی کمانے سے کسی غریب کو منع کرنا اس لیے کہ کوئی امیر اس غریب سے ناراض ہے۔ یہ بات انصاف کے بالکل خلاف ہے۔ مسلمان قوم نے اگر حکومت سے یہی مطالبہ کر دیا کہ مرزائیوں نے ختم نبوت کے مسئلے اور عقیدے سے انکار کر کے ہمارے ہادی ہمارے آقا و مولا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے۔ جس سے ہمارے دل زخمی ہوتے ہیں۔ انہیں ہمارے شہروں اور محلوں میں سے گزرنا نہ چاہیے۔ تب حکومت کیا جواب دے گی؟ چھوٹے صاحبزادے کے جسم پر چوٹ آئی تو قیامت بپا ہوگئی۔ مسلمانانِ عالم کے دل مجروح ہوئے تو سرکاری مشین میں کوئی حرکت نہ ہوئی تھانیدار صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا مگر انتظامی معاملے میں وہ اپنی جگہ درست فرما رہے تھے۔ میں خود بھی یہ چاہتا تھا کہ چپقلش نہ ہو مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس واقعے کے بعد مرزائیوں کی اکڑفوں اور کروفر میں بہت کمی آ گئی اور رعب تقریباً رخصت ہو گیا۔ مرزائی عام آدمیوں کی طرح رہنے لگے۔ اس سے پہلے ان کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ حنیف غریب کو چھ ماہ قید کا حکم ہوا وہ جیل پہنچ گیا۔ اسی جیل میں حضرت شاہ صاحب بھی قید بھگت رہے تھے۔ حنیف کچھ دن کے لیے ان کا مشقتی بن گیا۔

مرزائیوں میں انتشار

خلیفہ محمود کے ہاتھوں زخم کھا کر کچھ لوگ میدان میں آ ہی گئے۔ عبدالرحمٰن مصری ان میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ وہ خود بھی بہت بھلے تھے۔ ان کی اولاد بھی تقریباً نیک ہی تھی۔ مصری صاحب کا ایک لڑکا تو ہمارا اچھا خاصا دوست اور عجیب و غریب طبیعت کا نوجوان تھا۔ وہ خلیفہ صاحب کے سخت خلاف تھا۔ ان کے اور بہت سے ساتھی میدان میں نکل آئے۔ خلیفہ صاحب کے حالیوں موالیوں نے ڈرانا اور دھمکانا چاہا۔ احرار نے دشمن کے دشمن کو دوست بنا لیا۔ پراپیگنڈہ ہوتا رہا۔ خلیفہ محمود کی پریشانیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ ہمارے مبلغوں کو دیکھ کر مرزائی حضرات دانت پیس کر رہ جاتے تھے۔ مولانا عنایت اللہ صاحب ان دنوں بڑے زوروں پر تھے۔ وہ بھی مرزا صاحب پر اپنی تقریر میں بڑے ٹھوس اعتراض کر دیتے تھے۔ احرار کے جلسے کھلے میدان میں ہونے لگے۔ نماز عید بھی مرزائیوں کے مقابل ڈٹ کر ادا کی جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ مرزائی تعداد میں ہم سے بہت زیادہ تھے۔ ان کے ہاں دولت کی فراوانی تھی، پراپیگنڈے کے لامحدود وسائل موجود تھے، مگر رونق اور پاکیزہ جذبے کے اعتبار سے کفر پر حق کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب میری گمنامی بھی ختم ہو چکی تھی۔ مجھ پر قادیان میں راہ چلتے

Marfat.com

انگلیاں اٹھنے لگیں۔ گل نور باقاعدہ مجھ سے چپکا ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ عجیب وغریب نوجوان تھا۔ مجھے گل نور کی زبانی معلوم ہوا کہ دربار خلافت مجھ سے بہت خفا ہے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اب قادیان چھوڑ دوں تو بہتر ہے۔ وہ بڑی ترکیب سے مجھے ہراساں کر رہا تھا۔ ایک روز کہنے لگا کل آپ چند دن کے لیے باہر چلے جائیں۔ آپ کا یہاں رہنا درست نہیں۔ میں نے کہا۔ کیوں بھئی آخر کیا بات ہے؟ کوئی بات اس کی زبان پر آ کر رک جاتی تھی۔ گل نور کا بھائی خلیفہ محمود صاحب کی اردل میں تھا۔ وہ محل کے اندر بھی آیا جایا کرتا تھا۔ گل نور کا وہی ذریعۂ معلومات تھا۔ گل نور خود اندرونی حالات سے کما حقہ واقفیت نہ رکھتا تھا۔ وہ مجھ پر سائے کی طرح سوار رہتا مگر اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ مجھے اند رکی ایک آدھ صحیح اطلاع پہنچائے۔ ورنہ اسے اپنا اعتبار اٹھ جانے کا خدشہ تھا۔ مرزائی تو وہ تھا ہی پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ مجھے پریشان کرنے میں سعادت نہ سمجھتا ہو۔ میں نے جب اسے زیادہ کریدنا شروع کیا تو اس نے کہا کہ آپ کے خلاف سازش ہو رہی ہے آپ کو بتا چکا ہوں کہ حضرت (مرزا بشیر الدین) صاحب خفا میں نے کہا کہ میں یہاں اس لیے تو نہیں آیا کہ انہیں خوش دیکھوں اور وہ خفا ہیں تو میرے لیے بہت خوشی اور تسلی کی بات ہے۔ پھر گل نور نے مجھے قادیان کے ظلم وستم اور قتل و غارت کے قصے سنائے۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا میں نے مولانا عنایت اللہ صاحب سے کہا کہ کل جمعے میں خطبہ سے پہلے مجھے بھی خطبہ دینا ہے۔

جمعہ کا دن

جب مجھے معلوم ہوا کہ مرزائیوں کے ارادے اچھے نہیں ہیں تو مجھے بھی مدافعت کی سوجھی۔ جہاں نماز جمعہ ادا کی جاتی تھی مرزائیوں کی ''عبادت گاہ'' اقصیٰ کے بالکل سامنے ہماری مسجد تھی۔ مسجد کا ملحقہ مکان مرزائیوں کا اپنا مکان تھا۔ اس مکان میں خلیفہ صاحب کا شارٹ ہینڈ رپورٹر ہماری مسجد کی تقریروں کے نوٹ لیا کرتا تھا۔ میں نے خطبے سے پہلے تقریر کرتے ہوئے ایک بے جوڑی سی بات کہی۔ میں نے کہا کہ یہ الہامات کی بستی ہے۔ مجھے ایک الہام ہوا ہے وہ سن لیجیے۔ آج کی بات یاد رکھیے گا کہ میری اور خلیفہ صاحب کی زندگی ایک ہی ڈور سے بندھی ہے ادھر میں مارا جاؤں گا۔ اسی وقت یا دو چار منٹ کے وقفے سے مجھے مروانے والے کی موت واقعہ ہوگی۔ اس بے جوڑ جملے کے بعد میں نے اپنی تقریر کے ربط کو درست کر کے بولنا شروع کیا۔ مجھے نماز جمعہ کے بعد بعض دوستوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا بات کہی تھی؟ میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ دوسرے دن مجھے حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے

Marfat.com

بٹالے بلا بھیجا۔ میں جب سٹیشن کی جانب پیدل روانہ ہوا تو دو مرزائی والنٹیر میرے باڈی گارڈ بن گئے۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے مگر میرے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ بٹالے سے واپسی پر میں تانگے میں بیٹھ کر آ رہا تھا تو دو سائیکل سوار (قادیانی) تانگے کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ اس کے بعد کافی عرصہ میری حفاظت ہوتی رہی۔ تب مجھے گل نور کی معنی خیز گفتگو کا یقین آیا۔ اگر گل نور کی اطلاع درست نہ تو میری حفاظت کے کیا معنی تھے۔ اس عرصے میں خلیفہ محمود کے مخالفین کی تعداد بڑھنے لگی۔ طبیعت شکی ہو تو اپنے خیر خواہ بھی مشکوک نظر آتے ہیں۔ مرزائیوں کے بلیک بورڈ پر کئی بے گناہوں کے نام لکھے جانے لگے۔

مرزائیوں کے خطرناک ارادے

میں اپنے مرزائی ہمسایوں سے گہری واقفیت پیدا کرنا چاہتا تھا مگر وہ بنیا قسم کے آدمی تھے۔ سارا دن دکان پر کتر بیونت میں لگے رہتے۔ تب میں نے یہ مناسب سمجھا کہ عورتوں کا کام عورتوں ہی کے سپرد کیا جائے۔ بیوی کو قادیان بلا بھیجا۔ عورتیں کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں آپس میں بہت جلد گھل مل جاتی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں کافی کامیابی ہوئی۔ ہمارے ہاں زنانے جلسے بھی ہونے لگے۔ ہمسایوں سے تو بہت ہی بے تکلفی ہوگئی۔ قادیان کی فضا ہمارے لیے سازگار اور مدمقابل کے لیے کافی خراب ہوگئی اور یوں گل نور کی آمد و رفت ذرا کم ہوگئی۔ وہ مجھے ملتا تو تھا مگر پہلے سے کم۔ کچھ عرصے سے میری حفاظت کرنے والے بھی غائب تھے۔ بظاہر مجھے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوتا تھا مگر ایک ایسا دن آیا جب میں اپنے مکان پر تنہا تھا۔ حتیٰ کہ تبلیغی دفتر میں نہ مولانا عنایت اللہ صاحب تھے نہ کوئی اور مبلغ موجود تھا۔ شام کے وقت میں باہر گھوم پھر کر آیا تو مجھے یہ شام بھی اداس اداس سی معلوم ہوئی۔ عشاء کے بعد سونے کی کوشش کی مگر نیند نہیں آئی۔ میں اوپر بالا خانے میں تھا۔ دس گیارہ بجے کے قریب کمرے سے باہر آیا۔ ہمسایوں کی دیوار کے ساتھ دارالخلا تھا۔ میں پیشاب کرنے باہر نکلنے لگا۔ دیکھا تو آسمان پر گہرے بادل چھا رہے تھے۔ کچھ ترشح بھی ہو رہی تھی۔ مجھے دارالخلا کی دیوار کے پاس ہی جہاں ایک اینٹ نکل جانے سے سوراخ ہو گیا تھا۔ مدھم سی آواز آئی یہ زنانہ آواز تھی۔ آہستہ آہستہ۔ جیسے سرگوشیوں کی دبی ہوئی آواز ہو کوئی لڑکی کہہ رہی تھی۔ مولوی جی! مولوی جی! بھاگ جاؤ مولوی جی۔ جلدی سے بھاگ جاؤ۔ ہمارے مکان میں سات آٹھ آدمیوں کو بٹھا رکھا ہے۔ یہ آدھی رات کو تمہیں مار ڈالیں گے۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ لڑکی نے پھر آواز دی تو میں نے آہستہ سے کہا کہ بیٹی میں نے سن لیا ہے۔ تم جلدی نیچے چلی جاؤ کوئی تمہارے پیچھے نہ آ جائے اور تم کو دیکھ نہ لے۔ بادل گرجنے لگے۔

Marfat.com

میں کمرے میں آ گیا۔ بارش تیز ہوگئی یوں سمجھیے کہ بادل ٹوٹ پڑا۔ چھاجوں مینہ برساتا رہا۔ رات ہونے پر بتدریج جل تھل ہوگیا۔ آنکھ جھپکنے کی مہلت ملی۔ تھوڑی دیر کے لیے دل میں خوف تو پیدا ہوا تھا۔ پھر دل نے کہا کہ جان پیاری تھی تو یہاں آئے ہی کیوں تھے؟ بارش نے زیادہ شدت اختیار کی تو اور تسلی ہوگئی۔ صبح اذان ہوئی تو بپھرے ہوئے بادل بھی نرم پڑ گئے اور بارش بھی کم ہوگئی۔ گلی میں پانی کی نہر چل رہی تھی۔ صبح ہونے پر تصدیق کر لی معاملہ تو واقعی خراب تھا مگر یار لوگ شدید بارش کے تھمنے کا انتظار کرتے رہے کہ صبح ہوگئی۔ میں جس کے بھروسے پر قادیان میں رہتا تھا۔ وہ میرا سب سے بڑا محافظ تھا۔ اس گھر کی دو لڑکیاں مسلمان تھیں میری بیوی کی موجودگی میں وہ تائب ہو چکی تھیں۔ ایمان تو بڑی گھر کی بڑی بی کا بھی ڈانواں ڈول تھا مگر وہ مرزائیت کے خلاف قدم اٹھانے سے ہچکچاتی تھی۔

خوفناک سازش

خلیفہ محمود اور اس کے حالیوں موالیوں نے تنگ آ کر بڑے پیمانے کی سازش کا اہتمام کیا اس سازش میں بڑے قادیانی بزرگوں کا مشورہ شامل تھا۔ قادیان میں سکھوں کی آبادی بھی تھی۔ ایک سکھ ڈاکٹر پرائیویٹ پریکٹشنر بھی موجود تھا۔ ایک دن باہر سے ایک گیانی صاحب تشریف لائے بڑے باوقار آدمی تھے۔ اچھے کپڑوں میں ملبوس۔ بات کرنے کا ڈھنگ بھی نہایت معقول۔ ان حضرت نے قادیان میں ڈیرہ ڈال لیا۔ ہندو اور سکھ دوستوں نے اسے میرا تعارف کرایا تو مجھے گیانی صاحب کی آنکھوں میں سازش کے ڈورے نظر آئے۔ میں نے انہیں ذرا کریدا تو وہ کچھ گھبرا گئے مگر ہوشیار آدمی تھے۔ بہت جلد سنبھل گئے اور مجھے مطمئن کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہوگئے بات ختم ہوگئی مجھے خیال بھی نہیں رہا کہ قادیان میں باہر سے کوئی گیانی صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہ سکھوں ہی میں اٹھتے بیٹھتے اور انہیں سے زیادہ میل جول رکھتے تھے۔

آزمائش کی رات

شام کو نماز مغرب کے فوراً بعد مولانا عنایت اللہ، چودھری امام الدین اور دو تین ذمہ دار اور ہمدرد اصحاب میرے مکان پر آئے۔ بڑے غصے میں آستینیں چڑھی ہوئیں اور بھنویں تنی ہوئیں۔ مولانا اور چودھری امام الدین نے مجھے آتے ہی غصے میں کہا کہ دیکھیے صاحب! اب آپ ہمیں نہ روکیے گا۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ ہمیں ان سکھوں سے آج ہی نبٹنا ہے۔ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں مگر اپنے بزرگوں کی قبریں نہیں اکھڑوا سکتے۔ وہ کھڑے کھڑے مجھ سے بات کر رہے تھے۔ میں

Marfat.com

نے انہیں بیٹھ کر آرام سے بات کرنے کے لیے کہا۔ میں ان کی گفتگو سن کر سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ شام کے وقت باہر سے آئے ہوئے سکھوں نے مسلمانوں کی قبریں کھود کر مردوں کی ہڈیاں باہر بکھیر دیں۔ وہ واپس ہو رہے تھے کہ دور سے کسی مسلمان نے انہیں دیکھا۔ جو ادھر سے گزر کر آ رہا تھا۔ یہ اطلاع خاص اہتمام سے مولانا تک پہنچائی گئی۔ چودھری امام دین وغیرہ کو ہمراہ لے کر مولانا عنایت اللہ قبرستان پہنچے تو واقعہ سچ اور اطلاع درست پائی۔ امام الدین غصے میں آ گیا۔ وہ جرنیلی طبیعت کا بہادر انسان تھا۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ وہ قادیان کے سکھوں سے بھڑ نہیں گیا۔ مولانا کو ہمراہ لے کر میرے پاس پہنچا۔ کسی اور کو اس حادثہ کی اطلاع نہ تھی میں اس خبر وحشت انگیز پر بہت ہی پریشان ہوا۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس حیرانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ یہ حضرات پھر بولے اور کہنے لگے آپ کی سیاست کی وجہ سے ہم خاموش نہیں رہ سکتے۔ ہم آج اس قصے کو ختم کر کے چھوڑیں گے۔

میں نے اپنے لیے ایسے موقعوں پر ایک خاص ڈھب پر چلنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ جب اس طرح جذبات برانگیختہ ہوں تو جذبات کی رو کو فوراً روکنے کا فیصلہ کرنے سے نقصان ہوتا ہے۔ برانگیختہ جذبات دل و دماغ کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ صحیح مشورہ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے ان حضرات سے کہا کہ واقعی یہ ذلت تو ناقابل برداشت ہے۔ اس کا تو ابھی فیصلہ کر لینا چاہیے آپ ذرا تشریف رکھیں۔ تاکہ بدلہ لینے کا مناسب اور کامیاب پروگرام بنا لیا جائے۔ میرے رفیق مطمئن ہو کر بیٹھ گئے باتیں ہوتی رہیں۔ میں مصنوعی غصے میں تیزی دکھا کر انہیں کسی قدر ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخری فیصلہ یہ ہوا کہ جو سکھ باہر بٹالہ گئے ہوئے ہیں۔ وہ رات کو ساڑھے آٹھ نو بجے گھر پہنچیں گے۔ انہیں بھی آنے دیا جائے تاکہ کوئی باہر نہ رہ جائے۔ ان سے فیصلہ کن جنگ صبح کو لڑی جائے گی۔ سب آمادہ ہو گئے۔ میں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس قصے میں کوئی سازش کارفرما نہ ہو۔ کہیں ہم غلطی نہ کر بیٹھیں۔ سب نے کہا۔ نہیں صاحب سکھوں نے یہ نامعقول حرکت کی ہے۔ سازش وغیرہ کچھ نہیں۔ میں نے انہیں۔ (جب وہ گھر واپس جانے لگے) سمجھایا کہ رات خاموشی سے گزرائیے اور صبح اکٹھے ہو کر میرے پاس چلے آئیے۔ تاکہ جو کچھ ہو مشورے سے ہو۔ وہ سب چلے گئے۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ یا الٰہی یہ کیا مصیبت آ گئی مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ بڑی گہری اور کامیاب سازش معلوم ہوتی ہے۔ دعائیں مانگتا رہا اور پروردگار کے حضور میں التجائیں کرتا رہا کہ تو ہی اس مصیبت کے وقت سیدھا راستہ دکھا سکتا ہے ہم عاجز بندے بالکل بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں صبح نماز کے بعد دعائیں مانگتا رہا کہ غیبی امداد ہی نجات دلا سکتی ہے۔ عقل عاجز آ چکی ہے۔ میں فارغ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ مولانا عنایت اللہ صاحب

Marfat.com

ہانپتے کانپتے آئے اور کہنے لگے کہ غضب ہوگیا تھا۔ اللہ نے بچالیا۔ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ہمیں بروقت گمراہی سے بچالیا۔ ماسٹر صاحب ہم بڑی گہری سازش کا شکار ہونے لگے تھے۔ مجھے تسلی ہوگئی اور میں نے بے تابی سے دریافت کیا کہ بتایئے مولانا کیا قصہ ہوا؟

خطرناک کہانی

مولانا عنایت اللہ اذان سے قبل رفع حاجت کے لیے دور کھیتوں میں نکل جایا کرتے تھے۔ وہاں سے واپسی کے لیے دو رستے تھے۔ ایک قبرستان کی جانب سے اور دوسرا اوپر سے یعنی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ۔ چونکہ قبرستان کا واقعہ مولانا کے دل و دماغ پر سوار تھا۔ وہ قبرستان کے راستے سے گھر واپس آرہے تھے۔ ابھی اندھیرا تھا کہ مولانا کو قبرستان میں دور دو تین آدمی نظر آئے۔ وہ دبے پاؤں درختوں کی آڑ میں وہاں پہنچے تو دیکھا کہ گیانی صاحب اور دو مرزائی نوجوان ہیں۔ مولانا درختوں کی اوٹ میں اور آگے بڑھے ان تینوں میں آہستہ آہستہ گفتگو ہو رہی تھی۔ پھر وہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے الجھے گیانی صاحب فرماتے تھے کہ لائیے۔ بقایا رقم دلوائیے۔ مرزائی کہتے تھے کہ کام تو مکمل نہیں ہوا جو دیا ہے اسی پر صبر کیجیے۔ گیانی صاحب نے فرمایا کہ میں اپنا کام کر چکا ہوں سامنے سکھوں کے گاؤں ہیں۔ اپنے آدمیوں کو تیار بٹھا کر آیا ہوں۔ قادیان کے مسلمان ہی کم بخت میدان میں نہ اتریں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مولانا دبے پاؤں واپس آئے اور مسجد سے فارغ ہو کر سیدھے میرے پاس پہنچے اور مجھے یہ ساری داستان سنائی۔ تب میں نے مولانا سے عرض کیا کہ حضور والا کیا ہوتا اگر میں بھی جذبات کی رو میں بہہ جاتا۔ الحمد اللہ کہ ہم کو خدا نے کڑی آزمائش اور گہری سازش سے بچالیا۔ اگر قادیان میں سکھ مسلم فساد ہو جاتا تو ہندوستان کے کونے کونے میں یہ آگ پھیل جاتی اور مرزائیت دامن بچا کر صاف نکل جاتی۔

میں نے اس واقعے کے بعد چودھری افضل حق صاحب مرحوم کی خدمت میں لاہور ایک خط لکھا اور عرض کیا کہ قادیان میں سکھ مسلم فساد کی طرح ڈالی جا رہی تھی۔ اللہ نے بچالیا۔ خبردار رہیے گا۔ برطانوی شاطر سکھ مسلم فساد کا بیج بو رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں کی ناکامی کے بعد کسی اور جگہ یہی گل کھلایا جائے گا۔ یہ واقعہ مسجد شہید گنج کے حادثے سے کچھ دنوں پہلے قادیان میں ہوا تھا۔

ہمارا کام اور تیزی پکڑ گیا

گیانی صاحب تو دوسرے ہی دن نو دو گیارہ ہو گئے۔ ہمارے لیے میدان زیادہ ہموار ہو گیا۔ باہر

Marfat.com

حضرت شاہ صاحب اور مجلس احرار کے دوسرے رہنماؤں نے جلسوں، کانفرنسوں اور تقریروں سے مرزائیت کا پوسٹ مارٹم کر دیا۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی صاحب کا تاریخی بکس ہر جلسے میں موجود رہتا تھا۔ وہ مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب اور مرزائی لٹریچر کے فریب کا پردہ چاک کر رہے تھے۔ مولانا لال حسین اختر اور مولانا محمد حیات نے بھرے جلسوں میں بار بار مرزائی مبلغوں کو مناظرے کے لیے للکارا۔ مرزائیت دبک کر رہ گئی مگر برطانوی امداد سے مرزائیت کے پاؤں سرکاری دفاتر میں جم گئے۔ کلیدی آسامیوں پر مرزائیت کے اڈے پختہ ہو گئے۔ ادھر مرزا محمود تو گھر چکے تھے مگر سر ظفر اللہ کا طوطی بولنے لگا۔ یہ گوشہ احرار کی دسترس سے باہر تھا عوام محفوظ ہو گئے مگر خواص کو مرزائیت کے افعی نے ڈسنا شروع کر دیا۔ یہ کام بڑی احتیاط اور رازدارانہ انداز میں جاری رہا۔ خلیفہ محمود کا گرد و پیش خراب ہو گیا وہ گھبرا کر محفوظ پہاڑ کی چوٹی تلاش کرنے لگا۔

نئی سازش

گل نور کو مجھ پر زیادہ اعتبار جمانے کے لیے اندر کی خبریں بتانے کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ ایک روز اس نے بتایا کہ کوئی سرکاری افسر موٹر میں آ کر واپس ہوا ہے۔ یہ کوئی بڑا افسر تھا۔ جو لاہور سے قادیان آیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر پتا لیا تو بات کی تصدیق ہو گئی۔ کچھ دن بعد لاہور سے ہمارا ایک مخالف لیڈر قادیان پہنچا۔ وہ بھی قصرِ خلافت کی سیر اور مرزا صاحب کی زیارت سے فیض یاب ہو کر واپس ہو گیا۔ اس خبر کی تصدیق ہو گئی مگر میں ان خبروں میں زیادہ دلچسپی نہ لیتا تھا۔

مسجد شہید گنج کا حادثہ

اچانک خبر ملی کہ سکھوں نے لاہور میں مسجد شہید گنج کو گرا دیا ہے۔ پنجاب میں آگ لگ گئی ہے۔ میں دوڑا دوڑا لاہور آیا۔ حالات خراب ہو چکے تھے۔ احرار کے قائدین شہید گنج کی الجھن میں پھنسا دیئے گئے۔ مجلس احرار جس کا پنجاب میں طوطی بولتا تھا۔ کڑی آزمائش سے دوچار تھی ہمارے بہادر اور نیک دل رہنماؤں نے ناسازگار حالات کا جرأت اور مردانگی سے مقابلہ کیا مگر قادیان کی تقدیر کا پانسہ پلٹ گیا۔ پہلے ہم نے انہیں دبا رکھا تھا۔ پھر انہوں نے ہمیں رگیدنا شروع کیا۔ لاہور اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں احرار کے خلاف جو قد آدم پوسٹر چسپاں ہوتے تھے۔ میں نے قادیان کے ریلوے اسٹیشن سے مختلف شہروں کو بک ہوتے دیکھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ خطرناک کھیل کیسے کھیلا جا رہا ہے۔ میرا روزانہ کا یہ کام تھا کہ کس ترکیب سے ان بلٹیوں کے نمبر محفوظ کروں جن بلٹیوں کے ذریعے یہ

Marfat.com

پوسٹر قادیان سے بُک ہوتے تھے۔ میں مسجد شہید گنج کی تباہی اور مسلمانوں کی آپس میں سر پھٹول کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ گڑے مردے اکھیڑے جائیں۔ میری ڈیوٹی ہی مرزائیت کے خلاف قادیان تک محدود تھی۔ غرض یہ کہ اس سازش سے احرار کے خلاف خوفناک آندھی اٹھی جو احرار کی ہر دلعزیزی وقار اور محبوبیت کی چادر اُڑا کر لے گئی۔ آندھی گزر گئی تو لوگوں نے آنکھیں مل مل کر دیکھنا شروع کیا۔ وہ آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ مسجد آج بھی نوحہ کناں ہے۔ شاید اب مسلمان سمجھ سکیں کہ مسجد شہید گنج کیا کہتی ہے۔ ایک دل گداز واقعہ، عبرت انگیز سانحہ، برطانوی سیاست کا ایک شاہکار جو سیاست کا رخ بدل کر چلتا بنا۔ فاعتبر ویا اولو الابصار۔

جیتی ہوئی بازی ہار جائے تو دل ٹوٹ جاتا ہے، حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ مگر احرار تو خدا جانے کس مٹی کے بنے ہیں؟ بیگانوں نے زخمی کیا، اپنوں نے مارا، چلنے پھرنے کی راہیں ناہموار ہو گئیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں مگر چلتے رہے۔ اس قافلے نے تھک ہار کر بیٹھ جانے والوں کو مڑ کر نہیں دیکھا۔ تیز نہ چلا جا سکا تو رک رک کر چلتے رہے۔ اندازہ تو لگائیے یہاں مخالف کے سینے پر چڑھے بیٹھے تھے کہاں مخالف نے موقع پا کر خود بھی بھرپور وار کیا اور لطف یہ ہے کہ اپنوں سے بھی پٹوایا۔ بہر حال یہ نہیں کہ رُک گئے چلتے رہے مگر منزل احرار کے لیے بڑی ہی کٹھن تھی۔ وقت گزر گیا۔ تا آنکہ پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ آبادیوں کا جبری تبادلہ ہوا تو قادیانی مسلمانوں پر دوہری مصیبت آئی۔ مولانا محمد حیات صاحب ان دنوں قادیان میں امیر جماعت کی حیثیت سے قیام فرما تھے۔ مرزائیوں کی بن آئی انہیں تو سر ظفر اللہ کے بھیجے ہوئے ہوائی جہاز بھی قادیان پر پرواز کر کے حوصلہ اور سہارا دیتے رہے باہر سے مسلمانوں کے لیے جو لاریاں اور ٹرک آئے تو وہ بھی مرزائیوں ہی نے سنبھال لیے۔ خلیفہ صاحب تو برقعہ اوڑھ کر زنانہ سواریوں کے ہمراہ چل دیئے۔ غریب عقیدت مندوں کی وہاں بھی درگت ہوئی۔ بہر حال مرزائیوں کا ''کعبہ'' اپنی جگہ قائم رہا۔ خلیفہ صاحب کو ولایت واپس جانے سے قبل انگریز گورنر نے دوسرا ''کعبہ (چناب نگر)'' اس سے بھی زیادہ محفوظ عطا کر دیا۔

پاکستان میں تحریک تحفظ ختم نبوّت

قادیان کی سرگذشت لکھتے وقت بعض اہم گوشے سہواً نظر انداز ہو گئے۔ مجلس احرار کو قادیان میں مستقل طور پر قدم جمانے میں جس بزرگ اور قابل احترام ہستی نے ہمارا ساتھ دیا۔ مجھے سب سے پہلے ان کا ذکر کرنا چاہیے تھا۔

Marfat.com

پیر شاہ چراغ رحمتہ اللہ علیہ

قادیان کے مسلمانوں کو مرزائیت سے محفوظ رکھنے کے لیے مخدوم و محترم پیر چراغ شاہ صاحب نے نہایت دانشمندی اور تدبیر سے کام کیا۔ قادیان میں پیر صاحب کی اپنی جائیداد موجود تھی۔ مرزائیوں کے باغ کے بالکل متصل آبادی کے ایک کونے پر پیر صاحب موصوف کا چھوٹا سا باغ بھی تھا۔ پیر صاحب نے مرزائیوں سے بگاڑ پیدا نہ کیا بلکہ بڑی احتیاط سے لڑائی جھگڑے یا بحث مباحثے کے بغیر پیر صاحب مسلمانوں کو پیار و محبت اور حُسنِ اخلاق سے اپنے گرد جمع رکھتے تھے۔ پیر صاحب حکمت بھی کرتے تھے۔ دور دراز کے دیہات سے لوگ علاج معالجے کی خاطر پیر صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔ قادیان کی بستی میں ارائیں برادری اور کمہار برادری کے اکثر لوگ ان کے معتقد اور مرید تھے۔ پیر صاحب کے معتقدین نے دل و جان سے احرار کا ساتھ دیا۔ احرار نے قادیان میں جو زمین خریدی پیر صاحب اس کے ٹرسٹی بھی تھے۔

ابتداء میں جب قادیان میں مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی تو مولوی علی محمد صاحب جو شیخ برادری کے معزز رکن تھے۔ مجلس احرار قادیان کے صدر بنے۔ آپ نے آخر تک مجلس احرار سے ہمدردی کا ثبوت دیا۔ آج کل مولوی علی محمد صاحب لائل پور (فیصل آباد) میں قیام فرما ہیں۔ (۱) ایک شریف نوجوان فیض اللہ صاحب قادیان کے زرگر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس بہادر نوجوان نے بڑی جرأت سے احرار کا ساتھ دیا اور مخلصانہ خدمت کی۔ آج کل فیض اللہ صاحب غالباً چنیوٹ میں قیام فرما ہیں باہمت نوجوان ہیں۔ میں نے سنا کہ وہ چنیوٹ میونسپلٹی کے میونسپل کمشنر بھی ہیں (۲) میاں لطیف الرحمٰن صاحب مجلس احرار قادیان کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ چودھری محمد طفیل صاحب مجلس احرار قادیان کے آفس سیکرٹری تھے۔ مجھے اس وقت یہی چند نام یاد تھے۔ کافی مدت گزر چکی۔ حالات بالکل بدل گئے۔ نہ قادیان رہی اور نہ قادیان والے ہی رہے۔ عرصے کی بات ہے۔ حافظے میں جو کچھ محفوظ تھا نوک قلم پر آ گیا۔ ہمارے دل میں قادیان کے مسلمانوں کے لیے اس لیے بھی عزت و توقیر تھی کہ وہ کفر کے دہانے پر اپنے ایمانوں کو مضبوطی سے سنبھالے بیٹھے تھے۔ غریب تو تھے مگر دولت ایمان سے مالا مال تھے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے سبھی مخلص تھے۔ مجلس احرار سے ان سب کو بے پناہ عقیدت تھی۔

---

(۱) اب وفات پا چکے ہیں۔ (۲) یہ بھی اب اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔

Marfat.com

تحریک تحفظ ختم نبوت، پاکستان میں

کفر کا پودا جس نے برطانوی اقتدار کے سائے میں پرورش پائی تھی۔ برطانوی استعمار کی موجودگی میں کیونکر مرجھا جاتا؟ تاہم ناسازگار حالات میں مجلس احرار نے ردِّ مرزائیت کے محاذ پر بے جگری سے جنگ لڑی۔ جب بھی مجلس کو موقع ملا۔ مرزائیت کے قلعے پر پُرامن یلغار کی مگر ہر بار یہی ہوا کہ برطانوی استعمار رکاوٹ بن کر سامنے آیا۔ مجلس احرار کو مرزائیت کی بجائے برطانوی استعمار سے ٹکرانا پڑا۔ ہر بار احرار ہی کو لہولہان کر دیا گیا۔ احرار کی جدوجہد سے مسلمانوں میں بیداری اور مرزائیت کے خلاف جذبہ تو پیدا ہوا مگر حکومت کے سہارے مرزائیت کی تبلیغ کے لیے دوسری راہیں نکل آتیں۔ عوام کی بجائے مرزائیت نے سرکاری دفاتر کا رخ کیا اور مسلمانوں کی دکھتی ہوئی رگ کو جا پکڑا۔ سر ظفر اللہ جب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بنے تو انہوں نے اونچے درجے کے مسلمان ملازمین پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ سر ظفر اللہ کی تبلیغ کا ڈھنگ بہت موثر تھا اس نے براہ راست ایمان پر حملہ نہیں کیا بلکہ بہت اچھوتی ترکیب سے مسلمان ماتحتوں کو ہموار کیا۔ اس نے مرزائیوں کو اپنے اثر ورسوخ سے ترقیاں دلوائیں۔ یہ ترقیاں بڑی حیرت انگیز تھیں۔ ترقی یافتہ مرزائیوں نے سر ظفر اللہ کی نوازشات کے گیت گائے۔ دوسرے مسلمان سرکاری ملازمین ان ترقیوں کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔ شکایت بے کار تھی۔ وہ مسلمان جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اپنے ماتحت مسلمانوں کی دستگیری نہ کرتے تھے ادھر مرزائیوں کے ہاں نقشہ بالکل الٹ تھا۔ مرزائی سرکاری ملازمین نے سر ظفر اللہ کی قصیدہ خوانی کے ساتھ ساتھ مسلمان ملازمین کو بہکانا پھسلانا شروع کیا ایک آدھ مسلمان کا ہاتھ پکڑا اور اسے بام ترقی پر پہنچا دیا۔ بعض کی سفارش کی اور ملازمت دلوا دی۔ اس طرح مسلمانوں ہی میں مرزائیت کے مبلغ پیدا کر لیے جب یہ کام بڑی تیز رفتاری سے ہونے لگا اور یہ روح فرسا خبریں احرار کے کیمپ تک پہنچیں احرار نے پیچ وتاب کھایا مگر وہ اس معاملے میں بے بس تھے۔ بڑے بڑے عہدے دار مسلمان احرار کی باتوں پر بہت کم متوجہ ہوتے تھے جو لوگ متوجہ ہوئے انہیں ظفر اللہ کی طرح حوصلے سے میدان میں اترنے کی جرأت نہ ہوئی ہر مسلمان سر ظفر اللہ کے عقیدے پر بیزاری اور نفرت کا اظہار کر سکتا ہے مگر جہاں تک مرزائیت کی تبلیغ کا تعلق ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ سر ظفر اللہ نے بڑی جرأت سے کام کیا۔ وہ اس میدان کے بہت بہادر مبلغ ہیں۔ اس قسم کی جرأت مرزا محمود میں بھی نہیں ہے۔ وہ بھی کسی نازک جگہ پھنس جائیں تو مصلحت کوشی سے دائیں بائیں جھانکنے لگتے ہیں مگر یہ بات سر

Marfat.com

ظفر اللہ میں بالکل نہیں ہے۔ وہ بے دریغ طبیعت کے انسان ہیں چنانچہ ریلوے ممبر کی حیثیت سے جب انہوں نے مواصلات کا کام سنبھالا تو مرزائیوں کے لیے بڑی اور چھوٹی سبھی قسم کی ملازمتوں کے دروازے کھل گئے۔ سر ظفر اللہ نے اثر ورسوخ سے بے پناہ کام کیا۔ مرزائیوں کو جگہ جگہ نوکر کرایا اور اس قدر ترقیاں دلوائیں کہ آج ریلوے کے اونچے عہدوں پر آپ کو اکثر مرزائی نظر آئیں گے۔ یہ بھی ہوا کہ بعض مسلمان افسر بھی محض سر ظفر اللہ کو خوش رکھنے کے لیے مرزا محمود کو حضرت صاحب کہہ کر ایمان ''تازہ'' کرنے لگے اور بعض ایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

احرار کیا کرتے؟

مرزائی افسروں کا یہ حال کہ وہ تو خم ٹھونک کر میدان میں اُتر آتے مگر اپنے مسلمان افسر دین سے تعلق، نہ تبلیغ دین سے ہمدری، جب کبھی دین کی حفاظت کی بات آئی تو بزدلی سے طرح دے جائیں۔ تب احرار کے لیے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا کہ وہ اس بے بسی کے عالم میں جہاں بھی انہیں معلوم ہو کہ کسی مسلمان ملازم کا ایمان تذبذب اور آزمائش میں ہے۔ وہاں اپنے مبلغوں کو بھیجیں اور انہیں ہدایت کر دیں کہ احتیاط سے کام کرو مرزائیت کے لٹریچر کا جواب دو۔ ان کے مبلغوں کو للکارو اور مرزائیت کے جال میں پھنسنے والوں کو حتی الوسع بچانے کی کوشش کرو۔ ہزار دشواریوں کے باوجود ہمارے مخلص مبلغوں کو بسا اوقات حیرت انگیز کامیابی بھی ہوئی۔ قاضی احسان احمد صاحب نے ایسے مشکل مرحلوں میں بڑی ہمت سے کام لیا اور بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا انہیں بڑے آدمیوں سے باتیں کرنے اور اپنی صحیح بات ذہن نشین کروا دینے کا ڈھنگ آتا ہے مگر مرزائیت کی سرکاری فوج یعنی سرکاری مرزائی ملازمین کے مقابلے میں جو کہ دفتروں پر خوبصورتی سے قبضہ کر چکے تھے۔ ہمارے پاس اتنے مبلغ نہ تھے کہ وہ ہر شہر میں مستقل اڈا جما کر بیٹھیں اور دفتروں میں مرزائیت کی ریشہ دوانیوں کا سدباب کریں۔ اِدھر انگریز کی سلطنت مرزائیت کا عروج اور ادھر احرار کی بے بسی اور قدم قدم پر مشکلات کا سامنا، ان نامساعد حالات میں ہر مبلغ اور احرار کے ہر کارکن اور رہنما کے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ خدایا ایک بار برطانوی سائے کو سر سے ہٹا اور پھر ہمیں توفیق دے کہ ہم مرزائیت کے جال کو تار تار کر سکیں۔ دعا قبول ہوئی۔ برطانیہ چلا تو گیا مگر اپنے خود کاشتہ پودے کی جڑیں اس قدر مضبوط کر گیا کہ دنیا حیرت میں رہ گئی۔

Marfat.com

پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر

پاکستان کے ابتدائی حالات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مسلمانانِ پنجاب اپنے ہی خون میں نہا کر جس طرح پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہوئے۔ اس خونچکاں داستان کو دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ غافل قوم کو معلوم تو ہو کہ جب زخمی اور مجروح دل مہاجر واہگہ پار کر کے پاکستان میں روزانہ ہزارہا کی تعداد میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ جس حال میں تھے اور جو اُن پر گزری تھی۔ اس صورت حال سے دشمن بھی ترس کھانے پر مجبور تھا مگر ان مہاجروں پر مرزائی کیا کرتے تھے؟ مجھے خدا توفیق دے کہ میں تفصیلاً بیان کر سکوں کہ ان مرزائیوں نے مسلمانوں کو انتہائی پریشانیوں میں مبتلا کر کے کس طرح اپنے ہاتھ رنگے اور مرزائی افسران نے کارخانوں، دکانوں، ملوں، کوٹھیوں اور مکانوں پر مرزائیوں کا کس طرح قبضہ کرایا؟

حکومت کی پریشانی

نیا ملک، نئے حاکم، نئی رعایا، حالات کی ناسازگاری حکمرانوں کی ناتجربہ کاری، اس پر مستزاد یہ کہ روزانہ ہزاروں مسلمانوں کے قافلے پاکستان کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ قافلے اپنے ساتھ دردناک داستانیں لے کر آ رہے تھے۔ بھائی کہتا تھا کہ میری جوان بہن کو کافر اٹھا کر لے گئے۔ ماں، بیٹی کی عصمت لٹ جانے کا حال سنا رہی تھی۔ یتیم بچے ماں باپ کے مارے جانے کا ہولناک واقعہ بتا کر ہچکیاں لے رہے ہیں۔ جوان بیوائیں خاوند کے شہید ہو جانے پر نالاں ہیں۔ بوڑھے والدین اکلوتے بیٹوں کی دردناک موت پر آنسو بہا رہے ہیں۔ ڈرے اور سہمے ہوئے مسلمانوں نے گروہ در گروہ جب خالی ہاتھ پاکستانی شہروں کا رخ کیا تو حکومت کی نئی مشینری ان قافلوں کو سنبھال نہ سکی۔ ان تباہ حال لوگوں نے سڑکوں کے کنارے اور میدانوں میں ڈیرے ڈال لیے۔ اس بدحالی میں سینکڑوں مہاجر مرنے لگے۔ وہ جس راہ سے گزرتے، مرنے والوں کی قبریں بنا کر راہ گزر کی نشاندہی کا غمگین اشارہ چھوڑ جاتے۔ ان روح فرسا حالات میں اُمتِ مرزائیہ نے دوسرے طریقے پر سوچنا شروع کیا۔ باقاعدہ سکیم بنا کر مرزائی لیڈروں اور مرزائی افسروں نے اس ہنگامی دور سے فائدہ اٹھایا۔ سر ظفر اللہ خان وزارت خارجہ کے عہدہ جلیلہ پر فائز المرام تھے۔ خلیفہ محمود نے انگریز گورنر سے کہا کہ جاتے ہو تو ہمیں مستقل اڈا بنا کر دے جاؤ۔ ازلی اور ابدی بہی خواہوں کو سہارا دو۔ گورنر نے ربوہ (چناب نگر) کا محفوظ مقام اُمتِ مرزائیہ کے لیے کوڑیوں کے دام میں یعنی برائے نام قیمت پر فروخت کر ڈالا۔

Marfat.com

چنیوٹ جوربوہ سے بالکل قریب صرف دو تین میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ وہاں کا ایریا مرزائیوں کے لیے مختص کر کے مقامی افسران کو ہدایت ہوئی۔ یہاں صرف احمدی آباد کیے جائیں گے۔ غرض یہ کہ جہاں بھی بس چلا۔ مرزائیوں نے قبضہ جمالیا۔ مسلمان قوم اپنے زخموں پر پٹیاں باندھنے میں مصروف تھی مگر یہ مرزائی ماڈل ٹاؤن لاہور سے لے کر کراچی کے ساحل تک بلندیوں پر آشیانے بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ملوں اور کارخانوں میں معمولی حیثیت کے مرزائی کو حصہ دار بنا دیا گیا۔ کچے مکانوں کے مالک کوٹھیوں میں جا بسے اس لیے کہ وہ مرزائی تھے مگر بعض مستحق مسلمان مہاجر آج بھی طویل مدت گزر جانے کے بعد سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ مقامی مرزائیوں نے زمینوں اور مکانوں پر قبضہ کر لیا۔ سر ظفر اللہ کے رشتہ داروں نے مقامی مہاجر زمینوں پر ناجائز قبضہ جمایا۔ آج بھی ڈسکہ شہر میں کہیں نہ کہیں مقامی مرزائیوں کا قبضہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی بیسوں مثالیں مل سکتی ہیں کہ ایک مرزائی مہاجر نے مختلف شہروں میں الاٹ منٹس کرالیں، تحقیقات کریں تو مرزائیوں کی لوٹ مار کا پتہ چلے۔ تحقیقات کون کرے جو ذمہ دار لوگ ہیں۔ وہ اقتدارِ جنگ میں مصروف ہیں انہیں فرصت نہیں۔ عوام کو کچھ معلوم ہے مگر وہ بیچارے بے بس ہیں۔

متروکہ جائیداد کی تقسیم میں ربوہ کی سفارشیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ بڑا افسر اگر مسلمان ہے اور ماتحت مرزائی تو سمجھیے کہ مرزائی ہی کی حکومت ہے۔ ہمارے مسلمان افسر الا ماشاء اللہ اس ذہن سے کبھی سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان میں عصبیت نام کو نہیں۔ مرزائی اور مسلمان متروکہ جائیداد کے حصول میں الجھتے تو مرزائی اس میں کامیاب ہو جاتا کہ اس کی پہنچ اور رسائی مضبوط جو تھی۔ ہم ایسے مرزائیوں کو جانتے ہیں جو چھوٹے سے مکان کے مالک تھے مگر آج وہ بہت بڑی مل کے حصہ دار ہیں۔ اُدھر مال متروکہ پر یوں ہاتھ مارا اِدھر ہندوستان آنے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی پاکستان اور قادیان کے ڈانڈے ملا لیے۔ حکومت پاکستان اس لیے خاموش تماشائی بن کر رہ گئی کہ کیبنٹ میں سر ظفر اللہ خان کا طوطی بولتا تھا۔ کسی میں جرأت نہ تھی کہ مرزائیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔

واقعات کی رفتار

پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر مرزائیوں کی بن آئی یعنی پاکستان کیا بنا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مسلمان مہاجر کی امنگیں اور آرزوئیں خوابِ پریشان بن کر رہ گئیں۔ مرزائی پاکستان پر چھا گئے۔ ادھر یہ صورت حال اُدھر احرار مصیبت کے منہ آ گئے۔ احرار کے خلاف مرزائیوں نے پراپیگنڈہ کیا۔ لیگیوں کو اکسایا، عوام طعنہ زنی پر اتر آئے۔ حتیٰ کہ سنجیدہ طبقے کے لیگی بھی احرار سے کہتے سنے گئے

Marfat.com

کہ یہ لوگ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟ مرزائیوں کے بہکانے سے عوام نے فرسودہ اور بے بنیاد قصے دہرائے۔ ہندوؤں کے غلام، بھارت کے ایجنٹ، اسلام کے دشمن، جانے کن کن خطابات سے نوازا گیا۔ جب یہ طعنہ زنی ہو رہی تھی۔ میں اُس وقت خوش قسمتی یا بدقسمتی سے پاکستان میں موجود نہ تھا بلکہ بھارت میں ڈیرہ لگائے اور دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں لدھیانہ میں ''پناہ گیروں'' کے کیمپ کا انچارج تھا۔ مجھے تین ماہ نامساعد حالات میں تباہ حال مہاجرین کے ساتھ ٹھہرنے اور خدمت کرنے کا موقع ملا کیونکہ مسلم لیگ کے رہنما قوم کو اس کے حال پر چھوڑ کر پاکستان چلے آئے تھے تاکہ مال متروکہ کی ''صحیح فہرست'' تیار کر سکیں تین ماہ بعد جب میرا کیمپ خالی ہو گیا۔ تب مجھے پاکستان پہنچنے کا موقع ملا۔ یہاں پہنچا تو دیکھا کہ مسلم لیگی بھائی مست و سرشار ہو کر ''اردو'' بول رہے ہیں مگر ان بھائیوں نے میرا کچھ لحاظ کیا۔ جس کا مجھے آج بھی صدمہ ہے۔ اپنے عزیز ساتھیوں اور بزرگوں کے ہمراہ مسلم لیگ کے طعنوں میں برابر کا شریک ہونا چاہتا تھا مگر اپنے بھائیوں کے طعنوں سے محروم رہا۔ بہر حال احرار کو پاکستان میں چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ احرار نے صبر سے وقت گزارا وہ زیادہ پریشان اس لیے تھے کہ مرزائیت کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں اور مرزا محمود نے قادیان کی بجائے ربوہ (چناب نگر) کے قلعے کو زیادہ مضبوط کر لیا ہے۔ احرار کو یہ بھی معلوم ہوا کہ آزاد کشمیر میں بھی مرزائیوں کو کلیدی آسامیوں پر بٹھا دیا گیا ہے۔ احرار آنکھوں کے سامنے ملک و ملت کی تباہی کو دیکھ رہے تھے مگر حالات کی ناسازگاری اور جذباتی قوم کی بے رخی کی وجہ سے خاموشی کے سوا چارہ نہ تھا۔

تازیانہ

میں آپ بیتی لکھ رہا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں برسر اقتدار آ کر مرزائیوں کے دماغ کس طرح عرش پر پہنچ گئے تھے۔ ایک روز میں مرکزی دفتر احرار لاہور کے برآمدے میں کھڑا تھا کہ چند مرزائی نوجوان سامنے سڑک سے گزرے جونہی دفتر کی جانب دیکھا اور مجھے برآمدے میں مجلس احرار کے بورڈ کے قریب کھڑا پایا۔ مرزائی نوجوان رُک گئے۔ میری جانب دیکھا۔ پھر بورڈ پر نگاہ ڈالی۔ ان میں سے ایک نے بڑے غرور اور تمکنت سے کہا۔ ''اوہو، مجلس احرار ابھی تک زندہ ہے۔'' پھر بلند آواز سے کہا۔ ''بہت اچھا۔'' مرزائی نوجوان چلے گئے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میرے دل پر مرزائی نوجوانوں کے اس غرور، تمکنت اور توہین آمیز لہجے نے کیا اثر کیا۔ میرے جذبات کو سخت ٹھیس لگی۔ دماغ کھولنے لگا۔ میں کافی دیر برآمدے ہی میں کھڑا سوچتا رہا کہ یہ پاکستان تو مسلمانوں نے اپنے لیے بنایا تھا لیکن یہاں تو مرزائیوں کا راج ہوتا جا رہا ہے۔ مرزا محمود بڑے ہوشیار آدمی ہیں۔ اگر مہلت مل گئی تو وہ

Marfat.com

پاکستان پر مکمل قبضہ جمالیں گے ان مسلمانوں کو کس طرح سمجھایا جائے کہ وہ مرزائیت کے جال سے بچیں۔ان دنوں احرار کو ایسے خطرناک طریقے پر بدنام کیا گیا کہ قوم کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔ان حالات میں مرزائیت کے خلاف بات کرنا فائدے کی بجائے نقصان کا باعث تھا مگر احرار کے لیے یہ بھی مشکل تھا کہ وہ بے خبر قافلے کو گہرے کنویں کی طرف قدم بڑھاتا دیکھیں اور خاموش رہیں۔یہ ان کی مجرمانہ خاموشی تھی۔جسے احرار اچھا نہ سمجھتے تھے۔

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی

مجلس احرار کے اراکین عہدہ داریوں کی الجھن میں کبھی نہیں الجھے، جس رفیق کو جس عہدے پر بٹھا دیا وہی کام کرتا رہا۔باقی دوست ہاتھ بٹاتے رہے۔اعتماد کا یہ حال کہ ایک نے دوسرے کو کبھی یہ نہ پوچھا کہ تمہارا کس سے کیا تعلق ہے؟ یکجہتی کا یہ عالم کہ ایک طرح سوچنا اور مل کر عمل کرنا، عادت ثانیہ بن گئی۔حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری امرتسر میں بھرا گھر چھوڑ کر لاہور تشریف لائے۔یہاں سے اٹھے تو دور افتادہ علاقے یعنی خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ میں ڈیرہ ڈال دیا۔جب میں لدھیانے سے لاہور چلا آیا تو حضرت شاہ صاحب نے مجھے خان گڑھ بلا بھیجا۔وہ مجھے کوئی حکم دینا چاہتے تھے۔دو روز ان کی خدمت میں ٹھہرا رہا۔میں نے دریافت کیا شاہ صاحب کیا حکم ہے۔وہ فرمانے لگے۔دیکھو بھئی میری بات مانو۔میں نے عرض کیا۔فرمایئے تو سہی۔حکم تو کیجیے۔حکم ہوا میں نے اچھی طرح غور کر لینے کے بعد فیصلہ کیا ہے۔تم صدر بن جاؤ۔میرے لیے شاہ صاحب کے ہر حکم کی تعمیل باعثِ مسرت وسعادت تھی مگر میں صدارت کے لیے خود کو آمادہ نہ پا کر خاموش ہو گیا۔شاہ صاحب نے فرمایا بس تم مان ہی جاؤ۔اسی طرح کام ٹھیک چل سکے گا۔مجھے انکار کی جرأت نہ ہوئی۔لاہور میں مجلس احرار کی کونسل کا اجلاس ہوا اور استروں کی یعنی احرار کی صدارت مالا میرے گلے میں ڈال دی گئی۔اس کے بعد مجھے شاہ صاحب نے ۲۴ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو احرار کی پالیسی کے بارے میں ایک خط لکھا۔یہ تاریخی خط مجلس احرار کی نئی عمارت کا بنیادی پتھر بن گیا۔اس خط میں حضرت شاہ صاحب نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ قوتِ حاکمہ ہے۔مجلس احرار میدان سیاست مسلم لیگ کے سپرد کر کے اپنی جدوجہد کو خالصتاً تبلیغ کے لیے وقف کرتی ہے۔احرار کے جس کارکن کو سیاسی کام کرنا مقصود ہو اُسے مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیے۔اس اعلان کو عام کرنے کے لیے مجلس احرار نے ۱۹۴۹ء میں عظیم الشان کانفرنس کا اہتمام کیا۔ہزارہا سرخپوش احرار رضا کاروں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔بھرے اجلاس میں حضرت شاہ صاحب کی تجویز منظور ہو گئی۔یعنی مجلس احرار اور مسلم لیگ کی کشمکش ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔سچ تو یہ ہے

Marfat.com

کہ مجلس احرار نے بڑی جرأت، دلیری اور حوصلہ مندی سے مسلم لیگ کی فتح کا اقرار کیا اور اسے قوت حاکم تسلیم کر لیا۔ یہ ایک حقیقت بھی تھی مگر احرار کا یہ صاف دلی کا اعلان مسلم لیگ کو اس کے سامنے کے ٹارگٹ ونشانہ بازی کا طعنہ ہٹ گیا۔ لیگی لیڈر اپنی نالائقیوں، کوتاہیوں اور بد دیانتیوں پر پردہ ڈالنے اور عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے احرار کے خلاف پراپیگنڈہ کر کے اپنی جان چھڑا لیا کرتے تھے۔ اب احرار تو سامنے سے ہٹ گئے۔ لیگیوں کو تیر اندازی کی عادت پڑ چکی تھی۔ سامنے احرار نظر نہ آئے تو وہ آپس میں الجھ پڑے۔ لیڈر نے لیڈر کی پگڑی اچھالی اور کارکنوں نے کارکنوں کے گریبانوں میں ہاتھ ڈال دیئے ہمیں مسلم لیگ کی اس تباہی سے کوئی خوشی نہ تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ وہ جماعت جو پاکستان کو معرض وجود میں لانے کی ذمہ دار ہے۔ اس کو قائم رہنا چاہیے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملکی نظام کو احسن طریق پر چلائے۔ اس لیے کہ بنانے والے بگاڑنے سے پرہیز کریں گے۔ انہیں دکھ ہوگا کہ کل یہ محنت سے بنایا ہے۔ اسے تباہ نہ ہونا چاہیے مگر مسلم لیگ کے ذمہ داروں نے نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں شروع کیں۔ مسلم لیگ کو مجلس احرار سے میدان سیاست میں مخالفت تھی جب احرار نے سیاست سے کنارہ کشی کر لی تو مخالفت ختم ہوگئی۔ احرار کو تبلیغی میدان میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ تبلیغ کانفرنسیں ہونے لگیں۔ احرار رہنماؤں نے چند مہینوں میں فضا سازگار بنا لی اور پنجاب کے کونے کونے میں مسلمانوں کو بیدار کیا۔ مرزائیت بے نقاب ہونا شروع ہوئی۔ مرزائی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک ہونے لگا۔ مسلمانوں نے احرار کی بات سنی اسے جانچا، تولا اور پرکھا، تو حق دلوں میں اترنے لگا۔ مرزائیوں کے پراپیگنڈے نے احرار کو جس مقام سے گرا دیا تھا، وہ مقام احرار کو دوبارہ حاصل ہو گیا۔ احرار کے سخت جان اور آتش بیان مقررین نے مرزائیت کی دھجیاں بکھیرنا شروع کر دیں۔ مخلص اور مذہبی ذہن کے مسلم لیگیوں نے بھی احرار کا ساتھ دیا۔ مرزائیت کا مقابلہ اس لیے مشکل تھا کہ مرزائیت کا کھونٹا بڑا مضبوط تھا۔ چودھری ظفر اللہ خان قادیانی وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالے بیٹھے تھے۔ وہ ہمارے مسلمان وزیروں حتیٰ کہ وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین پر بھی بھاری تھے۔ چودھری صاحب نے ساری کیبنٹ پر رعب جما رکھا تھا۔ خواجہ ناظم الدین بے چارے نیک قسم کے بزرگ تھے۔ وہ بظاہر با حوصلہ نظر آتے تھے مگر اندر خانے سر ظفر اللہ خان سے مرعوب تھے۔ غرض یہ کہ مرکز میں سر ظفر اللہ کا طوطی بولتا تھا۔ ربوہ (چناب نگر) کی اہمیت بڑھنے لگی۔ مرزائیوں کے سالانہ جلسے پر مرزائی سرکاری ملازم دندناتے جانے لگے۔ وہ اپنے ہمراہ مسلمان ماتحتوں کو بھی لے جاتے۔ بعض دلیر مرزائی افسر اپنے بڑے افسروں تک کو یہ بھڑا دے کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے کہ چلیے سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ سے ملاقات کر

Marfat.com

لیجیے گا چنانچہ ریلوے کے ایک بہت بڑے افسر کو ہانک کر ربوہ لے گئے۔ ایک مرزائی ریلوے افسر جس کا ہیڈ کوارٹر غالباً لائلپور (فیصل آباد) تھا۔ ریل کا پورا ڈبہ دورے کے بہانے ربوہ لے گیا اور اسی میں مرزائیوں کو سوار کرا لیا۔ یہ دھاندلی کھونٹے کے زور پر تھی۔ احرار میں ابھی اتنی جان اور مقبولیت نہ آئی تھی کہ وہ بڑے مرزائی افسران کے منہ آتے یا اگر شور مچاتے تو شنوائی کی امید ہوتی مگر مجلس احرار کے معزز رہنما جو کچھ ہو رہا تھا اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو جاتے۔ ابھی صرف یہ کیفیت تھی کہ کھویا ہوا مقام حاصل ہو گیا۔ عام تبلیغ کانفرنسیں ہونے لگیں۔ لوگ تحفظ ختم نبوت میں زیادہ دلچسپی لینے لگے مگر احرار میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اعلیٰ حکام یا مسلمان وزرائے کرام کو متوجہ کر سکتے۔ تاہم مرزائیت کے خلاف تبلیغ کے لیے میدان صاف ہو گیا۔

قادیانی درویش

مجلس احرار کے ترجمان ''روزنامہ آزاد'' لاہور نے تحریک تحفظ ختم نبوت کو اچھا خاصا سہارا دیا۔ احرار کے کیمپ میں اطلاع ملی کہ دس بیس مرزائی روزانہ پاکستان سے قادیان جاتے ہیں۔ انہیں کوئی روکتا نہیں۔ مسلمان اگر بھارت جانا چاہیں تو انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ہم نے اس پر احتجاج کیا مگر بہرے کانوں نے ہماری بات نہ سنی۔ مرزائیوں نے ربوے سے اعلان کیا کہ قادیان میں 313 درویش مستقل طور پر قیام کریں گے۔ اس بہانے مرزائیوں نے پھر قادیان کا رخ کیا۔ ''آزاد'' نے پھر ایک نوٹ لکھا کہ بھئی 313 کی گنتی کبھی مکمل بھی ہو گی؟ تب دربارِ خلافت سے ''الفضل'' کے ذریعے اعلان ہوا کہ یہ لوگ قادیان میں ٹھہریں گے یہ درویش یہاں سے جائیں گے۔ جب وہ قادیان پہنچیں گے تو پہلے درویش واپس آ جائیں گے۔ مرزائی دس دس کی تعداد میں درویش لے کر قادیان جاتے رہے۔ اب کوئی پتا کرے کہ اُدھر سے کوئی واپس بھی آتا ہے کہ نہیں۔ غرض یہ کہ مرزائیوں کی بھارت میں آمد و رفت کے لیے پھاٹک کھلا رہا۔ ان مرزائیوں کی راہ میں کوئی سنگ گراں تھا اور نہ کوئی قدغن۔ احرار نے اس پر بار بار احتجاج کیا مگر شنوائی نہ ہوئی۔

کشمیر کا راستہ

یہی صورت حال کشمیر میں تھی۔ ایسی خبریں سننے میں آتی رہیں کہ مرزائی اِس پار سے اُس پار آتے جاتے رہتے ہیں مگر ہم نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی۔ آزاد کشمیر سے اطلاع موصول ہوئی کہ وہاں مسلمانوں کی آپس میں دھڑا بندی اور چپقلش ہو رہی ہے۔ احرار کا ذہن فوراً اس طرف جاتا ہے۔ جہاں

Marfat.com

اس قسم کی گڑ بڑ ہو۔ اس میں اکثر بیگانہ ہاتھ ہوتا تھا۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اکثر کلیدی آسامیوں پر مرزائی حضرات کا قبضہ ہے۔ ہمیں اس اطلاع سے سخت تشویش ہوئی۔ آزاد کشمیر میں بعض واقعات ایسے رونما ہوئے۔ جنہیں دبا دیا گیا۔ ہم بھی انہیں نظر انداز ہی کر رہے ہیں۔ انہی دنوں کوہاٹ میں ایک خطرناک حادثہ پیش آیا۔ اس کا تعلق فوج سے تھا۔ یہاں ایک مرزائی فوجی افسر نے خودکشی کر لی۔ اس واقعہ کی خبر ''الفلاح'' پشاور میں شائع ہوئی۔ ہم نے اس خبر کو پڑھا تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ''آزاد'' میں ''الفلاح'' کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی تو میں نے اس خبر کو پڑھا۔ سناٹے میں آ گیا۔ مسلمانوں نے مرزائیوں کو غیر معتبر سمجھنا شروع کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا محمد عبداللہ ایڈیٹر ''الفلاح'' کو مقامی حکام نے بُلا کر کہا کہ آپ نے یہ خبر کیوں شائع کی۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ صحیح خبر ہے اس لیے میں نے اسے شائع کر دیا تھا۔ بہر حال انہیں کہا کہ ایسی خبریں شائع کرتے وقت ذرا احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اس طرح سرکاری مشینری مرزائیت کے زیر اثر کام کر رہی تھی یعنی مرزائیوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کی بجائے اُلٹا مولانا کو انہیں مہذب الفاظ میں تنبیہ کر دی۔ احرار نے اس خبر کو دیکھا اور شائع کیا اس پر کوئی نوٹ نہیں لکھا اور نہ اس کا تذکرہ کانفرنسوں میں کیا۔ اس لیے کہ اوپر کا طبقہ مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں پر توجہ نہ دیتا تھا اور سر ظفر اللہ کے اقتدار نے مرکز میں مضبوط بریک لگا رکھا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں سر ظفر اللہ نے مرزائیت کے لیے بڑے حوصلے سے کام کیا اور بے پناہ کام کیا۔

گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر

ملک تقسیم ہونے لگا تو امت مرزائیہ کو اپنی انفرادیت کے پراپیگنڈہ کی سوجھی۔ مرزائی یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ ایک علیحدہ اقلیت ہیں۔ جسے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ مرزائیوں نے اپنی اہمیت جتانے کے لیے ایک پمفلٹ شائع کیا۔ جس میں مرزائی فوجی افسروں کی فہرست شائع کی۔ اس پمفلٹ کے ذریعے مرزائیوں نے خوب پراپیگنڈہ کیا۔ روزنامہ ''آزاد'' میں مرزائی افسروں کی فہرست شائع ہوئی تو سر ظفر اللہ نے کان کھڑے کیے اور مرکزی حکومت کی مشینری حرکت میں آ گئی۔ مرکز نے تار ہلایا تو گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر نے مجھے گورنمنٹ ہاؤس میں بلا بھیجا۔ میں قیاس کے گھوڑے دوڑاتا ہوا حاضری کے لیے تیاری کرنے لگا۔ مجھے کبھی یہ خیال آتا کہ سردار صاحب مذہبی قسم کے آدمی ہیں، ردِ مرزائیت کے سلسلے میں ہمیں تھپکی دیں گے۔ کبھی خیال آتا کہ ہم نے سیاست سے کنارہ کر لیا ہے۔ لیگ کے لیے کام کا میدان کھلا ہے، شاید تعاون کے بارے میں کوئی مشورہ ہوگا۔ کبھی

Marfat.com

خیال آتا کہ نشتر صاحب نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ یہ پرانے خلافتی ہیں۔ سر ظفر اللہ خان کی مرزائیت نوازی دیکھ کران کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی ہوگی۔ شاید احرار کے لیے اپنی تنخواہ میں سے سر ظفر اللہ کی طرح کچھ وقف کر دیں گے یا مالی امداد کا وعدہ فرمائیں گے۔ کبھی یہ گمان ہوتا کہ حضرت شاہ صاحب مدظلہ سے انہیں بڑی عقیدت رہ چکی ہے۔ شاید عقیدت کی رگ پھڑکی ہو اور میری معرفت خیریت دریافت فرمانے کو بلایا ہے۔ بہر حال میں تصورات کی دنیا میں خوش فہمی کے قلعے بناتا ہوا گورنمنٹ ہاؤس میں جا حاضر ہوا۔ نشتر صاحب شریف، ملنسار اور بڑے ہی خلیق انسان ہیں۔ جونہی میں نے کارڈ بھیجا۔ مجھے فوراً بلا لیا۔ بہت محبت سے ملے مگر علیک سلیک کے فوراً بعد وہ صرف گورنر رہ گئے۔ ''آزاد'' اخبار کی کاپی دکھا کر فرمانے لگے یہ آپ کا اخبار ہے؟ جی ہاں۔ یہ فہرست آپ نے شائع کی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی۔ فرمانے لگے معلوم ہے، آپ نے اس فہرست کو شائع کر کے کتنا بڑا جرم کیا ہے اور اس سے پاکستان کو کس قدر نقصان پہنچا ہے؟ میرے تو طوطے اڑ گئے کہ یا الٰہی وہ فہرست جسے مرزائیوں نے ہزارہا کی تعداد میں شائع کر کے دفتروں میں تقسیم کیا، شہروں میں بانٹا اور جس فہرست کے خود مرزائیوں نے خوب ڈھول پیٹے۔ اسے مجلس احرار نے شائع کر دیا تو کیا جرم کیا؟ میں نے سنبھل کر عرض کیا کہ سردار صاحب میں نے اسے کچھ اہمیت نہیں دی، اس سے کیا نقصان ہوا ہے؟ یہ تو بے ضرر سی چیز ہے۔ اخبارات میں ایسا کچھ چھپتا ہی رہتا ہے۔ فرمانے لگے، کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ اس سے کیا نقصان ہوا؟ میں نے بہ ادب عرض کیا کہ مجھے سمجھائیے، تا کہ آئندہ کے لیے احتیاط کی جائے۔ سردار صاحب نے دو باتیں بتائیں ایک یہ کہ ان کے صوبہ سرحد میں میجر جنرل نذیر احمد صاحب قادیانی تمام سرحد کے انچارج فوجی افسر ہیں۔ یہ بتا کر فرمانے لگے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ صوبہ سرحد بارودی صوبہ ہے۔ مرزائیوں والی بات وہاں چل نکلے تو خدا جانے کیا قیامت آ جائے۔ دوسری بات سردار صاحب نے یہ فرمائی کہ اس فہرست کا پراپیگنڈہ کابل ریڈیو بھی کرتا ہے۔ خدا کے لیے پاکستان کی رسوائی کا سامان نہ پہنچاؤ۔ سردار صاحب کی پہلی بات کو تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر دوسری بات نے مجھے کسی قدر اپیل کیا۔ میں خود اسے پسند نہ کرتا تھا کہ ہمارا نام لے کر کابل ریڈیو ہمارے ہی ملک کے خلاف پراپیگنڈہ کرے گا۔ ویسے کابل والوں کو شاید اس فہرست سے زیادہ لمبی اور تازہ فہرست کا علم ہو گا۔ مجھے آخری بات نے ضرور متاثر کیا اور میں نے سردار صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ میں حتی الوسع احتیاط سے کام لوں گا۔ سردار صاحب نے یہ بھی آخر میں فرمایا کہ انہیں مرکز سے ایکشن لینے کی ہدایت ہوئی تھی۔ مرکز کا نام سن کر سر ظفر اللہ خان کا تصور میری آنکھوں کے سامنے آ موجود ہوا۔

Marfat.com

اس واقعے سے میں کسی قدر مایوس ہوا۔ مجھے یہ شک گزرا کہ یہ ملک مرزائیت کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ مسلمان وزیر محض وزیر ہیں وہ سر ظفر اللہ کے آڑے نہیں آسکتے سر ظفر اللہ کی پوری مشینری پر نگاہیں ہیں وہ کسی پرزے کو اِدھر اُدھر ہلنے نہیں دیتے اور جس طرح چاہتے ہیں۔ چلاتے ہیں۔ اس وقت تو صرف شک ہی تھا مگر آخر میں یہ شک یقین میں بدل گیا۔

دوسری ملاقات

پہلی ملاقات میں سردار صاحب نے مجھے بحیثیت ملزم بلایا تھا۔ گو اُن کا سلوک شریفانہ تھا۔ دوسری بار میں خود حاضر ہوا اور مرزائی افسر کی خودکشی کا تذکرہ ہوا تو سردار صاحب نے ''الفلاح'' کا وہ پرچہ جسے میں اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ ملاحظہ فرمایا۔ جس میں اس واقعہ کی خبر درج تھی چنانچہ انہوں نے پشاور سے اخبار منگوا کر شاید اپنے پاس کسی مثل میں رکھا، یا اسے اوپر بھیج دیا۔ بہرحال اس واقعے کی اطلاع پا کر سردار صاحب کو مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں کے بارے میں کھٹک ضرور پیدا ہوئی۔ شاید اسی کھٹک نے سردار صاحب کو جب وہ گورنری چھوڑ کر مرکز میں منسٹر بنے تو ''مولوی منسٹر'' کا خطاب دلوایا۔

فرقان بٹالین

ربوہ (چناب نگر) مرزائیوں کا قلعہ بن گیا۔ پہاڑیوں کے دامن میں دریا کے کنارے پر، پل سے اس پار چنیوٹ سے بالکل قریب، بہت بڑا خطہ زمین مرزائیوں کو جب تقریباً اللہ کے نام پر دستیاب ہو گیا تو مرزا محمود نے خود کو قادیان سے زیادہ محفوظ، زیادہ طاقتور اور زیادہ باوقار محسوس کیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں مرزا صاحب اعلیٰ درجے کے سکیم باز اور سکیم ساز ہیں۔ انہیں اس قلعے میں محفوظ بیٹھ کر سلطنت کے خواب آنے لگے خواب کیا، وہ جاگتے ہوئے اپنی آنکھوں سے اپنی سکیموں کو کامیاب ہوتے دیکھنے لگے۔ ربوہ (چناب نگر) میں مرزائی نوجوانوں کو فوجی ٹریننگ دینے لگے۔ فوج میں اپنے آدمیوں کو داخل کرنے لگے۔ میں یہاں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے صرف ایک واقعہ عرض کرنا ہے کشمیر میں گڑبڑ کے بعد مرزا محمود نے اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور انفرادیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے مرزائی نوجوانوں کی فرقان بٹالین تیار کی۔ یہ بٹالین فوجی محاذ پر پہنچ گئی ادھر ''الفضل'' نے فرقان بٹالین کا پراپیگنڈہ کیا۔ ادھر احرار نے خطرے کا الارم کیا، حکومت اور عوام کو خبردار کیا کہ دیکھو مرزا محمود کس طرح فوج کو متاثر کر رہا ہے۔ پراپیگنڈہ اس قدر تیز ہوا کہ احرار رہنماؤں نے پشاور سے لے کر کراچی تک کے ڈانڈے ملا دیئے۔ مجبور ہو کر انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو فرقان بٹالین توڑنا پڑی مگر یہ مرزائی بٹالین اب تک یہ ثابت نہ کر سکی کہ وہ سرکاری رائفلیں کہاں ہیں جو انہیں بٹالین

Marfat.com

میں استعمال کے لیے دی گئی تھیں ان رائفلوں کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوئیں مگر اس وقت کی حکومت ان اعتراضات کو ٹھنڈا شربت سمجھ کر پی گئی۔ بٹالین ربوہ واپس آئی تو اس کا استقبال ہوا اور اس کے بعد ربوے کی پہاڑیوں کی اوٹ میں فوجی پریڈ ہونے لگی۔ ان پریڈوں کے اثرات کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ محمود کو بڑے مزیدار خواب آنے لگے۔

کارتوس ختم ہو گئے

فوجی رائفلیں تو خیر فوجی ہوتی ہیں۔ امت مرزائیہ کے پاس لائسنس کا اسلحہ بھی کافی ہے۔ لائسنس کے اسلحہ کے لیے چونکہ کارتوسوں کی تعداد مقرر ہے۔ اس لیے ان سے گزارہ نہیں چلتا خصوصاً اس صورت میں جب بٹالین بازی اور فوجی تیاریوں کا شوق حد سے بڑھ جائے تو گنتی کے کارتوس کام نہیں دیتے۔ ربوے میں کسی مسلمان کو بلا اجازت داخل ہونے کی ممانعت ہے [1]۔ کارتوس ختم ہونے تو مرزائیوں کو دیسی ہتھکنڈوں کی سوجھی، کارتوس بنانے کی مشین عام طور پر دستیاب ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں بھی مشین لگ گئی ہوگی یہ بات ہم اس لیے کہتے ہیں کہ ایک روز مرزائیوں نے چنیوٹ کے آتش باز کے پاس سے بارود خریدا جس کے پاس بارود کا لائسنس تھا۔ ایک من دس سیر اور شاید دو چھٹانک بارود کی فروخت کا رجسٹر ہوتا ہے جس میں بارود کا وزن اور خریدار کا نام درج کیا جاتا ہے۔ احرار کو پتہ چلا تو انہوں نے کسی نہ کسی طرح رجسٹر کے اندراج دیکھے۔ کسی تفتیش کے سلسلے میں تھانیدار سے بات ہوئی تو معاملہ طول پکڑ گیا۔ تھانیدار نے تحقیقات شروع کر دیں۔ پولیس ربوے میں بھی جا دھمکی معلوم ہوا کہ ہاں بارود خریدا گیا ہے۔ اس خریداری کا جواز ہمیں کوئی اب تک بتا نہ سکا۔ خواجہ ناظم الدین بھی آئیں بائیں شائیں کر کے بات کو ٹالتے رہے۔ عوام بیدار ہو گئے مگر حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ مرزائیوں کی ریشہ دوانیاں اور انتہائی مضبوط ارادے عریاں ہونے لگے۔ احرار کے مبلغ احرار کے بلند پایہ رہنما مرزائیوں کا لٹریچر اور مرزائیوں کے ریشہ دوانیوں کے ثبوت کے پلندے لے کر تبلیغ کانفرنسوں میں مرزائیت کا تار و پود بکھیرنے لگے۔ مرزائی بے پرواہ ہو کر اپنے کاموں میں لگے رہے۔

وہ ہمارے مسلمان وزرا کو گھیر گھار کر ربوے پہنچانے کی فکر میں تھے۔ وزراء حکومت کے نشے میں مست تھے۔ الا ماشاء اللہ احرار کلیجہ پکڑے پھرتے تھے کہ ملک و ملت کو کس طرح مرزائیت کے چنگل سے چھڑایا جائے۔

---

[1] ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تو مسلمانوں کے دیرینہ مطالبے کی بنیاد پر ربوہ کو کھلا شہر قرار دے دیا گیا

Marfat.com

ہندوستانی فوج پاکستان کی سرحد پر

اچانک یہ روح فرسا خبر آئی کہ پاکستان کی سرحد پر بھارتی فوجیں پیر جمائے بیٹھی ہیں۔اس خبر سے سمجھدار اور سنجیدہ طبقے میں بے چینی پیدا ہوئی۔ بزدل ڈرے اور بہادروں نے بھنگڑا شروع کیا کہ اب جرأت ومردانگی کے جوہر دکھانے کا موقع آیا۔ پاکستانی فوج نے یہ سمجھا کہ شکار چل کر دروازے پر آ گیا ہے۔ایسے میں جنگ کے سوا کسی دوسری بات کا چرچا نہ تھا۔اس سلسلے میں احرار نے اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا۔حضرت امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ صاحب بخاری، حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی، صاحبزادہ سید فیض الحسن، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد علی جالندھری، شیخ حسام الدین اور دوسرے تمام احرار رفیقوں نے پاکستان کے سبھی شہروں اور دیہاتوں میں دفاع کانفرنسوں کا ایک جال بچھا دیا۔خلوص سے کام کیا جائے تو نتائج بھی اچھے برآمد ہوتے ہیں۔احرار کی دفاع کانفرنسوں میں زبردست اجتماعات ہوئے احرار کے بہادر اور مخلص رضا کاروں نے پاکستانی سرحدوں کے چپے چپے پر دفاعی تیاریوں کا پراپیگنڈہ کیا۔ان کانفرنسوں میں یہ بھی کہا گیا کہ بغلی گھونسوں سے خبردار رہیے۔ ہمارے اجتماعات یعنی دفاع کانفرنسوں میں ہر مکتب وخیال کے لوگوں نے نہایت پاکیزہ جذبے سے شرکت کی۔حتیٰ کہ سرکاری افسر بھی احرار کی دفاع کانفرنسوں سے متاثر ہوئے اور بعض مقامات پر مخلص مسلمان افسروں نے دفاع کانفرنسوں میں باقاعدہ شرکت بھی کی۔

خوشگوار اثرات

مرزائیوں نے احرار کے خلاف جو زہریلا پراپیگنڈہ کر رکھا تھا، جس کے اثرات مسلم لیگ کے کیمپ میں بھی سرایت کر چکے تھے۔آہستہ آہستہ کمزور پڑنے لگا۔حتیٰ کہ احرار کی مخلصانہ خدمت نے نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم کو رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ مرحوم نے اپنے خاص ایلچی کے ذریعے تبادلۂ خیال کے لیے بلا بھیجا۔ بات ہوتی رہی۔تعلقات بہت بہتر ہونے لگے۔نوابزادہ مرحوم بڑی احتیاط سے گفتگو کرتے تھے۔بالآخر قاضی احسان احمد شجاع آبادی صاحب نے ایک روز ان کے سامنے مرزائیت کا پہاڑہ کھول کر رکھ دیا۔مرحوم بہت ذہین انسان تھے۔مسائل کو بہت جلد سمجھ لیتے تھے۔قاضی صاحب نے اس بڑی لمبی اور تفصیلی ملاقات کے بعد متعدد بار انہیں مرزائی ریشہ دوانیوں سے خبردار کیا۔ وہ احرار کے بالکل قریب آ گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ احرار کے خلاف سب سے زیادہ اور

Marfat.com

خطرناک قسم کا پراپیگنڈہ صرف مرزائیوں نے کیا ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ احرار کے سوا باقیوں سے مرزائی اچھی طرح نپٹ لیتے ہیں۔ آخری دنوں میں مرحوم طے کر چکے تھے کہ وہ احرار سے مکمل تعاون کریں گے اور تعمیری کاموں میں احرار کی خدمات ضرور حاصل کر لی جائیں گی۔ یہاں نوابزادہ مرحوم کا ذکر ضمناً آ گیا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ احرار نے تبلیغی میدان میں اچھی خاصی طاقت حاصل کر لی تھی۔

صاحبزادہ سید فیض الحسن

جہاں تک دفاعی کانفرنسوں کے ذریعے عوام کو بیدار اور خبردار کرنے کا تعلق تھا۔ احرار کے بڑے رہنماؤں سے لے کر آخری رضا کار تک سب نے انتہائی جانفشانی سے کام کیا۔ دفاع کے عملی میدان میں رضا کاروں نے مکمل تعلیم حاصل کر لی مگر محاذ کی تیاریوں میں صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب نے گوجرانوالہ میں فوجی ٹریننگ کیمپ کے ذریعے بے مثال خدمت کی۔ مرزائیوں نے جب انہیں کشمیر کے محاذ پر آتے جاتے دیکھا تو فوجی افسروں کو بہکایا اور بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ خلوص اور دیانت بڑی شے ہے۔ فوجی افسروں نے اس قسم کے اعتراضات کے جواب میں فرمایا کہ صاحبزادہ صاحب کے لائے ہوئے رضا کار بڑے جانثار، بہت مخلص، بہادر اور مستعد ثابت ہوئے ہیں۔ باقیوں پر ہمیں بھروسہ بہت کم ہے۔ مرزائیوں کا یہ پراپیگنڈہ بھی ناکام ہوا۔ مجھے تفصیل یاد نہیں کہ صاحبزادہ صاحب نے رضا کاروں کے علاوہ کس قدر مالی امداد پہنچائی۔ ان دنوں صاحبزادہ صاحب خاکی کپڑوں میں ملبوس فوجی جرنیل معلوم ہوتے تھے الحمدللہ کہ احرار نے اس گوشے میں کسی سے کم خدمت نہیں کی۔

پنجاب اسمبلی کے انتخابات

انتخابات کے بغیر جمہوری نظام کا دھندا نہیں چلتا مگر ہمارے ہاں کے انتخابات نعمت کی بجائے لعنت ثابت ہوئے ہیں۔ انتخابات کے دنوں میں جو کچھ ہوتا ہے اسے دیکھ کر شریف اور خوددار انسان کا میدان انتخاب میں کھڑا رہنا تقریباً محال ہو جاتا ہے۔ یوں انسان ضرورت سے مجبور ہو کر بیت الخلا کے ایک دو چکر ہر روز کاٹتا ہے اور کامیاب واپسی پر دلی سکون محسوس کرتا ہے۔ بعینہٖ بھلے لوگ موجودہ انتخابات میں طوعاً کرہاً حصہ لیتے ہیں مگر ہر قدم پر اس میدان میں روحانی کوفت کا سامنا ہوتا ہے۔ زندہ ضمیر پر اس قدر بوجھ پڑتا ہے کہ اگر قدرت نے اس میں لچک نہ رکھی ہو تو یہ بہت جلد دم توڑ دے۔ ایک

Marfat.com

امیدوار کو وہ سب کچھ کہنا پڑتا ہے جو وہ کرنا نہیں چاہتا ایک ووٹر وہ سب کچھ کرتا ہے جو اسے کرنا نہ چاہیے۔ فریقین ایک دوسرے کو خوب جانتے اور پہچانتے ہیں مگر منافقت کے نئے چولے پہن لیتے ہیں۔ ذرا عار محسوس نہیں ہوتی۔ انتخابات کے دنوں میں دولت آبرو دونوں ناچتی ہیں۔ ایمان اگر ہو تو اس کا الگ کچومر نکل جاتا ہے۔ ووٹ دیتے وقت عورتیں دس دس خاوند بدلتی ہیں تو نمائندے یہی ہوں گے، جن کا آج رونا رویا جاتا ہے۔ بہر حال ہم نے عرض کیا کہ رائے کا حق جو ایک نعمت ہے لعنت بن کر رہ گیا ہے۔ صورت حال یہ ہو تو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مدظلہ انتخابات میں کیونکر حصہ لیں اور کون ہے جو انہیں مجبور کرے اور کہے کہ آیئے، ہاتھ بٹایئے؟ یہ کار خیر ہے۔ اس کار خیر کو شاہ صاحب نے خوب دیکھ اور پرکھ لیا ہے۔ ہزار قسم کے فسادات الیکشن ہی کے موسم میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی اور یہی مجبوری تھی۔ جس کے پیش نظر حضرت شاہ صاحب نے مجلس احرار کے رفیقوں کو یہ حکم دیا کہ اس سیاست پر تین حرف بھیجو یہ دھندا مسلم لیگ ہی کو چلانے دو آؤ مل کر دین کی خدمت اور تحفظ ختم نبوت کے میدان میں بنیادی مسئلے کی تبلیغ کریں دنیا ٹھیک ہونے سے رہی عاقبت کو تو بچالیں۔ بات کہاں سے کہاں جانکلی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پنجاب اسمبلی کے انتخابات کا اعلان ہوا اور امیدوار اچکنوں اور شیروانیوں پر برش پھیرنے لگے۔ جنہیں خدا نے زیادہ توفیق دے رکھی تھی، وہ نئے سوٹ سلوانے لگے۔ مجلس احرار کا واضح اعلان موجود تھا کہ اسے سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں مگر انتخابات کے بارے میں ایک شرط تھی کہ مرزائی اگر مسلمانوں کی نمائندگی سے باز رہیں تو پھر ہمارے سیاستدان جانے اور ان کا کام اور اگر مرزائیوں نے مسلمانوں کے ووٹ پر میدانِ انتخاب میں قدم رکھا تو احرار تیار کھڑے ہیں۔ وہ بیج کھیت مرزائیوں کا مقابلہ کریں گے۔ تجویز میں چونکہ احرار کارکنوں کو ہدایت موجود تھی کہ اگر سیاست میں احرار کا کوئی کارکن حصہ لینا چاہے تو اسے مسلم لیگ کے کیمپ میں کام کرنا چاہیے۔ اس بناء پر احرار نے انتخابات کے موقعے پر مسلم لیگ کو واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ہمیں تو الیکشن میں حصہ لینا نہیں ہے۔ ہمارے سیاسی کام کرنے والے مسلم لیگ کا ساتھ دیں گے۔ بشرطیکہ مسلم لیگ جو مسلمانوں کی نمائندگی کی دعویدار ہے، مرزائیوں کو مسلم لیگ کا ٹکٹ نہ دے۔ احرار کی یہ شرط بڑی وزنی اور بہت جاندار تھی۔ گمان غالب یہی تھا کہ مسلم لیگ مرزائیوں کو ٹکٹ نہ دے گی۔ بحیثیت صدر مجلس احرار اسلام پاکستان، میں نے مسلم لیگ کے رہنماؤں کو مجلس احرار کی پوزیشن ذہن نشین کرا دی تھی۔ اخبار ''آزاد'' میں باقاعدہ اعلان بھی ہوتا رہا کہ دیکھنا مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت ہے۔

Marfat.com

مرزائی غیر مسلم ہیں۔ مسلم لیگ کا ٹکٹ مرزائی کے ہاتھ میں جانے نہ پائے اگر خدانخواستہ مسلم لیگ نے کسی مرزائی کو اپنا ٹکٹ دیا تو احرار اس مرزائی (مسلم لیگی) امیدوار کی سخت مخالفت کریں گے۔ ایسے مرزائی امیدوار کے مخالف جو بھی مسلمان امیدوار کھڑا ہوگا۔ احرار اس کی حتیٰ المقدور امداد کریں گے امیدوار مسلمان ہونا چاہیے۔ ختم نبوت پر اس کا صحیح عقیدہ ہو۔ خواہ وہ کسی جماعت سے متعلق ہو۔ احرار کا مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ مرزائی امیدوار کے مقابلے میں اس کی امداد کی جائے گی۔ اس واضح اعلان کے بعد اگر پھر بھی مسلم لیگ کے رہنما مغالطے میں رہیں تو احرار کیا کریں؟

قائد ملت لیاقت علی خان مرحوم کی تشریف آوری

نوابزادہ مرحوم ہفتہ بھر کے تقاضوں اور سخت انتظار کے بعد لاہور تشریف لائے تو مسلم لیگ کے سوکھے دہانوں میں گویا پانی آ گیا۔ نوابزادہ مرحوم بڑی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا اچھا خاصہ رعب تھا۔ الیکشن باز خوشامدیوں کے ٹھٹھ لگ گئے۔ لاٹھیوں ناپ کر خریدی ہوئی کاروں کی قطاریں سڑکوں پر دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ الیکشن کے امیدوار بڑی ٹھاٹھ سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ غرض یہ کہ لاہور میں بڑے بڑے لوگ آ موجود ہوئے۔ مخلص مگر غریب مسلم لیگی وہاں بھی دھکے کھا رہے تھے سبھی حضرات امیدوں بھرا دل تسلی کے ہاتھ سنبھالے پھرتے تھے۔ لوگوں نے بڑے پیر کی منتیں بھی مانی ہوں گی۔ ہمیں اب تک وہ شاندار نظارہ بھولا نہیں۔ ایک دوست ہمیں بطور تبرک اپنی موٹر میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ بہر حال ٹکٹوں کی تقسیم سے پہلے ہم نے نوابزادہ مرحوم کے معتمد علیہ کی معرفت پیغام بھیجا کہ ہماری گزارشات نہ بھولئے گا۔ دیکھنا مسلم لیگ کا ٹکٹ مرزائی کو نہ دیجیے گا۔ مرزائیوں کو الیکشن کے لیے کھلا چھوڑ دیجیے۔ ہم ان سے نپٹ لیں گے۔ ہمیں تسلی دی گئی کہ کسی مرزائی کو مسلم لیگ کا ٹکٹ نہ دیا جائے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔

چونکہ وعدہ خان لیاقت علی خان کا تھا۔ اس لیے ہم مطمئن ہو گئے۔ دو تین روز درخواستوں کی جانچ پڑتال ہوتی رہی۔ اس عرصے میں میں نے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری جناب یوسف خٹک سے ملاقات کی۔ میں مطمئن تھا۔ میں نے احباب کو مطمئن کر دیا۔ صورتحال یہ تھی کہ مسلم لیگ اگر مرزائی کو ٹکٹ نہیں دیتی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ مرزائی کو مسلمان نہیں سمجھتی۔ ہمیں اپنی فتح سامنے نظر آ رہی تھی۔

Marfat.com

مسلم لیگ نے ٹھوکر کھائی

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ ٹکٹوں کی تقسیم کے بارے میں یہ طے ہو چکا تھا کہ مسلم لیگ کسی مرزائی کو اپنا انتخابی نمائندہ نامزد نہ کرے گی۔ فرداً فرداً درخواستوں پر غور ہوا۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں کی محبوبیت کو خطرہ لاحق تھا۔ کسے قبول اور کسے رد کریں؟ ذمہ دار اور با اثر لوگوں کی ناراضگی اور مخالفت کیسے قبول کی جائے؟ باہمی مشورہ ہوا۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ سے جتنا دل چاہے، اختلاف کر لیجیے۔ میاں صاحب بڑے ہی ذہین آدمی ہیں۔ ان کے مشورے سے خان لیاقت علی خان مشکلات کے اس بھنور سے نکل گئے تھے۔ طے یہ ہوا کہ ہر ضلع کی مسلم لیگ سیٹوں کی تعداد کے مطابق پورے ضلع کے امیدواروں کو نامزد کر کے سفارش کرے۔ تاکہ خان لیاقت علی خان مرحوم منظوری کی آخری مہر ثبت کر کے نامزد امیدواروں کے ناموں کا اعلان کریں۔ گویا گروپنگ سسٹم کے ذریعے ٹکٹوں کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا۔

تین مرزائی امیدوار آ گئے

جب ضلع وار فہرستیں آ گئیں تو نوابزادہ صاحب نے منظوری دے کر امیدواروں کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ ان فہرستوں کے ذریعے غلطی سے تین مرزائی کنکر بھی مسلمان موتیوں میں بندھ گئے۔ جونہی ان مرزائیوں کے ناموں کا اعلان ہوا۔ احباب نے مجھے دفتر میں آ پکڑا وہ سخت برہم تھے۔ انہوں نے غصے کے چھاج میں مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں کے ہمراہ مجھے بھی ڈال لیا اور پھٹکنے لگے۔ مجھے مسلم لیگ کی اس حرکت پر تاؤ تو بہت آیا مگر میں نیلوفری طبیعت کا انسان ہوں۔ ایسے موقعوں پر زیادہ محتاط ہو جاتا ہوں۔ میں نے مختلف زاویوں سے سوچنا شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کا فیصلہ ہماری منشاء کے خلاف اور مرزائیوں کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ میرے سامنے ماضی کا تجربہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب بھی احرار اور مرزائیوں کی ٹکر کا موقع آیا۔ برطانوی کل پرزوں نے ہمیں براہ راست نبرد آزمائی کا کبھی موقع نہ دیا بلکہ ہمیشہ یہ ہوا کہ برطانوی حکومت بیچ میں آ گئی۔ مرزائیوں کو اپنے پیچھے کھڑا کیا۔ خود ڈھال بن گئی۔ احرار نے غصے میں برطانوی پہاڑ سے ٹکر لی۔ زخمی ہو کر نڈھال ہوئے۔ جونہی زخموں کا اندمال ہوا۔ سنبھلے اور پھر ٹکر لی۔ یہی کچھ ہوتا رہا۔ مرزائیت پھلتی پھولتی رہی۔ برطانوی مالی نے اپنے پودے کو خوب پالا پوسا۔ اس تجربے نے مجھے دوسرے طریقے پر چلنے اور مختلف زاویۂ نگاہ سے سوچنے پر

Marfat.com

مجبور کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب موجود نہ تھے۔ وہ کسی مسلمان کا مکان چالیس روپیہ ماہوار کرایہ پر لے کر ملتان میں آباد ہو چکے تھے۔ میں اگر ملتان جاتا تو اس نازک مرحلے پر دو دن کی غیر حاضری میں مسلم لیگ کی اس بے بھی کا بہت برا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ یعنی یہ کہ احرار کارکن مسلم لیگ سے بیزاری کا اعلان کر دیتے۔ مرزائیوں کی بن آتی۔ احرار کو مسلم لیگ سے لازماً جنگ کرنا پڑتی۔ میں نے احباب سے کہا کہ مجھے مہلت دو، ہم تنہا جنگ و پیکار کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلانا ہو گا، یا کم از کم حضرت شاہ صاحب سے مشورہ لازمی ہے۔ میں تنہا یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ مسلم لیگ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے۔ احباب نے میری بات مان لی۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں کو کچھ معلوم نہ تھا کہ گروپنگ سسٹم میں تین مرزائی بھی آ گئے ہیں۔ میں نے یوسف خٹک صاحب کو فون کیا۔ ان دنوں خٹک صاحب نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم کے نفس ناطقہ تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ خٹک صاحب ہمارا آپ کا تعلق ختم ہو گیا۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ حیران ہو کر خٹک صاحب نے فرمایا۔ کیا کہا ماسٹر صاحب؟ میں نے معاملے کو صاف الفاظ میں کہہ ڈالا، خٹک صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور دریافت فرمایا کہ کیا نام ہیں، ان مرزائیوں کے؟ میں نے عصمت اللہ اور ان کے ساتھیوں کے نام بتا دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ نے عصمت اللہ جیسے جغادری مرزائی کو ٹکٹ دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے اس شخص پر کس قسم کے شبہات اور الزام ہیں؟ ہم نہ چاہتے تھے کہ جس مسلم لیگ سے کل یارانہ کیا تھا۔ آج اس سے جنگ کریں مگر اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ آپ وعدہ سے منحرف ہو چکے ہیں۔ ہماری ایک ہی شرط تھی۔ جسے آپ نے ٹھکرایا۔ یہ غرور آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ میں نے خٹک صاحب سے بڑی تیز کلامی کی۔ یوسف خٹک صاحب خلیق انسان ہیں۔ وہ فرمانے لگے۔ خدا کے لیے کوٹھی پر آ جاؤ۔ ورنہ میں خود لینے آؤں گا۔ میں بھی ابھی نوابزادہ صاحب سے بات کرتا ہوں۔ دانستہ کچھ نہیں ہوا۔ آ جاؤ اس بارے میں سوچ سمجھ کر مناسب طریقہ اختیار کر لیا جائے گا۔ بتاؤ، آتے ہو کہ نہیں؟ میں تو سر کے بل جانے کے لیے تیار تھا۔ یہ بلاوا میری منشاء کے عین مطابق تھا۔ میں کوٹھی پر پہنچا تو میاں دولتانہ موجود نہ تھے۔ خٹک صاحب مجھے نوابزادہ صاحب سے بالمشافہ گفتگو کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ میں کہتا تھا کہ جو غلطی ہوئی ہے۔ اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا نہ بابا میں نہیں ملتا۔ تب مجھے پوچھا گیا کہ ٹکٹ واپس نہ لیے جائیں تو کیا ایسی صورت نکل سکتی ہے۔ جس سے احرار مطمئن ہو جائیں اور تعلق نہ ٹوٹے، میں نے انکار کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر کوئی صورت قابل قبول نکل سکی تو کل دس

Marfat.com

بجے احباب سے دریافت کر کے بتا سکوں گا۔ یہ کہہ کر میں واپس چلا آیا۔احباب کو جمع کیا۔انہیں نفع نقصان سب کچھ سمجھا دیا۔ ماضی کے واقعات کو دہرایا اور آخری بات یہ کہی کہ مقصد تو یہ ہے کہ مرزائیوں کو شکست دی جائے۔اس کے لیے اگر مسلم لیگ ہماری کم از کم بات مان لے یعنی غیر جانبدار ہو جائے تو کام بن جائے گا۔محبت، خلوص اور بھروسے کی بات ہے۔احباب نے مجھے کھلی اجازت دے دی اور کہا کہ مناسب فیصلہ کر ہی لینا چاہیے۔دس بجے سے قبل ہی خٹک صاحب کا فون آ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے فرمایا کہ کہیے، کیا فیصلہ ہوا؟ میں نے کہا کہ فیصلہ تو آپ نے ہی کر دیا ہے۔ اب کیا فیصلہ ہوگا۔ بھئی خٹک صاحب! میرے دوست بہت بگڑ رہے ہیں۔ کہتے ہیں، مسلم لیگ والوں کا اعتبار ہی کیا ہے۔ادھر بات کرتے ہیں، اُدھر مکر جاتے ہیں، مسلم لیگ کے لیڈروں نے وعدہ کیا تھا کہ مرزائیوں کو ہرگز ٹکٹ نہ دیں گے۔اب ایک چھوڑ تین کو ٹکٹ دیئے ہیں۔خٹک صاحب نے بڑی محبت سے مجھے کہا کہ میری خاطر آپ آ جائیں اور بات کر لیں۔ میں تو دل سے چاہتا تھا کہ بات طے ہو جائے چنانچہ میں گیا تو یہ طے ہوا کہ ٹکٹ تو بڑی عیاری سے مرزائیوں نے حاصل کر ہی لیے ہیں مگر مسلم لیگ ان کی کوئی امداد نہ کرے گی۔احرار کو حق ہے کہ وہ ان کی مخالفت کریں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا یہ ہو گیا۔

چک جھمرہ میں مرزائیوں کی غنڈہ گردی

احرار نے مرزائیوں کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا۔احرار کے سحر آفریں مقرروں اور اردو پنجابی کے شاعروں نے مرزائیت کی متعفن لاش کا پوسٹ مارٹم کرنا شروع کیا۔کانفرنسیں اور جلسے ہونے لگے۔ مولانا محمد علی جالندھری جید عالم انتہائی جفاکش، بڑے منتظم اور پتے کی بات کہنے والے بہترین مقرر ہیں۔ پنجابی زبان میں ان کی تقریر ماسٹر پیس ہوتی ہے وہ اردو میں بھی بہت اچھی تقریر کرتے ہیں مگر اردو کی تقریر میں پنجابیت کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں وہ جس انداز میں اپنا مافی الضمیر سمجھاتے ہیں یہ انہی کا حق ہے۔ان کی تقریر عام فہم ہوتی ہے مگر جب وہ تقریر کرتے ہوئے چھا جاتے ہیں تو جاہل بھی جھومتا ہے۔ عالم پر بھی وجد طاری ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو احباب ان کا منہ تکنے لگتے ہیں کہ یہ سیدھا سادہ دیہاتی مولوی محمد علی بول رہا ہے؟ مولانا محمد علی جالندھری کے ساتھ سفر کرنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ وہ جب اپنا پروگرام بناتے ہیں تو اسے اس قدر ٹائیٹ کرتے ہیں کہ اگر

Marfat.com

گاڑی لیٹ ہو جائے تو سارا کھیل خراب ہو جاتا ہے مگر مولانا اپنے پروگرام کو ایسی صورت میں بھی ادھورا نہیں چھوڑتے، دس میل سائیکل پر سفر کرنا پڑے تو انہیں انکار نہیں۔ دو چار میل پیدل چلنا پڑے تو وہ تیار ہیں۔ کھانے کو ملے یا نہ ملے تو جو کچھ ملے ناک بھوں نہیں چڑھاتے۔ ہمارے اِس مردِ مجاہد نے چک جھمرہ کا پروگرام بنالیا ٹائم ٹیبل دیکھا ہوگا۔ بیچ میں چک جھمرہ نظر آیا۔ فیصلہ کرلیا۔ جاتے جاتے یہاں بھی ایک تقریر کر جائیں۔ اطلاع کے مطابق جلسے کا اعلان ہو گیا۔ چک جھمرہ کی منڈی پر عصمت اللہ مرزائی کا ایسا رعب تھا کہ منڈی کے شریف مسلمان آڑھتی، عصمت اللہ کے منہ آنے سے کتراتے تھے۔ حد یہ کہ مالکوں سے دریافت کیے بغیر عصمت اللہ اُن کے نوکر کو حکم دیتے تھے کہ اٹھالاؤ، چارپائی کھینچ کر لے آؤ ہم ذرا آرام کریں گے۔ کسی کو جرأت انکار نہ تھی۔ یہی عصمت اللہ چک جھمرہ کی سیٹ کا مسلم لیگی امیدوار تھا۔ مولانا محمد علی صاحب حسبِ اعلان جلسہ گاہ میں پہنچے۔ یہ جلسہ بازار ہی میں ہو رہا تھا۔ بیچ میں تخت پوش بچھا کر کچھ دریاں وغیرہ بچھائی گئی تھیں۔ جونہی مولانا نے سٹیج پر پہنچ کر تلاوت کلام پاک شروع کی عصمت اللہ صاحب آ دھمکے۔ فرمانے لگے یہاں جلسہ نہیں ہوسکتا۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تو ضرور تقریر کروں گا۔ مجھے تقریر سے کون روک سکتا ہے؟ مولانا نے یہ سمجھا کہ عصمت اللہ کوئی بہت ہی شریف آدمی ہے۔ آدابِ محفل سے آشنا ہے اور قانون کی پابندی اپنے پر فرض سمجھتا ہے کہ انہیں کیا معلوم کہ یہ شخص قتل کی وارداتوں میں ملوث رہ چکا ہے اور چک جھمرہ میں اس نے اپنا رعب جما رکھا ہے۔ عصمت اللہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مولانا محمد علی صاحب نے کھدر کی چادر اوڑھ رکھی تھی، چادر سے پکڑ کر نیچے اتار لیا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ سب احباب کا مشورہ یہ ہوا کہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے، جب ساتھی یہ فیصلہ کرلیں تو مولانا ضدی تو نہ تھے کہ اَڑ جاتے اور لفنگے پن کا اسی وقت خاطر خواہ جواب دیتے، جلسہ ختم ہو گیا۔ بہر حال مولانا نے عصمت اللہ سے کہہ دیا کہ یہ سودا بہت مہنگا پڑے گا۔

لیگی رہنماؤں کی بے خبری

دو دن بعد نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم کے انتخابی دورے کا پروگرام اخبارات میں شائع ہوا۔ وہ لیگی امیدواروں کے حلقہ ہائے انتخاب میں ایک ایک تقریر کرنا چاہتے تھے۔ اس پروگرام میں چک جھمرہ کا دورہ شائع ہوا تو میں دوڑا دوڑا نوابزادہ مرحوم کے پاس پہنچا۔ خٹک صاحب نے فرمایا رات زیادہ دیر تک جاگتے رہے اس لیے وہ اس وقت سو رہے ہیں۔ میں نے چک جھمرہ کے دورے کا ذکر کیا ا

Marfat.com

ورخٹک صاحب سے یہ کہہ کر چلا آیا کہ اگر نوابزادہ صاحب چک جھمرہ جائیں گے تو ہمارا اور مسلم لیگ سے ناتا ٹوٹ جائے گا۔ نوابزادہ صاحب سے اپج پیچ کے بغیر ہماری طرف سے کہہ دیجیے، اگر وہ دورہ منسوخ کر دیں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ یہ تعاون دل سے ہے اور نوابزادہ صاحب بات کے پکے ہیں۔ میں یہ کہہ کر واپس چلا آیا دو گھنٹے بعد خٹک صاحب نے مجھے فون پر کہا کہ آؤ، جلدی آؤ اور ایک خوشخبری سن جاؤ۔ کوٹھی پہنچ کر معلوم ہوا کہ چک جھمرہ کے اعلان پر نوابزادہ صاحب بہت برہم ہوئے۔ فرماتے تھے کہ دوروں کا ایسا پروگرام بنا کر بھلے لوگوں سے کیوں شرمندہ کراتے ہو؟ احرار والے کیا کہیں گے کہ لیگ کے رہنما کیسی کچی باتیں کرتے ہیں، چنانچہ دورہ صرف چک جھمرہ کا منسوخ کر دیا۔ باقی دورہ اسی طرح رہنے دیا۔ اگر سارا دورہ منسوخ کر دیا جاتا تو ہمارا کام ادھورا رہ جاتا۔ اب ہمیں عصمت اللہ کی نشست پر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ چک جھمرہ میں احرار کے پہلے جلسے کا واقعہ آپ پڑھ چکے ہیں۔

چک جھمرہ میں دوسرا جلسہ

مولوی عصمت اللہ مرزائی کی اس نامعقول حرکت کی اطلاع جب مرکز میں پہنچی تو احرار کا کیمپ تلملا اٹھا۔ احرار کے لیے اچھنبے اور حیرت کی بات تھی کہ وہ جلسہ کریں اور کوئی ہونے نہ دے۔ مرزائی بیچارے کی تو بات ہی کیا تھی۔ لاہور کے تمام کارکن اور رضا کار جمع ہوئے میٹنگ ہوئی، وہیں فیصلہ ہوا کہ چک جھمرہ میں جلسہ ہوگا اور مجھے حکم ہوا کہ صدر صاحب تم کو وہاں چل کر تقریر کرنا ہے۔ ہمارے ہاں کبھی کبھی رہنماؤں کی بجائے نوجوان سالاروں کی بھی لیڈری چل جایا کرتی ہے۔ تیاری ہوگئی۔ ایک روز پہلے اعلان ہو گیا کہ چک جھمرہ کے کھلے میدان میں احرار کا جلسہ عام ہوگا۔ تقریباً سو رضا کاروں کا دستہ ریل کے ذریعے چل پڑا۔ لائل پور (فیصل آباد) کے رضا کار اور ہمارے دوسرے معزز رفیق خواجہ جمال الدین بٹ کی سرکردگی میں چک جھمرہ کے لیے سوار ہو گئے۔ جونہی گاڑی چک جھمرہ کے سٹیشن پر پہنچی۔ سٹیشن کی فضا ختم نبوت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی، میں ابھی گاڑی ہی میں تھا کہ باہر ایک واقعہ بھی ہو گیا عصمت اللہ کے بیٹے چند غنڈوں کو ہمراہ لے کر ریلوے اسٹیشن پر فساد کی نیت سے آ گئے جب احرار رضا کاروں نے تحفظ ختم نبوت زندہ باد کا نعرہ لگایا تو مرزائیوں نے کہا ''مردہ باد''۔ ختم نبوت کے خلاف اس قسم کا نعرہ سننے کے لیے احرار کا ادنیٰ رضا کار بھی تیار نہ تھا۔ حکم ہوا ''بزن'' دونوں مرزائی

Marfat.com

پہنچا۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ سے التجائیں کیں، سب نے اسے مایوس کن جواب دیا بلکہ ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے نکالا۔ وہ مسلم لیگ کی امیدواری کے رعب میں لائل پور کے کپتان پولیس کے ہاں پہنچا۔ وہاں سے بھی ٹکا سا جواب ملا، اس کے بعد عصمت اللہ مرزائی جس نے شریف مسلمانوں کو تنگ کر رکھا تھا۔ کٹے ہوئے پتنگ کی طرح چک جھمرہ میں چکر کھاتا نظر آیا۔

یک نہ شد دو شد بلکہ سہ شد کے بعد

یعنی احرار تو یہ مطالبہ کر چکے تھے کہ کسی ایک مرزائی کو مسلم لیگ ٹکٹ نہ دے اس مطالبے کا یہ حشر ہوا کہ اکٹھے تین مرزائیوں کو مسلم لیگ کی نمائندگی کا ٹکٹ مل گیا۔ مرزائیوں نے اسی پر بس نہ کیا۔ مرزا محمود کو مغالطہ بہت کم ہوتا ہے کیونکہ سارے خاندان کے مغالطے کا حصہ مرزا محمود کے والد بزرگوار استعمال کر چکے تھے مگر اس مرتبہ مرزا محمود نے مغالطہ کھا ہی لیا۔ تین ٹکٹ مسلم لیگ کے وصول کر لینے کے بعد الیکشن کی گاڑی میں آٹھ بے ٹکٹ مرزائی سوار کرا دیئے۔ احرار کو مرزائیوں کے دوغلہ پن سے نقصان کی بجائے فائدہ ہوا۔ کام تو بڑھ گیا مگر پراپیگنڈہ بہت وزن دار ہو گیا۔ مرزائیوں کے بے اصولے پن کو بے نقاب کیا گیا تو عوام کے علاوہ مسلم لیگ کا سارا کیمپ مرزائیوں کے خلاف باتیں کہنے لگا۔ احرار کے تمام رہنما خود حضرت امیر شریعت بھی حلقہ ہائے انتخاب کا دورہ کرنے لگے۔ احرار کی بات دو طرح سے وزن دار تھی۔ سب سے بڑا اثر تو اسلام کے بنیادی عقیدے کا تھا۔ اس اثر میں دوسری کشش یہ تھی کہ احرار نے انتخاب کے میدان میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ احرار نے انتخابات سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تھا۔ اب اس خلوص اور نیک نیتی کے خلاف مرزائی کیا کر سکتے تھے۔ ان کے پاس دولت تھی۔ مرزائی حکام کا اثر تھا۔ خلافت کی دعائیں اور مرزا صاحب کے آئے دن کے عمدہ عمدہ خواب تھے۔ احرار اللہ کی خوشنودی کے لیے میدان میں اتر آئے تھے۔ وہ سنتِ صدیقؓ پر عمل پیرا ہو کر عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کرتے تھے۔ جدوجہد کا میدان کھلا تھا، جسے اللہ دے۔

مرزائیوں کے حوصلے

عصمت اللہ مرزائی، مولانا محمد علی جالندھری پر دانت پیس رہا تھا۔ اسے شاید یہ خیال ہو گا کہ یہی مولانا صاحب ہیں، جن کی وجہ سے اس کی ہوا اکھڑ گئی۔ عصمت اللہ خطرناک قسم کے لوگوں میں سے تھا اور اس کے تعلقات بھی اسی قسم کے تھے۔ مولانا محمد علی صاحب چک جھمرہ کے حلقہ انتخاب میں دورے

Marfat.com

پلیٹ فارم پر لیٹے ہائے ہائے کر رہے تھے۔ باقی غنڈوں نے جب دیکھا کہ احرار رضا کار باز کی طرح جھپٹ پڑے ہیں وہ دم دبا کر بھاگ گئے۔ میں گاڑی سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا ایک جگہ ہمارے کچھ رضا کار جمع ہو رہے ہیں۔ دریافت پر مذکورہ واقعہ معلوم ہوا تو میں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بلایا۔ ہمارا ہجوم سٹیشن سے باہر نکلا تو احرار کے چند فدائی پھولوں کے ہار بھی لے آئے۔ سلامی کے طور پر دو چار ہوائی فائر بھی ہوئے۔ عصمت اللہ کے لڑکے خدا جانے واپس چلے گئے یا وہیں رہے۔ ہم بازار سے ہوتے ہوئے جلسہ گاہ کی جانب جلوس کی شکل میں چل پڑے۔ سنا ہے کہ عصمت اللہ نے اپنے قماش کے چند ساتھیوں کو باہر سے مع رائفلوں کے بلا لیا تھا۔ انہیں بھی قریب ہی کہیں کسی مکان میں بٹھا رکھا تھا۔ ہماری سلامی میں ادھر ادھر بندوقوں سے جو فائر ہوئے تو عصمت اللہ کے وہ ساتھی بھی رفو چکر ہو گئے۔ عصمت اللہ نے تو انہیں شاید یہی کہا ہو گا کہ چند احراری مولوی آ رہے ہیں۔ ان کی ''خاطر تواضع'' کرنا مقصود ہے مگر بندوقوں نے فائر ہوئے تو وہ نو دو گیارہ ہو گئے۔ جلسہ گاہ میں کافی لوگ آ گئے کیونکہ عصمت اللہ کا رعب خاک میں مل چکا تھا۔ تاہم بہت سے لوگ اب بھی دور دیواروں پر بیٹھے تھے کہ شاید جلسے میں عصمت اللہ حملہ کرے تو دور ہی سے بھاگ نکلنے میں آسانی ہو۔ جلسہ میں تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا میں نے اُس نازیبا حرکت کے جو عصمت اللہ کی تھی، کے بڑے لتے لیے پھر اصل موضوع پر اپنی عادت کے خلاف بقول شخصے ٹھوک بجا کر تقریر کر ڈالی۔ میں نے آخر میں عصمت اللہ کو چیلنج کیا کہ تم مسلم لیگ کا ٹکٹ عیاری سے آنکھ بچا کر اٹھا لائے ہو۔ اگر تم واقعی مسلم لیگ کے امیدوار ہو تو نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب کو اپنے حلقے میں ایک گھنٹے کے لیے لے آؤ۔ اگر تم ان کو لے آؤ تو ہم ہتھیار ڈال دیں گے اور تمہارے مخالف امیدواروں سے کہیں گے کہ وہ درخواستیں واپس لے لیں۔ جلسہ بہت ہی کامیاب ہوا۔ عصمت اللہ کی ہوا اکھڑ گئی۔ اس کا رعب جاتا رہا منڈی کے آڑھتیوں نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ وہ عصمت اللہ کا نام سن کر کانپ جاتے تھے لوگوں نے عصمت اللہ کو اعتراض کر کر کے بہت زچ کر دیا۔ ہر شخص نے عصمت اللہ سے کہا کہ احرار کی بات تو سچ معلوم ہوتی ہے۔ تم اگر سچے ہو تو نوابزادہ صاحب کو لاتے کیوں نہیں؟۔ چک جھمرہ کا دورہ شائع ہو چکا تھا تم جاؤ اور انہیں کہو کہ میں مسلم لیگ کا امیدوار ہوں۔ آپ نے میرے حلقے میں دورے کا اعلان کیا تھا۔ اب اگر آپ نہ جائیں گے تو ہوا خیزی ہو گی۔ احرار نے میرے خلاف پراپیگنڈہ کر رکھا ہے۔ جاؤ اور جا کر انہیں لاؤ، ورنہ کام خراب ہے تمہیں اب کوئی ووٹ نہ ملے گا۔ عصمت اللہ دوڑا دوڑا خٹک صاحب۔ کے پاس

Marfat.com

پر نکلے وہ ایک گاؤں سے تقریر کرنے کے بعد اگلے پروگرام پر جا رہے تھے۔ انہیں راہ میں ٹھہرنا پڑا۔ عصمت اللہ اور اس کے ساتھیوں نے مولانا محمد علی صاحب کا پیچھا کیا۔ یہ لوگ جیپ یا کار میں سوار تھے اور مسلح بھی تھے۔ مولانا نے اتفاقیہ پروگرام بدلا مگر عصمت اللہ کی پارٹی نشاندہی کے مطابق دوسرے گاؤں میں جہاں مولانا کو جانا تھا، پہنچی۔ وہاں لوگوں سے دریافت کیا کہ مولوی صاحب تو نہیں آئے؟ نفی میں جواب پا کر عصمت اللہ کی پارٹی ناکام واپس ہوگئی۔ انہیں کیا معلوم کہ مولانا کو وہ راستے کے چھوٹے گاؤں میں چھوڑ آئے ہیں جب مولانا پروگرام کے مطابق بڑے گاؤں میں پہنچے تو گاؤں والوں نے بتایا کہ عصمت اللہ اپنے مسلح ساتھیوں کی معیت میں آپ کے تعاقب میں آیا تھا۔ مایوس ہو کر واپس ہوگیا ہے۔ اس طرح مولانا محمد علی کو محافظ حقیقی نے بچا لیا۔ جو خدا اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے مکڑی کے کمزور جالے سے کام لے سکتا ہے وہ خادمانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی بچا سکتا ہے؟

سیالکوٹ یعنی سر ظفر اللہ کی جنم بھومی میں دردناک واقعہ

سیالکوٹ مجلس احرار کی تحریک کشمیر کا سنٹر تھا۔ اس لیے سیالکوٹ کو اب بھی احرار کی چھاؤنی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ احرار کے جانباز ساتھی اب بھی بہتوں پر بھاری ہیں۔ غالباً 1948ء اور 1949ء کے درمیانی وقفے کی بات ہے۔ مسلم لیگ کی حکومت جوبن پر تھی۔ مسلم لیگ والوں کو ہر غیر لیگی، کیڑا مکوڑا نظر آتا تھا۔ بزرگانِ لیگ گھروں سے نکلتے ہی آدم بو، آدم بو کا ورد کرتے تھے۔ اپنی حکومت اپنا راج، مسلم لیگیوں کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ ہمارے یہ عزیز بھائی اس وہم میں مبتلا تھے کہ کسی صورت احرار کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مرزائیوں نے انہیں اس طرح بھڑکا رکھا تھا کہ توبہ بھلی، ایک روز مجھے ٹیلیفون پر سیالکوٹ سے یہ روح فرسا خبر ملی کہ شیخ عبدالکریم نائب صدر مجلس احرار کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری سے شہر میں ہراس پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ عبدالکریم کے گھر سے ٹرانسمیٹر پکڑا گیا ہے اور یہ کہ وہ ہندوستان سے نامہ پیام کر رہا تھا۔ لیگیوں اور عام شہریوں کا ایک ہجوم عبدالکریم کے مکان پر جمع ہوگیا۔ پولیس نے اس کو گرفتار کر لیا۔ لوگوں نے شیخ عبدالکریم کا منہ کالا کیا، تھوکا، مارا پیٹا اور جانے کیا کچھ کیا۔ قارئین کرام اندازہ تو لگائیں۔ اس ٹرنک کال سے میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ میرے دل پر کیا گزری ہوگی؟ مجھ کو یقین تھا کہ یہ تہمت ہے۔ جھوٹا الزام ہے۔ میرے عزیز ساتھی کو محض جماعتی تعصب

Marfat.com

کی وجہ سے ذلیل کیا گیا ہے۔ میں نے فون پر جواب دیا کہ میں پہلی گاڑی سے آ رہا ہوں۔ جلسہ عام کا اعلان کرو۔ میں تقریر کروں گا۔ میں سیالکوٹ اسی شام پہنچ گیا۔ لوگ سہمے ہوئے تھے۔ ساتھی پریشان تھے۔ شیخ عبدالکریم نہایت نیک اور بہت ہی شریف ساتھی ہے۔ اس کا بھائی عبداللہ مرحوم تقسیم کے وقت فسادات میں شہید ہو گیا تھا۔

رام تلائی میں جلسۂ عام

رات کو رام تلائی کی جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لیگی اور احراری دونوں آ گئے۔ سیالکوٹ جی دار لوگوں کی بستی ہے۔ یہاں کا مسلمان بڑا بہادر ہے، احرار سے انہیں محبت ہے۔ ایک وقت تھا جب سارا شہر احراری تھا۔ واقعہ یہ نہ تھا جو مشہور کیا گیا۔ ٹرانسمیٹر کا افسانہ قطعاً جھوٹا تھا، ایک شریف مسلمان کو اسی دھوکے میں منہ کالا کر کے بازار میں گھسیٹا گیا۔ اس واقعے سے میرے دل کو صدمہ تھا۔ میں نے اس جلسے میں حکومت اور مسلم لیگ دونوں کو خطاب کیا اور کہا کہ احرار کہلانا اگر جرم ہے تو ایک شہر کے نائب صدر کا کیا قصور ہے۔ میں ان سب کا صدر ہوں اور حاضر ہوں۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس طرح احراریوں کو بازار میں گھسیٹنا، مارنا، پیٹنا اگر پاکستان کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے تو میں خود کو پیش کرتا ہوں۔ جو سلوک عبدالکریم سے کیا گیا ہے، مجھ سے بھی کرو۔ میں کہہ دیتا ہوں کہ مجھے مار بھی دو گے تو میرے وارث یا مجلس احرار تم پر دعویٰ نہ کرے گی۔ پاکستان ہماری جانوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اسے بہر حال مضبوط ہونا چاہیے۔ جلسہ گاہ میں شریف اور سمجھدار مسلم لیگیوں نے بھی توبہ توبہ کرنا شروع کی۔ مجھے اس ایک واقعے کی فکر نہ تھی۔ میرے پاس مختلف مقامات سے اطلاعات آ رہی تھیں کہ احرار کارکنوں کی فہرستیں تیار ہو رہی ہیں۔ مسلم لیگ کی حکومت مہاجروں کو آباد کرنے کی بجائے احرار کو برباد کرنے کی فکر میں گھلی جا رہی تھی۔ اس واقعے کے بعد میں نے ذمہ دار افسران اور اعلیٰ حکام سے تبادلۂ خیال کیا اور انہیں سمجھایا کہ مسلم لیگ کے اقتدار کا نشہ چار دن بعد اُتر جائے گا۔ احرار وطن کے خادم ہیں۔ انہیں بیگانہ وار دیکھنا اچھا نہیں، یہ ناانصافی اور ظلم ہے اور ظلم کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔

دوسرا واقعہ

احرار کی تبلیغ کانفرنسیں مرزائیت کے زہر کا تریاق ثابت ہوئیں۔ مرزائیت بے نقاب ہونے لگی۔ اس عرصے میں مرزا محمود نے صلاح مشورے کیے۔ ان مشوروں میں مرکزی کھونٹے کا سہارا بھی لیا گیا۔

Marfat.com

بالآخر مرزائیت لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر آئی یعنی مرزا محمود نے کھلے بندوں مرزائیت کی تبلیغ کا فیصلہ کرلیا۔

سیالکوٹ میں مرزائیوں کا جلسۂ عام

مسلمانوں کے لیے یہ اعلان باعثِ حیرت واستعجاب تھا۔ خصوصاً سیالکوٹ کے جیالے مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ ان کی غیرتِ اسلامی کو چیلنج کیا گیا ہے مگر مرزا محمود نے بہت ہوشیاری سے کام لیا۔ جلسے کی پشت پناہی مرزا محمود ربوہ سے خود کر رہا تھا۔ مرکز میں سر ظفر اللہ کی ہمدردیاں موجود تھیں۔ آپ اندازہ تو لگائیے کہ جلسے کے لیے کس شہر کو منتخب کیا گیا؟ ظفر اللہ خان دُہرے جذبے سے سرشار ہوں گے ایک تو یہ کہ مرزائیت کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں اتر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ جلسہ ان کی جنم بھومی میں ہو رہا ہے چنانچہ ربوہ (چناب نگر) میں فیصلہ ہوا کہ صدارت کے فرائض سر ظفر اللہ کے چھوٹے بھائی اسد اللہ خان انجام دیں گے۔

غالباً جنوری 49ء کا ذکر ہے جب گوجرہ ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں احرار کی تبلیغ کانفرنس ہو رہی تھی۔ ہمیں وہیں کانفرنس کے پنڈال میں معلوم ہوا کہ سیالکوٹ میں مرزائی جلسہ عام کر رہے ہیں۔ الٰہی اب کیا ہوگا؟ یہ کیسا پاکستان ہے کہ جس میں برسرِ عام ''لا نبی بعدی'' کے ارشاد کو جھٹلایا جائے گا۔ ہم سخت پریشان ہوئے، ہمیں گوجرہ ہی میں مرزائیوں کا پوسٹر دکھایا گیا۔ جس میں مسلمانوں کو جلسۂ عام میں شمولیت کی دعوت کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا۔ اس جلسہ میں ختم نبوت کا اقرار اور اعلان کیا جائے گا۔ ختم نبوت پر ہی تقریریں ہوں گی۔ اس پوسٹر کے جواب میں سیالکوٹ کے احرار نے اعلان کیا کہ دعوت منظور ہے۔ اگر مرزائی واقعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مانتے ہیں تو چشمِ ما روشن دلِ ماشاد اور اگر یہ بات غلط ہے اور مرزائیوں نے منافقت سے کام لیا تو احرار اس کا جواب دیں گے یہ پوسٹر بھی مرزائیوں کے پوسٹر کے برابر چسپاں ہو گئے۔ شہر میں ایک ہلچل ہوئی اور یہ قدرتی بات تھی۔

مرزائیوں کی طرف سے فساد کا پروگرام

مرزائیوں نے اعلان کیا کہ کوئی عورت جلسے میں نہ آئے مرزا محمود نے ''الفضل'' کے ذریعے تمام اضلاع کے مرزائیوں کو کہلا بھیجا کہ سیالکوٹ چلے آؤ چنانچہ جلسے کے دن کبوتروں والی مسجد سے مرزائیوں کا بہت بڑا ہجوم لاٹھیوں، تلواروں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر مظاہرہ کرتا ہوا نکلا تاکہ سیالکوٹ

Marfat.com

میں ہراس پھیل جائے۔لوگ مرعوب ہوجائیں اس طرح یہ ''غازیانِ'' مرزائیت دندناتے ہوئے جلسہ گاہ میں پہنچے۔اس جلسہ گاہ کے ایک کنارے پر زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے ڈسپنسری کھولی گئی جس میں فرسٹ ایڈ کا تمام سامان موجود تھا۔اس ڈھنگ سے مرزائیوں نے پاکستان میں تبلیغِ مرزائیت کا افتتاح کیا۔

جلسہ شروع ہوا

اسد اللہ خان برادر ظفر اللہ خان نے کرسی صدارت کو ''زینت بخشی'' اور قادیانی مناظر اللہ دتہ جالندھری نے تقریر شروع کی۔جب اللہ دتہ جالندھری نے یہ کہا کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تو ختم ہوگئی۔اب غلام احمد کی نبوت جاری ہے تو جلسہ گاہ کے ایک کنارے سے حافظ محمد صادق رہنماء مجلس احرار سیالکوٹ نے اعتراض کیا اور فرمایا کہ اللہ دتہ صاحب آپ نے اس جملے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے۔آپ تو کہتے تھے اور آپ نے پوسٹر میں لکھا بھی کہ آپ ختم نبوت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔اب آپ منافقت سے کام لے رہے ہیں۔مسلمانوں نے جلسہ میں بیک زبان حافظ صاحب کی تائید کی۔صدر جلسہ اسد اللہ خان نے کہا کہ: نہیں سننا چاہتے ہو تو جلسے سے چلے جاؤ۔حافظ صاحب نے کہا کہ آپ نے دعوت دے کر مسلمانوں کو بلایا۔اب آپ کہتے ہو کہ چلے جاؤ۔آپ نے ہمیں جلسہ عام میں بلا کر بے عزتی کی ہے۔ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک مسلح مرزائی نے ایک مسلمان پر چاقو سے حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ایک اور مرزائی نے لاٹھی چلائی جس سے ایک اور مسلمان زخمی ہوگیا۔

سٹی مجسٹریٹ اور پولیس گارڈ کی آمد

اتنے میں سٹی مجسٹریٹ اور پولیس بھی آموجود ہوئی۔حافظ صاحب نے مجسٹریٹ صاحب سے کہا کہ ان لوگوں نے یہ جلسہ محض فساد کے لیے منعقد کیا ہے۔ان کے ارادے بد ہیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر توہین کرتے ہیں۔آپ اس جلسے کو بند کرا دیجیے۔بڑی ردوکد کے بعد جلسہ بند کر دیا گیا مگر حافظ محمد صادق، سالار بشیر، عبدالغفور بٹ اور عبدالمجید رضا کار کو گرفتار کر لیا گیا۔فضا ختم نبوت زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ان گرفتاریوں پر سیالکوٹ میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی مگر احرار کارکنوں اور رضا کاروں نے رات بھر پہرا دیا۔لوگوں کو صبر کی تلقین کی۔مرزائیوں کی یہ سکیم کہ وہ شہر بہ شہر جلسہ عام میں مسلمانوں کو مرتد کرنے کی کوشش کریں گے ناکام ہوگئی۔سیالکوٹ کے احباب نے گربہ کشتن روز

Marfat.com

اوّل کے مصداق پہلے ہی جلسے میں مرزائیوں کی عیاری اور منافقت کو بے نقاب کر دیا۔

تیسرا واقعہ

انتخابی مہم شروع ہوئی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا۔ تین مرزائی تو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ آٹھ مرزائی بے ٹکٹ یعنی مرزائیت کے ٹکٹ پر کھڑے ہو گئے۔ احرار کو گیارہ حلقوں میں کام کرنا پڑا۔ لائل پور اور سیالکوٹ میں مقابلہ سخت تھا۔ سیالکوٹ میں سر ظفر اللہ خان کے ہم زلف شاہنواز صاحب، خان بہادر مشتاق احمد مسلم لیگی امیدوار کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ شاہنواز صاحب کو پاکستان میں دولت کمانے کا خوب موقع ملا۔ کچھ دولت کا بھروسہ، کچھ ہم زلف کا سہارا۔ ان میاں صاحب نے اپنی علاقے میں خوب اودھم مچایا۔ اس علاقے میں ہمیں کئی ایک جلسے کرنے پڑے۔ ایک جلسے میں صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب، مولانا محمد حیات صاحب اور مجھے شامل ہونے کا موقع ملا۔ یہاں شاہنواز کے بھائی اپنے ساتھیوں کو لے کر آ دھمکے۔ وہ بار بار پستول دکھاتے تھے۔ علاقے کے مسلمان ان سے مرعوب تھے، جس گھر میں ہم ٹھہرے تھے۔ وہ مسلمانوں کا گھر تھا۔ ان کے رشتہ دار مرزائی تھے۔ یہی شاہنواز اُن کی برادری والے تھے۔ دیہاتوں میں برادریوں کا سلسلہ بہت چلتا ہے۔ صاحبِ خانہ نے ہمیں کہا کہ آپ اب جلسہ ملتوی ہی کر دیں۔ جلسہ گاہ میں گڑبڑ کے بعد دیہاتیوں کی آپس میں چلنے لگی مگر ہم نے انہیں لڑنے نہیں دیا۔ شاہنواز کے بھائی نے صاحبزادہ صاحب کو بھی مرعوب کرنا چاہا۔ اس روز ہمیں معلوم ہوا کہ صاحبزادہ صاحب کے سینے میں کتنا بہادر اور جرّی دل ہے۔ مرزائی پستول دکھا رہا تھا، صاحبزادہ صاحب حقارت کی ہنسی سے اسے ذلیل کر رہے تھے۔ مڈبھیڑ نہ ہوئی، معاملہ رفع دفع ہی ہو گیا۔ جلسہ برخاست کرتے ہوئے ہم نے وہیں اعلان کیا کہ یہاں چند روز بعد پھر جلسہ ہو گا جسے جلسہ الٹنا ہے یا زور آزمائی کرنا ہے، اسے چوکنا رہنا چاہیے۔ اس روز ضرور آ جائے ہم نے باقاعدہ دن بہ تاریخ اور وقت کا اعلان کر دیا۔ اس عرصہ میں ہم نے اردگرد کے دیہاتوں میں جلسے کر کے بے پناہ پراپیگنڈہ کیا چنانچہ تاریخ مقررہ پر جب دوبارہ اسی گاؤں میں جلسہ ہوا، جہاں مرزائیوں نے دھاندلی مچائی تھی تو ہجوم اس قدر تھا کہ لوگ دور دور تک کھیتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس تاریخی جلسہ میں شمولیت کے لیے دس دس میل کے فاصلے سے لوگ کافی تعداد میں آ گئے۔ سیالکوٹ کے احرار کارکن اور رضا کار بھی پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے مسلمان گروہ در گروہ نعرے لگاتے ہوئے آ

Marfat.com

رہے تھے۔ مرزائی دیکھنے کو نظر نہ آئے۔ ان کی تمام کروفر ختم ہوگئی۔ جلسہ بہت ہی کامیاب ہوا اس جلسے کی کامیابی کے بعد مرزائیت کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ احرار نے مرزائیت کے خلاف ٹھوس پراپیگنڈے کے لیے پروگرام بنایا۔ احرار کے لیے فضا سازگار ہوتی چلی گئی۔ بعض حلقوں سے مطالبہ ہوا کہ احرار کے نمائندے اسمبلی میں ضرور جانے چاہئیں مگر احرار نے صاف انکار کیا اور بار بار اعلان کیا کہ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق مرزائیوں کو نہ سونپا جائے یہ غیر مسلم ہیں۔

دو اہم گرفتاریاں

شیخ حسام الدین صاحب احرار کے مسلم جرنیل ہیں۔ وہ جس قدر صاف دل ہیں۔ اسی قدر سخت مزاج بھی ہیں۔ طبیعت بے دریغ ہے جو دل میں ہو، وہی زبان پر آتا ہے اور ضرور آتا ہے۔ دنیا انصاف سے کام لے تو یہ بہت بڑا وصف ہے۔ اعلیٰ درجے کی خوبی ہے۔ مومن کی بہترین نشانیوں میں سے ایک ہے مگر آج کل دنیا اس کی متحمل نہیں۔ یہ سیاسی منافقت کی دنیا ہے شیخ صاحب مسلم لیگ کے بارے میں اپنے خیالات اور رویے کو چھپا کر نہ رکھتے تھے۔ وہ جو کچھ پرائیویٹ صحبتوں میں کہتے تھے، اسے جلسہ عام میں بھی ضرور کہتے تھے۔ سچی بات لیگی لیڈروں کی طبیعت پر گراں گزری۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب مجلس احرار زیرِ عتاب تھی اور مسلم لیگ کا طوطی بولتا تھا۔ عوام انہی مسلم لیگیوں کو، جنہیں آج برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ فرشتوں سے کم نہ سمجھتے تھے۔ مجلس احرار پاکستان کے سیکرٹری صاحبزادہ سید مخدوم شاہ بنوری لاہور میں قیام فرما تھے۔ بھارت میں ان کے کاروبار کی شاخ موجود تھی۔ وہ اکثر دہلی آیا جایا کرتے تھے۔ مخدوم شاہ صاحب بہت ہی کم گو مگر بہت ہی ذہین اور باعمل انسان ہیں۔ وہ بڑے بہادر نوجوان ہیں۔ پیر ہونے کے باوجود وہ پیری مریدی سے بھاگتے رہے۔ مجاہدانہ سیرت کے سید ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ قبائل کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگیں بھی لڑتے رہے ہیں۔ فقیر اپی تک سے ان کی واقفیت ہے۔ تقدیر انہیں کوہاٹ سے لاہور لے آئی۔ یہاں احرار کے مرکز کے علاوہ ان کا اپنا کاروباری دفتر بھی موجود تھا۔ مخدوم شاہ صاحب ہمارے سیاسی کام میں بہت کم ہاتھ بٹاتے تھے۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کے بارے میں ان کی رائے بھی اچھی نہ تھی مگر چونکہ وہ مقرر نہ تھے اور یوں بھی کم گو تھے اس لیے کسی کو موقع نہ تھا کہ ان پر فضول اتہامات چپکا سکے۔ مسلم لیگ کی اپنی حکومت تھی، اپنا راج تھا، حکم ہوا، ان دونوں احرار لیڈروں کو پکڑ لو۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان دونوں کا بھارت آنا جانا ہے۔ یہ

Marfat.com

بھارت کے جاسوس ہیں۔اس حکم کی تعمیل ہوئی۔دونوں حضرات یعنی شیخ صاحب اور سید مخدوم شاہ بنوری جیل بھیج دیئے گئے، یہی نہیں کہ دو بے گناہوں کو پکڑا گیا۔اس سے آگے یہ ہوا کہ احرار کے خلاف مسلم لیگ کے کیمپ سے طوفان بدتمیزی اٹھا، گلی کوچے میں یہ پراپیگنڈہ ہوا کہ احرار وطن کے غدار ہیں۔کسی مُنصف مزاج کو یہ توفیق نہ ہوئی جو مسلم لیگی حکومت سے یہ پوچھتا کہ ان دونوں نے کیا غداری کی ہے؟ میں نے ''آزاد'' میں ایک اداریہ لکھا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں صلاح مشورہ سے کرتے ہیں۔اگر یہ دو ذمہ دار احرار لیڈر غدار ہیں تو اس غداری میں ہم سب کو شامل کیجیے۔ہمیں آپ نے کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ نواب خان افتخار حسین ممدوٹ صاحب کی حکومت تھی۔نواب صاحب بہت بھلے آدمی ہیں۔ملاقات ہو جائے تو اخلاق سے پیش آتے ہیں۔بات معقول کرتے ہیں، خاندانی شرافت بدرجہ اتم موجود ہے گو آج کل وہ بہت کچھ بدل چکے ہیں۔تاہم بہت غنیمت انسان ہیں۔ہم نے نواب صاحب موصوف کے ہاں دستک دی، ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو عرض کیا: حضور نواب صاحب! میرے دو شریف ساتھیوں کو آپ نے بلاوجہ پکڑ لیا ہے۔میں دریافت کرنے آیا ہوں ان کا کیا قصور ہے؟ اگر وہ غدار ہیں اور واقعی بھارت کے جاسوس ہیں تو انہیں چوراہے میں کھڑا کر کے گولی مار دیجیے اور لاشوں کو وہیں پڑا رہنے دیجیے، تاکہ دیکھنے والے عبرت پکڑیں اور اگر یہ غدار نہیں اور یقیناً نہیں تو حضور والا انہیں چھوڑ دیجیے۔حکم ہوا، ہم تحقیقات کریں گے، کیا معاملہ ہے؟ میں واپس چلا آیا اور میں نے اپنے محولا بالا خیالات کا ''آزاد'' کے ذریعے اعلان کیا اور حکومت کی ناانصافی کو کھلم کھلا چیلنج کیا۔بعض اخبارات نے میری تائید کی۔میں نے مقالے لکھے۔کچھ دنوں صبر سے انتظار کیا، جب دیکھا کہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا، میری درخواست سرد خانے میں محفوظ ہوگئی۔تب میں نے پھر حوصلہ کیا اور نواب صاحب سے پھر درخواست کی۔وہ فرمانے لگے، تحقیقات ہو رہی ہیں۔میں انہیں چھوڑ دینا چاہتا ہوں، اطمینان ہو جانے دیجیے دو چار دن کی بات ہے چنانچہ مجھے دو چار دن بعد حاضر ہونے کی گنجائش نکل آئی۔میں پھر حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ کاغذات منگوائے ہیں۔ابھی کاغذات آئے نہیں۔میں نے عرض کیا۔میں دریافت کر جایا کروں؟ حکم ہوا، بڑی خوشی سے آؤ۔جیسا کہ میں نے عرض کیا نواب صاحب بڑے ملنسار اور خلیق انسان ہیں۔مجھے روزانہ حاضری کا پاسپورٹ مل گیا۔تقریباً تین ساڑھے تین مہینے نہ میں نے تھکن محسوس کی اور نہ نواب صاحب کے ماتھے پر بل آیا۔میں نے ایک روز تنگ آ کر نواب صاحب سے عرض کیا کہ نواب صاحب اگر آپ میرے رفیقوں کو رہا نہ کر سکتے ہوں تو مجھے جواب دے دیجیے۔وہ

Marfat.com

فرمانے لگے پولیس روڑے اٹکا رہی ہے۔ یہ سنا تو میں نے پولیس کا دروازہ جا کھٹکھٹایا، میاں انور علی (آئی جی) سے ملا تو معلوم ہوا کہ مثل نواب صاحب کے پاس ہے۔ میں پھر نواب صاحب کے ہاں حاضر ہوا تو وہ فرمانے لگے کہ مثل ابھی نہیں آئی میں نے بیچ کا پردہ ہٹا دیا اور عرض کیا کہ حضور میں دریافت کر آیا ہوں۔ میاں صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے مثل سفارش کر کے بھی بھیج دی ہے کہ انہیں رہا کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ نواب صاحب بہت مشتعل ہوئے اپنے سٹینو کو بلایا اور غصے میں فرمایا کہ رہائی کا قصہ تو بعد میں ہوگا، پہلے انور علی سے تو نپٹ لوں۔ میں نے نواب صاحب سے عرض کیا کہ حضور آپ بعد میں جو دل چاہے کیجیے گا۔ پہلے رہائی کا حکم تو دیجیے۔ میں نے نواب صاحب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل حقیقت آشکار ہو جانے سے کچھ ندامت محسوس کر رہے تھے۔ بہر حال کارندوں کو حکم ہوا کہ مثل کی تلاش کرو مجھے روزانہ حاضری دینا پڑی۔ جماعت زیر عتاب تھی۔ قوم نشے میں تھی۔ حاکم بدمست تھے۔ ایسے میں اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں اپنے رفیقوں کو جس طرح ہو سکے۔ جیل سے باہر لاؤں سب کو علم ہو چکا تھا کہ دونوں احرار رہنما بے قصور ہیں۔

شیخ صاحب جیل میں بیمار پڑ گئے

میانوالی جیل سے اطلاع ملی کہ شیخ صاحب بیمار ہیں شیخ صاحب کے بھائی صاحبان اور ان کا بچہ کلیجہ پکڑے میرے پاس پہنچے اور مجھے تار دکھائی۔ میں دوڑا دوڑا نواب صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ نواب صاحب نے مجھے اندر کمرے میں بلا لیا، چائے آ گئی۔ چائے کی پیالی میری طرف بڑھا کر نواب صاحب فرمانے لگے لو ماسٹر صاحب چائے پیو۔ میں نے انکار کیا۔ وہ فرمانے لگے۔ کیوں میں نے تار نکال کر چائے کی میز پر رکھ دی اور ساتھ ہی ان سے عرض کیا کہ یہ چائے میرے لیے لہو کے گھونٹ ہیں۔ میرا عزیز رفیق آپ کی جیل میں بیمار ہے۔ یہ چائے کیسے پیوں؟ نواب صاحب نے اسی وقت سٹینو کو بلایا۔ حکام جیل سے دریافت کیا کہ شیخ صاحب کی خیریت کی اطلاع دو، مجھے فرمایا کہ دو دن کے اندر انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ یہ دو دن بھی گزر گئے۔ اس کے بعد میں نے خود پتہ چلا لیا کہ مثل کہاں ہے؟ معلوم ہوا سٹینو کے کمرے میں مثلوں کے انبار لگے ہیں۔ انہیں مثلوں میں ہماری تقدیر دبی پڑی ہے۔ بہر حال سٹینو کو ڈانٹ بھی پلوائی اور تلاش میں اس کا ہاتھ بھی بٹایا۔ ایک روز مثل مل گئی۔ رہائی کے احکامات جاری ہوئے اور ہمارے بے گناہ ساتھی چار مہینے جیل کی ہوا کھا کر واپس آئے۔ مسلم لیگ کو

Marfat.com

پھر بھی لوگ زندہ باد کہتے رہے۔ احرار کو تب بھی مردہ باد کہا گیا۔

شیخ صاحب اور مخدوم شاہ صاحب کی گرفتاری کا واقعہ اس وقت عمل میں آیا جب مجلس احرار پر عتاب نازل تھا۔ ان کی رہائی کے دن ہم وہ عظیم الشان کانفرنس منعقد کر رہے تھے جس میں احرار نے سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کیا۔

بلا مقابلہ نشستوں کی پیشکش

کسی مسلم لیگی دوست نے انتخابات کے بارے میں مجھ سے تبادلہ خیال کیا۔ باتوں باتوں میں یہ بحث چل نکلی کہ احرار کتنی نشستیں حاصل کر سکتے ہیں؟ میں نے چند حلقوں کا حوالہ دے کر کہا کہ ان نشستوں پر لیگی اور مرزائی دونوں مل کر بھی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ بحث دوستانہ انداز میں بے تکلفی سے ہو رہی تھی۔ بات کو پر لگے۔ وہ مسلم لیگ کیمپ تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ بن گئی۔ خان لیاقت علی خان مرحوم کی موجودگی میں مشورہ ہوا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ احرار سے دریافت کر لیا جائے کہ وہ کون کون سی سیٹ چاہتے ہیں۔ مسلم لیگ وہاں سے اپنا امیدوار واپس لے لے گی۔ احرار کو بلا مقابلہ کامیابی حاصل ہو سکے گی۔ میر خلیل الرحمٰن صاحب زبانی گفتگو کے لیے میرے پاس تشریف لائے۔ وہ بے انتہا شریف اور مخلص ترین مسلم لیگی ہیں۔ ان کا ایک خاص ذہن ہے۔ میرے دل میں ان کا بے حد احترام ہے۔ وہ عمدہ تمہید کے بعد فرمانے لگے کہ اب بے تکلفی سے فرما دیجیے کہ کس کس سیٹ پر آپ کی نگاہ ہے؟ میں نے انہیں کہا کہ آپ نے ہم کو ابھی تک سمجھا نہیں۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ ہم تو اپنے سامنے صرف ایک مقصد رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مرزائی کو کامیاب نہ ہونے دیں۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں۔ میر صاحب نے فرمایا کہ ہمیں اس قسم کی اطلاع ملی تھی کہ احرار کچھ سیٹوں کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ یہ انہیں ملنی چاہئیں۔ میں نے اس بے تکلفی کی بحث کا ذکر کرنے کے بعد معاملے کو ختم کر دیا۔ میر صاحب دوسرے دن پھر تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ صاحبزادہ فیض الحسن صاحب اگر پسند فرمائیں اور بتا دیں کہ وہ کس سیٹ پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔ ہم وہ سیٹ خالی کر دیں گے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ صاحبزادہ صاحب ہرگز کوئی سیٹ قبول نہ فرمائیں گے۔ وہ ہمارے مخلص رفیق ہیں جب ہم نے فیصلہ ہی کر لیا ہے کہ الیکشن میں حصہ نہیں لینا تو اب کسی سیٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تاہم میں صاحبزادہ صاحب سے دریافت کر لیتا ہوں، انہیں لاہور بلواتا ہوں وہ انشاء اللہ کل تشریف لے

Marfat.com

آئیں گے۔ دوسرے دن صاحبزادہ صاحب لاہور تشریف لے آئے، میں نے ان سے سارا واقعہ فرمایا وہ فرمانے لگے کہ آپ نے کیا جواب دیا؟ میں نے عرض کیا تھا کہ صاحبزادہ صاحب کل تشریف لے آئیں گے، ان سے دریافت کرلیا جائے گا۔ صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ آپ کو انہیں اس وقت صاف جواب دے دینا چاہیے تھا۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہ خود نشستیں حاصل کرنے کے لیے نہیں کر رہے۔ ہمارا ایک ہی مقصد ہے جس کا ہم بار بار اعلان کر چکے ہیں میں نے صاحبزادہ صاحب کو ٹٹولا اور عرض کیا کہ صاحبزادہ صاحب آپ کو بلا مقابلہ سیٹ مل جائے گی حکم فرمائیں تو آگے بات کروں۔ صاحبزادہ صاحب نے سوچ کر فرمایا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایک سیٹ ہو یا سو سیٹیں خالی ملیں تو بھی قبول نہ ہوں گی۔ صاحبزادہ صاحب کی گفتگو سے میرا دل بے حد مطمئن ہوا۔ میرے دل میں ان کا احترام اور زیادہ ہو گیا۔ لوگ سیٹوں کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں اور مختلف چولے بدلتے ہیں؟ میں نے میر صاحب سے عرض کیا کہ صاحبزادہ صاحب انکار فرما گئے ہیں قصہ ختم ہو گیا۔

یوم تشکر

انتخابات ختم ہو گئے تو نتیجے کے انتظار میں خون خشک ہونے لگا۔ ہر امیدوار امید لگائے بیٹھا تھا، مسلم لیگ خوش اور مطمئن تھی۔ مسلم لیگ کے مخالف ہراساں تھے۔ مسلم لیگ کی اپنی حکومت تھی اس لیے مسلم لیگ کی ''دعاؤں'' میں بڑا اثر تھا۔ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ان زود اثر دعاؤں پر بھروسہ اور یقین بھی تھا۔ ہمارا اپنا کوئی امیدوار نہ تھا مگر انتخابات کے نتیجے پر احرار کی نگاہیں اسی طرح لگ رہی تھیں۔ جس طرح 302 کے بے گناہ ملزم کے ورثا آخری عدالت کا فیصلہ سننے کے لیے مضطرب ہوں۔ مرزائیوں کی کیفیت یہ تھی کہ وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بھی کھڑے تھے اور اس کے علاوہ بھی چند نشستوں پر مقابلہ کر رہے تھے۔ مرزا محمود اور اس کے حالیوں موالیوں کی پوری قوت اور توجہ انتخابات پر مرکوز تھی۔ قادیانی دولت، اثر و رسوخ اور بے پناہ پراپیگنڈہ کیا گیا۔ وہ بھی ہماری طرح انتخابات کے نتیجے کو موت و حیات کا فیصلہ سمجھے ہوئے تھے۔ انتظار کی گھڑیاں گنی جا رہی تھیں۔ جوں توں کر کے وقت گزر گیا۔ نتیجے نکلنے شروع ہوئے تو احرار کی توجہ مرزائی سیٹوں پر مرکوز تھی۔ انہیں اس سے کوئی واسطہ نہ تھا کہ دوسری سیٹوں پر کیا ہوتا ہے۔ پہلا نتیجہ بہت ہی دل خوش کن تھا، یعنی ایک مرزائی امیدوار کی ضمانت ضبط ہو گئی۔ احرار نے سجدہ شکر ادا کیا۔ یکے بعد دیگرے نتیجوں کا اعلان ہوتا رہا۔ الحمدللہ کہ تمام سیٹوں پر مرزائی

Marfat.com

امیدوار خواہ وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر تھے، یا آزاد ممبر کی حیثیت سے کھڑے ہوئے تھے، ہار گئے یعنی مرزائی سو فیصد شکست کھا گئے اور احرار سو فیصد کامیاب ہوئے۔ مجلس احرار کی طرف سے اعلان ہوا کہ یوم تشکر منایا جائے گا۔ لاہور والوں نے احرار کے یوم تشکر کا شاندار نظارہ دیکھا ہے کہ احرار رضا کاروں نے کس سج دھج سے میدان میں قدم رکھا۔ کانفرنس کا کتنا بڑا پنڈال تھا اور لوگوں کا کتنا بڑا اجتماع تھا! یہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے ضبط تحریر میں لانا کم از کم میرے بس کی بات نہیں۔ مسلمانوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ مساجد میں دعائیں مانگی گئیں۔ غرض یہ کہ مرزائیت کی اس نچلی شکست نے ختم نبوت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ مرزائیوں پر اوس پڑ گئی۔ اقتدار میں حصہ دار ہوتے ہوئے بھی وہ فقیروں اور بے نواؤں کے گروہِ احرار سے بُری طرح شکست کھا گئے۔ غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخروئی نصیب ہوئی اور باغیانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم خائن و خاسر ہوئے۔

تحریک تحفظِ ختم نبوت

دوسرا دور

فتح و کامرانی کے نشے میں جو قوم غافل ہو کر بیٹھ جائے، اس کی فتح کچھ عرصہ بعد شکست میں بدل جایا کرتی ہے۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ احرار اس حقیقت سے باخبر تھے۔ فیصلہ ہوا کہ بنیادی عقیدے کی تبلیغ کا وسیع جال بچھا دیا جائے تاکہ پاکستان میں مرزائیت کے پنپنے کی تمام راہیں مسدود کر دی جائیں۔ تبلیغ کے لیے زیادہ سے زیادہ مبلغوں کی ضرورت اور تبلیغی نظام کے لیے کافی روپیہ درکار تھا۔ حضرت شاہ صاحب خدا انہیں مکمل صحت عطا کرے۔ اٹھے، دورہ شروع کیا شہر بہ شہر اور قریہ قریہ گھومے پھرے، کراچی تک پہنچے۔ تحفظ ختم نبوت کے لیے دامن پھیلایا۔ الحمدللہ کہ بامراد واپس آئے۔ مبلغوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ مولانا غلام غوث، صاحبزادہ سید فیض الحسن، مولانا محمد علی جالندھری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے علاوہ مولانا لال حسین اختر اور مولانا محمد حیات ایسے بلند پایہ مقرر اور مناظر پہلے سے موجود تھے۔ اب دوسرے مبلغوں کا اضافہ ہوا تو کام وسیع ہو گیا۔ اخراجات بھی بڑھ گئے۔ مولانا محمد علی جالندھری اعلیٰ درجے کے منتظم ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ادارہ کس طرح چلایا جاتا ہے۔ ضابطے کی پابندی ان کی عادتِ ثانیہ ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی ضابطے کی پابندی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تبلیغی ادارے کو مولانا کے مضبوط ہاتھوں نے سنبھال لیا۔

Marfat.com

تبلیغ کانفرنسوں کا ملک بھر میں وسیع جال بچھ گیا۔ مرزائیت کے مذہبی اور سیاسی پہلو بے نقاب ہونے لگے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہم مرزائیت کی راہ روک کر کھڑے ہو گئے ہیں مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے مرزائیت غوطہ لگا کر دوسرے کنارے کھڑی نظر آتی تھی۔ ہم نے کھلے میدان میں کام شروع کیا۔ مرزائی سرکاری ملازم، سرکاری دفاتر میں مرزائیت کا لٹریچر پہنچانے لگے۔ مثلاً کسی محکمے میں اگر ہیڈ کلرک یا سپرنٹنڈنٹ مرزائی ہے تو وہ اپنی میز پر ''الفضل'' کے علاوہ تبلیغی لٹریچر بھی موجود رکھتا تھا۔ ماتحتوں میں اسے بڑی خوبصورتی سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ بیچارے ماتحت مسلمان کلرک، افسر اعلیٰ کو خوش رکھنے کے لیے رواداری سے کام لیتے اور لٹریچر پڑھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ پڑھے لکھے مسلمان جو اپنے مذہب سے پوری واقفیت نہ رکھتے تھے۔ مرزائیوں کے چکر میں آ جاتے، بعض ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ ربوہ (اب چناب نگر) کے سالانہ اجتماع پر مرزائی سرکاری ملازم، مسلمان ملازموں کو بڑی ترکیبوں سے اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔ لوگ پلے سے دام خرچ کر کے سرکس دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تو کرایہ، رہائش اور خورد و نوش کے علاوہ بھی بہت کچھ مفت میسر تھا۔ بعض بدنصیب اسی چکر میں پھنس جاتے تھے۔ احرار کو ہر ہر گوشہ پر نگاہ رکھ کر کام کرنا پڑا۔ اس طرح اسلام اور مرزائیت کی کشمکش تیز ہو گئی۔ حد یہ ہے کہ احرار کو اس قدر محنت کرنا پڑی کہ ہفتے میں کانفرنس یا جلسے کے بغیر ایک دن بھی خالی نہ رہا، یہ تو ہوا کہ ایک دن میں دو کانفرنسیں یا دو جلسے ہو گئے مگر ایسا دن شاذ ہی آیا ہو گا۔ جس دن صوبے کے کسی شہر یا قصبے میں جلسہ یا تبلیغ کانفرنس منعقد نہ ہوئی ہو۔

کراچی میں تحریکِ تحفظ ختم نبوت

حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کے دورے نے کراچی میں ردِ مرزائیت کے سلسلے میں زندگی پیدا کر دی۔ حضرت شاہ صاحب نے مرزا قادیانی کے بارے میں فرمایا تھا کہ:

''تصویر کا ایک رُخ تو یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی میں کمزوریاں اور عیوب تھے۔ اُس کے نقوش میں توازن نہ تھا۔ قد و قامت میں تناسب نہ تھا۔ اخلاق کا جنازہ تھا۔ کیرکٹر کی موت تھی۔ سچ کبھی نہ بولتا تھا۔ معاملات کا درست نہ تھا۔ بات کا پکا نہ تھا۔ بزدل اور ٹوڈی تھا۔ تقریر و تحریر ایسی ہے کہ پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے، لیکن میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اگر اُس میں کوئی کمزوری بھی نہ ہوتی۔ وہ مجسمۂ حسن و جمال ہوتا۔ قویٰ میں تناسب ہوتا۔ چھاتی ۴۵، اِنچ کی۔ کمر ایسی کہ سی، آئی، ڈی کو بھی پتا نہ

Marfat.com

چلتا۔ بہادر بھی ہوتا۔ مردِ میدان ہوتا۔ ابوالفضل اُس کا پانی بھرتا۔ خیام اُس کی چاکری کرتا۔ غالب اُس کا وظیفہ خوار ہوتا۔ انگریزی کا شیکسپیئر اور اُردو کا ابوالکلام ہوتا۔ پھر نبوت کا دعویٰ کرتا تو کیا ہم اُسے مسلمان مان لیتے؟

میں تو کہتا ہوں کہ اگر علیؓ دعویٰ کرتے کہ جسے تلوار حق نے دی اور بیٹی نبی نے دی۔ سیّدنا ابوبکر صدیقؓ، سیّدنا فاروق اعظمؓ اور سیّدنا عثمان غنیؓ بھی دعویٰ کرتے تو کیا بخاری اُنہیں نبی مان لیتا؟ ہرگز نہیں۔ میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کائنات میں کوئی انسان ایسا نہیں جو تختِ نبوت پر سج سکے اور تاجِ امامت و رِسالت جس کے سر پر ناز کرے"۔

مجلس احرار کے بہترین مبلغ اور بلند پایہ مناظر جناب مولانا لال حسین اختر کو کراچی میں مجلس احرار کا انچارج بنا دیا گیا۔ جماعت کی باقاعدہ تشکیل ہوئی، مولانا لال حسین صاحب جماعت کے صدر منتخب ہو گئے۔ کراچی کی اہمیت سب پر واضح ہے۔ کراچی حکومت کا دارالحکومت ہونے کے علاوہ کراچی میں سر ظفر اللہ قادیانی کے وزیر خارجہ ہونے کی وجہ سے مرزائیت کا زبردست اڈا بن گیا۔ بعض دوسرے اہم عہدوں پر بھی مرزائی مسلط تھے۔ حکومت کی مشینری قادیانی اشاروں پر رقص کرتی تھی۔ سندھ میں فاروقی چیف سیکرٹری کی کلیدی آسامی پر مسلط تھے۔ کراچی پر سندھ کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس طرح پاکستان کا مرکز کراچی دراصل قادیانیوں کا گڑھ تھا جب تک مجلس احرار نے وہاں اپنا دفتر قائم نہ کر لیا، لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ مرزائیت کی امربیل کس طرح شجرِ اسلام پر چھا کر بسنت منا رہی ہے۔

کراچی میں قادیانیوں کا جلسہ

سیالکوٹ سے شکست کھانے کے بعد مرزائیت نے کراچی میں سر نکالا۔ یہی ان کا آخری اور مضبوط قلعہ تھا۔ پاکستان میں مرزائیت کا دارومدار مرزا محمود کی دماغی قابلیت اور سر ظفر اللہ کے سیاسی بل بوتے پر تھا۔ ورنہ مرزائیت میں نہ ہی کوئی کشش ہے اور نہ جاذبیت، چنانچہ ربوہ میں فیصلہ ہوا کہ کراچی میں کھلے بندوں تبلیغِ مرزائیت کے لیے جلسۂ عام منعقد ہو، جس میں سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان تقریر کریں، اس حکم کی تعمیل میں مسلم لیگ کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان ارتداد پھیلانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ غیر ملکی سفارتخانوں میں دعوت نامے بھیجے گئے۔ حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی۔

Marfat.com

پولیس سے رضا کاروں کا کام لیا گیا۔اس جلسے میں سر ظفر اللہ خان کی تقریر کا عنوان تھا۔''زندہ اسلام'' (یعنی مرزائیت زندہ اسلام اور معاذ اللہ اسلام مردہ اسلام) کراچی کی دیواروں پر جب اس جلسے کے قد آدم پوسٹر چسپاں ہو گئے تو کراچی کے اسلامی حلقوں میں بڑی ہلچل ہوئی۔مولانا لال حسین اختر صاحب کے پاس دیندار طبقہ اور مذہب سے محبت رکھنے والے مسلمانوں کا تانتا بندھ گیا۔جلسہ گاہ کے اردگرد پولیس کی گاڑیوں نے خاردار تاروں کا کام دیا، چنانچہ اس جلسے کا باقاعدہ اعلان ہوا، بازاروں میں پوسٹر لگائے گئے۔مسلمانوں کو اس دعوت پر وہاں جانا ہی تھا، مگر حکومت کو اس طرح غیر معمولی طریقے پر متحرک دیکھ کر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔جلسہ گاہ کے اردگرد لوگوں کے ٹھٹھ لگ گئے۔کچھ لوگ آہستہ آہستہ جلسہ گاہ میں داخل ہونے شروع ہوئے، مگر سب کی زبان پر یہی بات تھی کہ اگر ان قادیانیوں کا ''اسلام زندہ'' ہے تو کیا ہمارا اسلام معاذ اللہ مردہ ہے؟

جلسے کا آغاز اور گڑبڑ

مولانا لال حسین اختر جلسے میں موجود تھے وہ سننا چاہتے تھے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے اور زندہ اسلام پیش کرتے ہوئے سر ظفر اللہ خان کیا ارشاد فرماتے ہیں اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی کس طرح کوشش فرماتے ہیں۔ جلسے کا آغاز مسلمانوں کی طرح مرزائیوں نے بھی کلام پاک کی تلاوت سے کیا مگر مرزائیوں کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی یعنی مرزائی مبلغ نے قرآن پاک کی آیت ہی غلط پڑھی۔مولانا لال حسین اختر نے ان کو ٹوکا اور فرمایا کہ خدا کے لیے قرآن تو صحیح پڑھیے۔بس مولانا کا یہ کہنا تھا کہ مرزائی پل پڑے۔پولیس چڑھ دوڑی اور لٹھ گھمانے لگی۔لوگوں کے سر پھوڑ ڈالے، پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔گڑبڑ میں جلسہ تو برخاست ہوا مگر ساتھ ہی اعلان ہوا کہ کل پھر اسی جگہ جلسہ ہوگا۔شہر میں مرزائیوں اور مقامی حکومت کی اس ملی بھگت اور دھاندلی پر غم وغصہ کا اظہار ہوا۔اب مسلمانوں میں یہ بات چل رہی تھی کہ قادیانیوں کو کفر وارتداد پھیلانے کی کھلی اجازت کس نے دے رکھی ہے؟

ٹی اے نقوی چیف کمشنر کراچی

نقوی صاحب کو منٹ منٹ کی خبر پہنچائی جارہی تھی۔سب کو سر ظفر اللہ خان کی خوشنودی منظور تھی، چنانچہ نقوی صاحب نے اعلان کیا کہ اب اگر کسی نے قادیانیوں کے جلسے میں ذرا بھی گڑبڑ کی تو سختی سے کام لیا جائے گا اور شر پسند عناصر کو کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ظاہر ہے کہ یہ اعلان مولانا لال حسین اختر او

Marfat.com

ران کے رفقاء کے لیے تھا۔ مولانا لال حسین اختر نے دوسری جگہ جلسے کا اعلان کیا اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ چاہا کہ مسلمانوں کو مرزائیوں کے جلسے سے دور رکھا جائے تا کہ کسی قسم کا بہانہ بنا کر سر ظفر اللہ مسلمانوں کو گزند نہ پہنچا سکے۔

حکومت بھی حرکت میں آئی

شہر کے مسلمانوں نے خواجہ ناظم الدین کو پچاسوں تاریں بھیجیں کہ مرزائیوں کے جلسے کو روکیے۔ یہ نئی بدعت ہمارے شہر میں نہ پھیلائیے۔ پاکستان کے مرکزی شہر میں اس طرح کھلم کھلا ارتداد پھیلانے کی اجازت دینا صریح ظلم ہے۔ خواجہ صاحب کی خدمت میں وفود بھیجے گئے۔ معززین شہر نے ان سے زبانی بھی عرض کیا کہ آپ دیندار حاکم ہیں۔ آپ نے اپنے ماتحتوں کو ارتداد پھیلانے کی کس طرح اجازت دے دی ہے؟ خواجہ صاحب نے بات تو سمجھ لی مگر اب سوال یہ تھا کہ قادیانی بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟ ان دنوں سردار عبدالرب نشتر مرکز میں وزیر تھے۔ کابینہ میں بھی رات کے جلسے کا چرچا تھا۔ خواجہ صاحب نے بالآخر فیصلہ کیا کہ وہ سر ظفر اللہ خان کو بلا کر یہ کہیں کہ آپ کابینہ میں شامل ہیں۔ بحیثیت وزیر خارجہ آپ کی ذمہ داری بہت نازک ہے۔ مسلمانوں میں اشتعال ہے۔ آپ اس جلسے میں نہ جائیں۔

یہاں ایک بات بتانا چاہتا ہوں احرار کی تبلیغ کانفرنس میں احرار کے رہنما بار بار حکومت سے کہہ رہے تھے کہ ہر مرزائی سرکاری ملازم خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، چپڑاسی ہو یا وزیر خارجہ اس کی پوزیشن مشکوک ہے۔ سب سے پہلے وہ ربوہ کا وفادار ہے اس کے بعد حکومت پاکستان کی وفاداری کا نمبر آتا ہے۔ اگر کسی وقت یہ مشکل درپیش آئی کہ اگر ایک حکم ربوہ سے جاری ہوتا ہے، اور دوسری طرف ان کے خلاف حکومت پاکستان نے کوئی حکم جاری کیا تو مرزائی ملازم ربوے کا حکم مانے گا اور حکومت پاکستان کے حکم کو پسِ پشت ڈال دے گا۔ احرار نے یہ بات مرزائیت کے لٹریچر اور مرزا محمود کے ذہن کے مطالعے کے بعد کہی تھی۔ خدا بڑا کارساز ہے اس کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے قدم اٹھایا جائے تو وہ ضرور امداد کرتا ہے۔

خواجہ ناظم الدین نے سر ظفر اللہ خان کو روکا

کراچی میں وفود اور تاروں کا یہ اثر ہوا کہ خواجہ صاحب نے سر ظفر اللہ کو بلایا اور

Marfat.com

انہیں کہا کہ کل تو جو ہوا سو ہوا، آج آپ اس جلسے میں نہ جائیں۔ سر ظفر اللہ خان مرزائی نہ ہوتے اور مسلمان ہوتے ہوئے وہ اسلام کی خاطر اس جرأت سے کام لیتے جس جرأت سے سر موصوف نے مرزائیت کے لیے کام کیا تو ہم ان کے قدم چوم لیتے۔ خواجہ صاحب کی تنبیہ کے جواب میں سر ظفر اللہ خان نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اپنے تبلیغی جلسے میں نہ جاؤں؟ میں نے اعلان کیا ہے۔ اس اعلان کے بعد مجھے جلسے میں ضرور جانا ہے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے سر ظفر اللہ خان کو یہ نہیں کہا کہ اگر جلسے میں جانا ہے تو وزارت خارجہ سے مستعفی ہو جایئے۔ خواجہ صاحب مرعوب ہو گئے۔ بیٹھے مٹر مٹر جھانکتے رہے۔ سر ظفر اللہ خان جلسے میں آ دھمکے اس جلسے کے لیے بے شمار پولیس آ موجود ہوئی۔ اشک آور گیس، گھڑ سوار پولیس اور جانے جانے کیا سامان مہیا کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ جلسہ کسی صورت میں بھی کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔ مسلمان اس کھلم کھلا ارتداد کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جلسے میں گڑ بڑ ہوئی، کہتے ہیں سر ظفر اللہ خان لوہے کا خود پہن کر جلسہ گاہ میں تشریف لے گئے تھے۔ بیرونی سفیروں اور نمائندوں کو کیا معلوم تھا کہ مرزائیت کیا بلا ہے۔ وہ سر ظفر اللہ خان کی دعوت پر جلسہ میں پہلے سے موجود تھے۔ اعلیٰ درجے کی کاروں کی قطاریں لگ گئیں اور بڑے بڑے جغادری مرزائی جلسے میں موجود تھے۔

سخت گڑ بڑ

سر ظفر اللہ خان جونہی تقریر کے لیے اٹھے، ختم نبوت زندہ باد اور تاجدار ختم نبوت زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ پولیس حکم کی منتظر تھی، لاٹھی چلی، پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ سر ظفر اللہ خان اور ان کے ساتھیوں کو بھاگ جانے کی سوجھی۔ تُو میری کار میں اور میں تیری کار میں۔ ڈرائیور چلا رہا ہے کہ ہمارے صاحب کو تو آنے دیجیے مگر صاحب وہاں تو نفسا نفسی کا عالم تھا۔ بھاگم بھاگ گردان جاری تھی، جگہ جگہ مسلح پولیس متعین تھی، گلی کوچوں میں بھگدڑ مچ گئی اور مرزائیوں کا نہایت اہتمام سے منعقد کیا ہوا جلسہ ختم ہوگیا۔ پچاسوں مسلمانوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ دوسرے دن صبح سویرے اس جلسے کی روداد پر لگا کر ملک بھر میں جا پہنچی جب یہ خبر لاہور پہنچی تو یہاں سخت ہلچل ہوئی۔ مجلس احرار لاہور نے جلسہ عام کا اعلان کیا۔ اخباروں کے ذریعے کراچی کے جلسے کا سب کو علم ہو چکا تھا، لاہور میں احرار کی جانب سے باغ بیرون دہلی دروازہ ''احرار پارک'' میں عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ ہم نے لاہور کے اس جلسے میں

Marfat.com

سخت احتجاج کیا اور حکومت کو مرزائیت نوازی پر مطعون کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ یا تو سر ظفر اللہ سے وزارت خارجہ کا قلمدان چھین لیجیے اور یا اسے منع کر دیجیے کہ وہ زندہ اسلام اور مردہ اسلام کا وعظ کہنا چھوڑ دیں۔ احرار نے جو بات کہی تھی اس کا زندہ ثبوت سر ظفر اللہ خان نے خواجہ ناظم الدین کی حکم عدولی اور مرزا محمود کے حکم کی بجا آوری سے بہم پہنچا دیا۔ اب تبلیغی کانفرنسوں میں کراچی کے جلسے کا خوب خوب چرچا ہونے لگا۔

رمضان المبارک کی آمد

اس عرصے میں پنجاب کے کونے کونے میں وسیع پیمانے پر تبلیغ کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ ماہ رمضان کے آغاز سے چند روز پہلے ہمارے لاہور کے رفیق دفتر میں جمع ہوئے اور باتوں باتوں میں رمضان المبارک کا ذکر آیا تو سب نے وہی بات کہی جو عام طور پر کہی جاتی ہے، یعنی یہ کہ اب ایک ماہ کے لیے چھٹی ہے۔ اب کوئی کام نہ ہو سکے گا۔ مجھے معاً چودھری افضل حق مرحوم کا ارشاد یاد آیا کہ یہ برکتوں والا مہینہ کس طرح ہماری غفلت شعاری سے تحریکِ کشمیر کے لیے نقصان کا باعث ہوا تھا چنانچہ اس موضوع پر بحث ہوتی رہی کہ ہمیں تحریکِ تحفظ ختم نبوت کو جاری رکھنے کے لیے کس طرح پراپیگنڈہ کرنا چاہیے۔ فیصلہ ہوا کہ اپنے ہم خیال ائمۂ مساجد اور خطیب حضرات کو توجہ دلائی جائے کہ وہ مسئلہ ختم نبوت پر تقریر فرمائیں۔ میں نے شیخ حسام الدین صاحب سے عرض کیا کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے زعماً احرار کی مجلسِ مشاورت بلوانا مشکل ہے اور نہ اس وقت حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے مقصد حاصل ہو سکے گا۔ زعما احرار جہاں کہیں بھی ہیں۔ اپنا فرض انشاء اللہ ضرور ادا کریں گے۔ ہمیں یعنی مجھے اور شیخ صاحب کو رمضان کے چاروں جمعہ پر خاص خاص مقامات پر جہاں جامع مساجد کے خطیب حضرات ہم خیال ہیں، خود جانا چاہیے۔ اس مرتبہ پرانے تجربہ سے سبق حاصل کر کے ہمیں مناسب قدم اٹھانا چاہیے۔ طے یہ ہوا کہ پہلے جمعہ کو حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری مدظلہ کے ہاں اجازت لے کر خطبے سے قبل ردِ مرزائیت کے سلسلے میں ہم دونوں تقریر کریں چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم دونوں مولانا کے ہاں حاضر ہوئے حضرت مولانا احمد علی صاحب نے جیسا کہ ہمیں توقع تھی، خود بھی تحریک کے بارے میں ارشاد فرمایا اور ہمیں بھی اجازت دی کہ ہم اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ روزہ دار کو گرمی کے دنوں میں لمبی چوڑی تقریر کے بعد جان پر بن جاتی ہے مگر ہمیں ایک نشہ تھا۔ مسئلے کی برکت

Marfat.com

تھی کہ آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوا۔ دوسرے جمعہ کو ہم نے اوکاڑہ کی عیدگاہ میں تقریر کی۔ باقاعدہ اعلان ہو چکا تھا۔ عیدگاہ میں بہت بڑے اجتماع کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ شیخ صاحب کی موٹر میں اوکاڑہ پہنچے۔ شام کو تقریر کر کے لاہور واپس آ گئے مگر اس سفر میں ہمارا کچومر نکل گیا۔ تیسرا جمعہ سرگودھا کے لیے وقف تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ باغ میں جمعہ سے قبل جلسۂ عام ہو جائے۔ ہم نے کہلا بھیجا کہ ہم سحری کھا کر چل پڑیں گے اور انشاء اللہ صبح آٹھ بجے کے قریب سرگودھا پہنچ جائیں گے چنانچہ تقریباً آٹھ بجے ہم جامع مسجد کے سامنے جا حاضر ہوئے۔ احباب پریشانی کے عالم میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی ہماری موٹر پہنچی۔ ان سب حضرات نے موٹر کو گھیر لیا اور بتایا کہ جس باغ میں جلسہ کا اعلان کیا تھا وہاں حکومت نے دفعہ 144 لگا دی ہے۔ پولیس ٹانگے میں لاؤڈ سپیکر پر بازاروں میں اعلان کر رہی ہے کہ باغ مذکور میں جلسہ نہیں ہو سکتا، وہاں 144 نافذ کر دی گئی ہے۔ سرگودھا کے احرار مُصر تھے کہ جلسہ وہیں ہوگا، جہاں کا اعلان ہو چکا ہے۔ حکومت نے عین وقت پر بدنیتی سے 144 کا نفاذ کیا ہے۔ تاکہ ہمیں یا تو قانون شکنی کرنا پڑے یا ہم عوام کی نگاہ میں ذلیل و خوار ہوں۔ ہم جلسہ کریں گے اور قربانی دیں گے۔ حکومت ہمیں مذہبی تبلیغ سے روک نہیں سکتی۔ ہم نے اس صورت حال پر غور کیا اور احباب سے عرض کیا کہ دس منٹ کے لیے ہمیں سوچ لینے دیجیے۔ تاکہ ہم کوئی مناسب فیصلہ کر سکیں۔ اس معاملے میں مجھے میرے دوست بہت نرم مزاج سمجھتے ہیں۔ میں جلدی سے بھڑک نہیں جاتا، مجھے گرمی بہت کم آتی ہے۔ آتی بھی ہے تو آہستہ آہستہ مگر جب آ جاتی ہے تو پھر آ ہی جاتی ہے۔ میں اس مرحلہ پر تصادم نہ چاہتا تھا۔ اس کی وجوہات تھیں۔ مجھے مجلس احرار کا صدر بنا دیا گیا تھا۔ اس لیے بالفرض اگر میں پکڑا جاؤں اور دیدہ دانستہ سول نافرمانی کر کے پکڑا جاؤں تو ساری جماعت پر فرض ہو جاتا کہ وہ سول نافرمانی کرتی۔ مجھے جماعت نے سِول نافرمانی کا پروانہ نہیں دے رکھا تھا۔ اس لیے میں تنہا یہ اقدام کیسے کر سکتا تھا؟ سہارے کے لیے میرے ہمراہ مجلس کے جنرل سیکرٹری شیخ حسام الدین صاحب موجود تھے مگر وہ تو جرنیل قسم کے بزرگ ہیں۔ انہیں تو مخالف کی صورت دیکھتے ہی تاؤ آ جاتا ہے۔ مجھے اس نازک مرحلے پر انہیں بھی ٹھنڈا کرنا تھا۔ بہرحال دس منٹ بعد ہم دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ حکومت الجھنا چاہتی ہے، ہمیں اس وقت طرح دے جانا چاہیے۔ ہمارے ہمراہ لاہور کے رضا کارانِ احرار کے سالار سعید اقبال بھی سرگودھا پہنچ چکے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ سالار صاحب شہر کے اندر سرگودھا کے بازاروں میں اعلان کرو کہ باغ میں جہاں جلسہ ہونا تھا وہاں حکومت نے دفعہ 144 نافذ کر دی ہے۔ وہاں باغ میں

Marfat.com

کوئی مسلمان نہ جائے۔ جنہیں احرار رہنماؤں سے ملاقات کرنا ہو وہ جامع مسجد میں آ جائیں۔ ہم وہیں بات کریں گے اور جو کہنا چاہتے ہیں وہیں کہہ دیں گے۔ کوئی سیاسی بات تو ہے نہیں کہ جس کے لیے کھلے میدان کی ضرورت ہو، مذہب کی بات ہے، خدا کا پیغام ہے، چلو خانہ خدا ہی میں آ کر سن جاؤ۔ لوگوں کو تاکید کر دی گئی کہ ممنوعہ علاقے میں جمع ہو کر قانون شکنی سے پرہیز کریں۔ اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا ہزارہا مسلمانوں کا ہجوم جامع مسجد میں جمع ہو گیا۔ ہمیں جامع مسجد سرگودھا میں حضرت مفتی محمد شفیع سے اجازت بھی مل گئی۔ وہ بہت ہی مہربان اور شفیق بزرگ ہیں۔ تحریک تحفظ ختم نبوت سے انہیں دلی لگاؤ ہے۔ اس بارہ میں بھی انہوں نے کسی سے کم جدوجہد اور قربانی نہیں کی۔ وہ ردِ مرزائیت کے سلسلے میں پیش پیش تھے۔ تقریباً دس بجے جامع مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ میں نے عوام کو صورتِ حال سے خبردار کیا اور عوام کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ میں ابھی تقریر کر ہی رہا تھا کہ سرگودھا کے پولیس کپتان مع دوسرے افسروں کے مسجد کے باہر آ کھڑے ہوئے اور وہیں سے سرگودھا کے احرار رہنما شیخ عبداللہ صاحب کو بھی بلا بھیجا اور انہیں نوٹس دیا کہ مسجد کی اندر ردِ مرزائیت کے سلسلے میں کوئی تقریر نہیں ہو سکتی۔ میں تقریر کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سرگودھا کے احرار سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کاغذ ہے۔ میں نے تقریر کرتے ہوئے دریافت کر لیا کہ کیا قصہ ہے؟ معلوم ہوا کہ جامع مسجد کے اندر دفعہ 144 نافذ کر دی گئی ہے۔ اس کے متعلق نوٹس ہے۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ برطانوی راج میں دفعہ 144 مسجد کے باہر رہا کرتی تھی مگر پاکستان کی برکت سے دفعہ 144 نے اب کلمہ پڑھ لیا ہے۔ اس لیے مسجد کے اندر چلی آئی ہے۔ میرے بعد شیخ حسام الدین صاحب نے تقریر کی اور دفعہ 144 کی قانونی پوزیشن پر روشنی ڈالتے ہوئے احتجاج کیا اور حکومت کو متنبہ کیا کہ ''وہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا چھوڑ دے۔ یہ سودا حکومت کو مہنگا پڑے گا۔ ہم قانون شکنی کے لیے یہاں نہیں آئے۔ اگر ہمیں یہ کام کرنا ہوتا تو ہم دفعہ 144 کی دھجیاں باغ میں تقریر کر کے اُڑا سکتے تھے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت خود سول نافرمانی کر رہی ہے۔ حکومت کی اپنی نیت اچھی معلوم نہیں ہوتی اور نادان حکام بلاوجہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔ تقریر ختم ہوئی۔ خطبہ شروع ہوا۔ ہم نے وہیں نماز جمعہ ادا کی مگر اس قدر گرمی تھی کہ زبانیں تالو سے جا لگیں۔ ہم مسجد سے فارغ ہو کر شیخ عبداللہ صاحب کی دوکان پر آ گئے۔ شیخ صاحب نے کمرے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بہتیرے جتن کیے مگر تقریر، جلسہ اور ہجوم کی وجہ سے پسینے

Marfat.com

میں شرابور اور گرمی سے بے حال ہو رہے تھے۔ دوپہر ہی کو ہم سرگودھا سے چل پڑے۔ موٹر کی کھڑکیاں بند کیں تو اندر حمام بن گیا۔ کھڑکیاں کھولیں تو لُو کے جھونکے طمانچے مارتے تھے۔ چینوٹ سے کچھ فاصلے پر تھے کہ زبانوں پر کانٹے پڑ گئے۔ آواز نکالنا دوبھر ہو گیا کہ ہمیں دور سے کنویں پر ہٹ چلتا نظر آیا ہم نے موٹر کو پٹڑی پر ڈال دیا اور کنویں کے چھوٹے سے تالاب میں کپڑوں سمیت داخل ہو گئے۔ آدھ گھنٹے بعد ہمیں ہوش آیا۔ دوبارہ سفر شروع کیا جب ہم لاہور انارکلی کے چوک میں پہنچے تو افطاری کا نقارہ بجا۔ وہیں سنگترے سے روزہ افطار کیا۔

چوتھا جمعہ گوجرانوالہ کے لیے وقف تھا۔ جامع مسجد میں باقاعدہ اعلان ہوا کہ ہم دونوں تقریر کریں گے۔ ہم گوجرانوالہ پہنچ کر سیدھے صاحبزادہ فیض الحسن صاحب کے ہاں پہنچے۔ کچھ دیر آرام کیا۔ صاحبزادہ صاحب کا پروگرام باہر کا تھا مگر وہ ہماری وجہ سے ٹھہر گئے بلکہ جامع مسجد کے جلسے میں شمولیت کے لیے تشریف لے آئے۔ یہاں مولانا عبدالواحد صاحب کا دم غنیمت ہے۔ وہ ہر جمعے ردِ مرزائیت پر بہت کھل کر تقریر فرماتے تھے۔ جلسے پر اعلان ہوا۔ صاحبزادہ صاحب نے صدارت فرمائی اور صدارتی تقریر میں بہت کھری کھری باتیں کہہ ڈالیں۔ ہم دونوں نے تقریر کی اور تقریر کے بعد دفتر احرار میں چلے آئے۔ گوجرانوالہ میں احرار کا دفتر بارونق بازار میں تھا تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد ہم وہاں سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ پولیس ہمیں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ گوجرانوالہ میں ہمیں معلوم ہو جاتا تو ہم وہاں ٹھہر جاتے اور پولیس کو لاری لے کر ہمارے پیچھے دوڑنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑتی۔ مرید کے پہنچے تو شیخ صاحب نے فرمایا کہ میں نے مولوی محمد صدیق کو چاول کی بوری کے لیے کہہ رکھا ہے۔ آیئے اس سے پتا کر لیں۔ اگر اب چاول مل جائیں تو ہمراہ لیتے جائیں۔ ہم مولوی صدیق کے ہاں جا پہنچے۔ پولیس خلاف قانون رفتار سے سڑکوں پر موٹر دوڑا کر واپس ہو گئی۔ ہمارے فرشتوں کو بھی پتہ نہ تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ ہم مرید کے سے لاہور آ گئے۔ بعد میں پولیس کی بھاگ دوڑ اور وارنٹوں کا پتہ چلا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کی حکومت نے ہمیں نماز عید پڑھنے کی مہلت تو دے دی مگر عید کے دوسرے دن سرگودھا اور گوجرانوالہ سے وارنٹ آ گئے۔ لاہور میں ہم پر ہاتھ ڈالتے ہوئے حکومت گھبراتی تھی۔ آخر ایک روز حوصلہ کر کے مجھے اور شیخ صاحب کو پکڑ ہی لیا۔ ہماری یہ گرفتاری سرگودھا کے وارنٹوں پر ہوئی تھی چنانچہ کوتوالی پہنچے۔ وہاں سے ہمیں چیئرنگ کراس کے تھانے کی اس بیرک میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ

Marfat.com

پاکستان میں وزیر بننے سے قبل مسلم لیگ کی تفریحی تحریک میں ایک رات گزار چکے تھے۔ مجھے خیال تھا کہ رات کو سوتے وقت شاید ہمیں بھی وزارتوں کے سنہرے خواب آئیں مگر وہ تو قسمت کے پھیر ہیں، جسے اللہ دے، رات گزری اور صبح ہوئی تو ہمیں پولیس کی لاری میں ادھر ادھر گھما کر سرگودھا کی سیدھی سڑک پر ڈال دیا گیا۔ دوپہر کے بعد ہم سرگودھا کی مختصر اور چھوٹی سی جیل میں بند تھے۔

صاحبزادہ سید فیض الحسن کی گرفتاری

ہم دونوں یعنی مجھے اور شیخ حسام الدین صاحب کو گرفتار کرنے کے فوراً بعد صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب کو گوجرانوالہ سے گرفتار کر لیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب سجادہ نشین آلو مہار شریف بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ بی اے تک تعلیم پائی ہے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ بہترین خطیب اور محبوب ترین پیر ہیں، آپ کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ پیرانِ عظام میں یہی ایک پیر ہیں جنہوں نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ ردِ مرزائیت کے سلسلے میں بارہا جیل گئے۔ صاحب زادہ صاحب بڑے ہی خوش خلق، ملنسار اور احرار کے رہنماؤں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ احرار کارکنوں اور رضا کاروں سے انہیں بے حد محبت ہے۔ آپ کے صاحبزادے نے حریت پسندی اپنے والد محترم سے ورثہ میں پائی ہے۔ ہم نے انہیں رضا کاروں کی وردی میں ملبوس اور فرش محمدی پر راتیں گزارتے اور رضا کاروں کے ہمراہ مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ ہمیں اقرار ہے کہ صاحبزادہ صاحب کی احرار میں شمولیت سے ایک خاص مکتبہءِ خیال کے مسلمان گروہ در گروہ احرار میں شامل ہوئے اور احرار کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جونہی صاحبزادہ صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا۔ ان کے مریدوں اور احرار کارکنوں کے بڑے ہجوم نے جیل کا دروازہ گھیر لیا۔ مریدین کا یہ حال تھا کہ صاحبزادہ صاحب کا ایک مرید تقریباً دیوانہ ہو کر جیل کے دروازے پر یورش کر رہا تھا۔ جیل وارڈن اسے بار بار روکتے تھے۔ تنگ آ کر اس دیوانے نے جیل کی دیواروں پر ٹکریں مارنا شروع کر دیں۔ وہ چلا کر دہائی دے رہا تھا کہ ظالمو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کو جیل میں بند کر کے اللہ کے عذاب کو کیوں دعوت دے رہے ہو۔ یا انہیں رہا کرو یا مجھے اندر لے چلو۔ یہ خالص عقیدت اور غیر سیاسی ذہن کی بیتابانہ جرأت تھی۔ احرار کارکن جانتے تھے کہ انہیں صاحبزادہ صاحب کے پاس پہنچنے کے لیے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ بہر حال گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور دیگر اضلاع میں ان گرفتاریوں سے آگ

Marfat.com

بھڑک اٹھی۔ ایک شور اٹھا کہ اسلامی حکومت غیر اسلامی حرکتوں پر اتر آئی ہے، جگہ جگہ جلسے ہوئے۔ حتیٰ کہ مساجد میں علماء کرام نے ان گرفتاریوں پر احتجاج کرنا شروع کیا۔

خانہ خدا اور حکومت کا قانون

پنجاب، سندھ اور سرحد میں جگہ جگہ جلسے ہونے لگے ردِ مرزائیت کے سلسلے میں پہلے سے تحریک جاری تھی۔ احرار کی تبلیغ کانفرنسوں نے مسلمانوں کو خاصہ بیدار کر رکھا تھا مگر مسجد میں دفعہ 144 کے نفاذ سے ایک اہم سوال پیدا ہو گیا۔

حضرت مولانا ابوالحسناتؒ کی تائید

بعض بلند پایہ شخصیتیں ایسی ہیں جو خود کو شہرت کے مقام سے دور رکھتی ہیں۔ دنیا ان کی خوبیوں سے کما حقہ، واقفیت نہیں رکھتی۔ زیادہ قریب رہنے والے چند لوگ ان بزرگوں کی عظمت کو جان جاتے ہیں مگر عوام بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ آپ کو انہی بلند پایہ حضرات میں حضرت مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادریؒ خطیب جامع مسجد وزیر خان لاہور کا نامِ نامی سرفہرست نظر آئے گا۔ مجھے پاکستان کے قیام سے بہت قبل بارہا ان کے ارشادات سننے کا موقع ملا۔ میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے جب بھی مسجد وزیر خان میں گیا۔ ان کا خطبہ سنا۔ وہ اختلافی مسائل میں بہت کم الجھتے ہیں۔ ان کا انداز بیان بھی اچھوتا ہوتا ہے۔ وہ صاحبزادہ ہیں اور بہت دلچسپ اور عام فہم تقریر فرماتے ہیں جو کچھ کہنا ہو بے دریغ فرما دیتے ہیں۔ اپچ پیچ نہیں ڈالتے۔ تحریک سے قبل بارہا مجھے مسجد وزیر خان میں جانا ہوا مگر میری ان کی ملاقات نہ تھی۔ غائبانہ تعارف تھا۔ حضرت مولانا ابوالحسنات نے جب یہ سنا کہ احرار کے رہنماؤں کو خانہ خدا میں دفعہ 144 لگا کر گرفتار کر لیا گیا تو وہ بہت برہم ہوئے۔ نماز جمعہ میں خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے مولانا نے حکومت کے ان نازیبا نامناسب اور خلافِ اسلام اقدامات کو بے نقاب کرتے ہوئے سخت احتجاج کیا۔ مولانا نے فرمایا مجھے احرار کی جن باتوں سے اختلاف ہوتا ہے، میں ان کے خلاف کہتا ہوں اور کبھی یہ پرواہ نہیں کرتا کہ احرار خفا ہوں گے۔ جسے حق سمجھتا ہوں، اسے بے دریغ کہہ دیتا ہوں۔ مجھے احرار کی سرخ وردیوں پر اعتراض تھا۔ میں نے بھرے جلسے میں اعتراض کیا مگر احرار جو صحیح قدم اٹھاتے ہیں میں ان کی تائید کرتا ہوں، ردِ مرزائیت کے سلسلے میں احرار کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تحفظِ ختم نبوت کے سلسلے میں حتیٰ المقدور کوشاں رہے۔ یہ اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اس میں اختلاف

Marfat.com

کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مسجد میں دفعہ 144 پر اعتراض

حضرت مولانا ابوالحسنات نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ ''مسجد خدا کا گھر ہے۔ خدا کے گھر میں خدا کا اپنا قانون رائج ہے۔ کوئی دنیوی قانون مسجد پر نافذ نہیں ہوسکتا۔ دفعہ 144 کو مسجد کے اندر نافذ کرنا قطعاً غیر اسلامی فعل ہے۔ حکومت اس قانون کو مساجد پر نافذ نہیں کرسکتی اگر وہ ایسا کرے گی تو وہ بلاوجہ ہم سے الجھے گی۔ ہم حکومت کی کسی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوں گے۔'' آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ بیان فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ ہارون رشید اپنی بیگم سے خفا ہوکر جذبات میں بہہ گئے اور تیز کلامی میں بیگم سے فرمایا کہ آفتاب غروب ہونے سے قبل اگر تم میری سلطنت کی حدود سے باہر نہ چلی جاؤ گی تو تم پر طلاق ہوگی جب غصہ فرو ہوگیا جذبات کی آندھی گزر گئی تو ہوش آیا اور دست تاسف ملنے لگے۔ خلیفہ ہارون رشید بیگم کو طلاق نہ دینا چاہتے تھے۔ شتر سواری کا زمانہ تھا، ہوائی جہاز کسی کے خواب وخیال میں نہ تھے وہ سخت پریشان ہوا۔ علماء کو طلب فرمایا اور ان سے دریافت کیا کہ اب کیا صورت ہوسکتی ہے۔ سب نے بے بسی کا اظہار کیا۔ بیگم کے ہمدرد اور خود خلیفہ کے درباری حیران تھے کہ اب کیا ہوگا؟ بات سارے شہر میں پھیل گئی۔ یہ زمانہ حضرت امام ابو یوسفؒ کا زمانہ تھا جب آپ سے کسی نے کہا کہ اس طرح ہارون رشید ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ بیگم پریشان ہے اور حاضر ہوکر امداد کی خواہاں ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا بیگم کو پریشان نہ ہونا چاہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لوگ حیران تھے کہ علماء حضرات مایوس ہوچکے ہیں، طلاق سے بچنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ امام صاحب کس طرح بیگم کو ہارون الرشید کی سلطنت سے باہر بھیج سکیں گے۔ بیگم نے عرض کیا کہ مجھے کیا حکم ہے میں کیا کروں؟ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ کوئی فکر نہ کرو غروب آفتاب سے کچھ عرصہ پیشتر ڈولی میں بیٹھ کر تیار رہنا، تمہیں ہارون الرشید کی سلطنت سے باہر پہنچا دیا جائے گا۔ دنیا حیران تھی کہ گوشہ گمنامی میں بیٹھنے والا فقیر منش عالم دین طلاق سے بچنے کی کوئی راہ نکالے گا جب مغرب کا وقت آیا تو بیگم کے حواس اور ہوا ہوئے وہ پریشانی کے عالم میں ڈولی میں بیٹھی تھی اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے ہاں پہنچی۔ آپ نے بیگم سے فرمایا آؤ میرے ہمراہ چلو آپ بیگم کو مسجد میں لے گئے جب بیگم مسجد میں داخل ہوئی تو امام یوسفؒ نے فرمایا لو بیگم اب تم ہارون الرشید کی سلطنت سے باہر آ گئی ہو۔ اللہ کے گھر

Marfat.com

میں اللہ کی حکومت ہے۔ یہاں ہارون الرشید کے احکامات کا کوئی دخل نہیں۔اس واقعے کو بیان فرمانے کے بعد حضرت مولانا ابوالحسنات نے حکومت کو متنبہ کیا اور مسلمانوں کو صحیح صورتحال سے آگاہ کیا پھر اس واقعے کے بعد ہر مسجد میں ہر خطیب نے حکومت کو آنکھیں دکھائیں۔

حکومت کی غلطیاں

پنجاب میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کی حکومت تھی حکومت اپنی سیاست کو مسجد کے اندر لے تو گئی مگر واپسی کی راہیں بند ہو گئیں۔ وقار کی دیواریں بیچ میں حائل ہو گئی۔ ہمیں گرفتار نہ کر لیا ہوتا تو واپسی کی گنجائش تھی مگر ہماری گرفتاری کے بعد حکومت اپنی شکست تسلیم کر کے ہمیں ہیرو بننے کا موقع کیسے دے۔ حکم ہوا ان مُلاؤں کو ڈپٹی کمشنروں کی معرفت مرعوب کرو اور انہیں منع کرو کہ خطبات میں مرزائیت کا ذکر نہ کریں۔اس نامعقول حکم نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔غریب اور مظلوم ملاؤں کے پاس انگریز چھوڑ ہی کیا گیا تھا۔ لے دے کر خانہ خدا اور مسند رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی باقی تھی۔اس پر بھی انگریزی خوانوں نے یورش کی، تو ملاؤں کے ماتھے پر شکن آ گئی۔حکومت کے اس حکم اور سرکلر کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھرنے لگیں تو حکومت کو ہوش آیا۔تب حکومت تاویلیں کرنے پر اتر آئی۔اس نے ہر چند چاہا کہ احرار کے خلاف غداری کا پراپیگنڈہ کر کے انہیں اکیلا کر لیا جائے اور پھر سختی اور تشدد سے انہیں کچل دیا جائے۔اوّل تو وہ تنہا بھی بڑے سخت جان واقع ہوئے ہیں۔ برطانوی اقتدار انہیں دبا اور مٹا نہ سکا۔ یہ بیچارے رنگروٹ احرار کو کیا مٹاتے مگر مشکل یہ ہوئی کہ ہر مسلمان نے دل کی بات کہی اور حکومت کو بتا دیا کہ ہم احرار کی حمایت نہیں کر رہے بلکہ ہم تو مذہب کے بنیادی مسئلے کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ حمایت جاری رہے گی اور حکومت مسلمانوں کو اس مقام سے ہٹانے میں کبھی کامیاب نہ ہو گی۔

حکومت نے بڑھایا ہوا قدم واپس لیا

پنجاب میں آگ لگ چکی تھی۔سرحد اور سندھ بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔حضرت مولانا ابوالحسنات نے حزب الاحناف کے سالانہ جلسے میں ہماری گرفتاریوں کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہوئے ایک تجویز پیش کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ مرزائیت کی بے جا حمایت اور اسلام دشمنی سے باز آئے۔اس روز تقریر کرتے ہوئے مولانا موصوف نے فرمایا کہ ہم اس صورت حال کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

احرار کا سارا کیمپ آتشِ زیرپا تھا۔ اخبارات نے مقالے لکھے۔ میاں دولتانہ بہت گھبرائے چنانچہ حکومت نے ایک بیان جاری کیا کہ مساجد پر کوئی پابندی نہیں یعنی حکومت نے بڑھایا ہوا قدم واپس لے لیا۔ ان بیانات کے باوجود عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑ چکی تھی۔ خالی بیانات سے لوگ کیونکر مطمئن ہوتے؟ کہ جب تک حکومت گرفتار شدگان کو رہا نہ کرتی۔ ہماری رہائی کے لیے حکومت پس وپیش کر رہی تھی۔

مقدمہ اور سزا

سرگودھا جیل میں میرے اور شیخ حسام الدین کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ بھی ایک روز گرفتار ہو کر تشریف لے آئے۔ ان کے ہمراہ پراچہ صاحب بھی گرفتار ہو گئے۔ پہلے ہم دو تھے۔ اب چار ہو گئے۔ مقدمہ چلتا رہا گو اس مقدمہ میں کچھ جان نہ تھی مگر ہم کوئی دلچسپی نہ لیتے تھے۔ باہر سے احباب نے زور دیا کہ مقدمہ کی پیروی ہونی چاہیے، چنانچہ شیخ ظہیر الدین ایڈووکیٹ سرگودھا نے پیروی شروع کی۔ پیروی کے لیے اکثر جیل آیا جایا کرتے تھے۔ اس بہانے احباب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک روز معلوم ہوا کہ حکومت نے ٹیلی فون پر حکام جیل کو مطلع کیا ہے کہ گرفتار شدگان رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے گا مگر دو چار دن بعد اس خبر کی تردید ہو گئی۔ بہر حال ہم پیشیاں بھگتتے رہے۔ تا آنکہ مقدمے کے فیصلے کا وقت آ گیا۔ ہمارا کیس اے ڈی ایم کے سپرد تھا۔ فیصلے کے دن احباب کا ہجوم جیل سے باہر آ موجود ہوا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ رہائی لازمی ہے۔ اے ڈی ایم نے جب ہمیں چھ چھ ماہ قید سخت کا حکم سنایا تو ہمارے رفیق جو فیصلہ سننے کے لیے آئے تھے۔ کچھ پژمردہ ہوئے۔ ہم نے اے ڈی ایم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ سزا تو آپ نے چھ ماہ کی سنا دی ہے۔ کاش حکومت ہمیں چھ ہفتے جیل میں رکھ سکے۔ شیخ محمد عبداللہ اور پراچہ صاحب سزا کا حکم سننے کے بعد کیمبل پور (اب اٹک جیل) تبدیل کر دیئے گئے۔ ہم دونوں سرگودھا جیل میں قید کاٹنے لگے۔ کلاس کا جھگڑا پیدا ہوا تو میں نے بی کلاس کی بجائے اے کلاس کے لیے مطالبہ کیا۔ ابھی حکومتِ پنجاب فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ ایک رات بارہ بجے کے قریب سپرنٹنڈنٹ جیل نے ہمیں آ جگایا اور اسباب باندھنے کے لیے کہا۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں کسی بڑی جیل میں منتقل کیا جائے گا۔ جیل سے باہر آئے تو دیکھا۔ دو پک اپ کاریں اور دو انسپکٹر پولیس اور پولیس گارڈ موجود ہے۔ حکم ہوا۔ علیحدہ علیحدہ سوار ہو جاؤ۔ الگ الگ جیل میں جانا ہو گا۔ مجھے میانوالی

Marfat.com

اور شیخ صاحب کو جھنگ روانہ کر دیا گیا۔ یعنی میاں دولتانہ کی حکومت ہمیں اکٹھا رکھنا نہ چاہتی تھی اور سزا کے بعد بھی انتقامی جذبہ کارفرما تھا۔ راتوں رات ہمیں دو مختلف جیلوں میں پہنچا دیا گیا۔ صبح چار بجے کے قریب میانوالی جیل کا پھاٹک کھلا اور میں اس جیل میں اکتیس سال کے بعد دوسری مرتبہ داخل ہوا۔ 1920ء میں تحریک خلافت کے سلسلہ میں مجھے پہلی بار اس جیل میں قید کاٹنے کا موقع ملا تھا۔ اُن دنوں میں بھی جوان تھا اور حضرت شاہ صاحب کی جوانی بھی پھوٹی پڑتی تھی۔ حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب پانی پتی، مولانا سید حبیب، مولانا اختر علی خان، مولانا احمد سعید، مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم و مغفور، مولانا محمد یحییٰ، سردار منگل سنگھ، ڈاکٹر ستیہ پال اور دیگر کانگریسی زعماء اسی جیل میں محبوس تھے۔ وہ تحریک خلافت کا زمانہ تھا۔ جیل میں خوب رونق تھی مگر اس مرتبہ میں یکہ و تنہا تھا۔ طبیعت پر کچھ بوجھ ضرور ہوا مگر بے بسی تھی۔ جیل خانہ کوئی باغ جناح ہے کہ دل گھبرایا تو گھر واپس چلے آئے، جیل میں کوئی ذمہ دار افسر موجود نہ تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اور جیلر اپنے بنگلوں پر استراحت فرما رہے تھے۔ چھوٹے داروغہ نے ہمیں ڈیوڑھی ہی میں کرسی دے دی اور خود دفتر کے کاغذات کو الٹ پلٹ کرنے لگے۔ مجھے جس پولیس انسپکٹر کے ہمراہ میانوالی بھیجا گیا تھا۔ وہ نہایت ہی شریف انسان تھا۔ اس نے چلتے وقت سرگودھا کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے بر سبیل تذکرہ دریافت کر لیا کہ یہ کس کلاس کے قیدی ہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ کل صبح ان کی کلاس کے احکامات مجھے مل جائیں گے۔ وہ میانوالی بھیج دوں گا۔ آپ میری جانب سے کہہ دیجیے گا کہ یہ اے کلاس کے قیدی ہیں۔ مجھے ٹیلی فون پر اطلاع مل چکی ہے مگر جب تک کاغذات نہ آ جائیں، میں ان کے ٹکٹ پر کچھ بھی درج نہیں کر سکتا، چنانچہ انسپکٹر پولیس نے چھوٹے داروغہ کو تاکید کر دی مگر یہ بے ضابطہ بات تھی۔ جیل کی دنیا باہر کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ جیل مینوئل، جیل کی الہامی کتاب ہے اس سے باہر کی کوئی بات قابلِ قبول نہیں ہوتی، جب ڈیوڑھی میں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی تو میں نے داروغہ صاحب سے کہا کہ اذان کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے نماز کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ آپ نے مجھے یہاں کیوں بٹھا رکھا ہے؟ اندر لے چلیے۔ میں اب یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ سوچ سوچ کر داروغہ نے فیصلہ کیا کہ ذمہ دار افسران کی تشریف آوری سے قبل وہ مجھے ہسپتال کے ایک کمرے میں جگہ دے دے، چنانچہ مجھے اندر لے جا کر ہسپتال کے ایک کمرے میں جو بی کلاس قیدیوں کے لیے وقف تھا، پہنچا دیا گیا۔ یہاں مولانا عبدالستار خان نیازی کے دو عزیز نوجوان کسی قتل کے سلسلے میں سات سات سال کی سزا بھگت رہے تھے۔ یہ دونوں نوجوان نہایت خلیق اور رئیس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ تقدیر انہیں

Marfat.com

جیل لے آئی تھی۔ مجھے ان لوگوں نے عزت واحترام سے بٹھایا۔نماز کے بعد میں نے ان سے کہا کہ رات بھر جاگا ہوں سفر کی وجہ سے طبیعت میں کسل ہے۔ اجازت ہوتو آپ ہی کی چارپائی پر کچھ دیر آرام کرلوں؟ چنانچہ میں گھوڑے بیچ کر سوگیا۔دن نکل آیا، چائے تیار ہوگئی تو ان نوجوانوں نے مجھے جگایا اور چائے پلائی اس کے بعد وہ دونوں مجھ سے کہنے لگے کہ آپ تو مرزا ابراہیم کے پاس اے کلاس وارڈ میں چلے جائیں گے۔کاش آپ ہمارے پاس رہتے۔ میں نے ان کے محبت آمیز سلوک سے متاثر ہوکر جواب دیا کہ میرے بس میں ہوتو میں آپ کے ساتھ اگر سی کلاس میں بھی رکھا جاؤں تو خوش ہوں گا۔ایک گھنٹے بعد جمعدار آ گیا میرا نام لے کر پکارا اور کہا، چلیے۔ میں نے اسباب اٹھایا اور ان کے ہمراہ ہولیا۔

انتقام

میں جب چکر میں پہنچا تو وہاں ہیڈ وارڈر اور داروغہ صاحب تشریف لے آئے۔ مجھے حکم ہوا کہ اسباب ہمارے حوالے کردیجیے۔ میں نے کہا وہ کیوں؟ جواب ملا کہ گودام میں جمع ہوگا۔ میں چونکہ جیل کے رسم ورواج سے واقف تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ مجھے اخلاقی قیدیوں میں سی کلاس کا قیدی بنا کر رکھا جائے گا، چنانچہ میں نے خود ہی ان سے کہا کہ اسباب سنبھال لیجیے اور درج کر لیجیے۔ میں نے سر سے قراقلی کی ٹوپی بھی اتار کر ان کے حوالے کی۔جیل کی چادر لپیٹ کر کپڑے اتار دیئے اور جیل کے کپڑے پہن لیے۔ایک چٹائی دو چادریں اور ایک لوٹا عطا ہوا۔زندگی مختصر ہوگئی۔اب کوئی جھنجھٹ باقی نہ تھا۔

داروغہ اور ہیڈ وارڈ نے سرگوشیوں میں فیصلہ کرلیا کہ مجھے کہاں رکھا جائے گا۔جیل کے سپاہی کو حکم ہوان کو پھانسی کوٹھڑیوں میں لے جاؤ میں سپاہی کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔شام ہونے والی تھی قیدی بند ہو چکے تھے۔ میرے لیے ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سپاہی نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔تھوڑی دیر بعد ایک سپاہی آیا اور کہنے لگا کہ ہاتھ سے گھڑی اتار کر دے دیجیے۔ داروغہ صاحب کا حکم ہے۔آپ کی گھڑی گودام میں رکھی جائے گی۔ مجھے غصہ آیا کہ ان بدبختوں کو میری گھڑی پر کیا بم کا شبہ ہوا ہے مگر نہیں یہ تو جیل کا قانون ہے، میں نے گھڑی اتار کر سپاہی کے حوالے کی۔ جون کا مہینہ، میانوالی کی گرمی، دیواریں تنور کا مزہ دینے لگیں۔ لیٹا تو چٹائی پر پسینے سے آدمی کا نقشہ بن گیا۔ انتہائی گرمی نے سونے نہ دیا۔اتنے میں ساتھ والی کوٹھڑی سے حوالاتی نے پکارا۔ بابا جی اس عمر میں کیا

Marfat.com

کر بیٹھے؟ خود قتل کیا یا قتل میں شریک ہوئے تھے؟ میں نے جواب دیا کہ یونہی تو پکڑ کر نہیں لے آئے، کچھ تو ہوا ہے۔ دوسرے نے کہا بابا اس ضعیفی میں اللہ اللہ کرتے۔ یہ کام تو ہم نوجوانوں کا ہے۔ میں نے کہا کہ بھئی مجھے بھی جوانی ہی یاد آ گئی تھی۔ اب تو ہو گیا جو ہونا تھا۔ ان بے فکرے نوجوانوں میں سے ایک نے گانا شروع کیا۔ انہی میں ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ وہ کوئی سکول ماسٹر تھا۔ رات کو ایسی گرمی میں نیند کیا آتی خدا خدا کر کے دن نکلا، جیل کھلی تو میں چٹائی اٹھا کر باہر صحن میں آ گیا۔ فجر کی نماز کوٹھڑی کے اندر ہی ادا ہوئی، سب کوٹھڑیاں کھل گئیں۔ میرے ساتھی تھے تو قاتل اور ڈاکو مگر بڑی ادا کے لوگ تھے۔ وہ مجھ سے ہمدردی کرنے لگے۔ بعض نے یہ سمجھا کہ پولیس نے کسی جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر قید کرا دیا مگر جب میں نے انہیں بتایا کہ کل سزا چھ مہینے ہوئی تو وہ کہنے لگے۔ گیارہویں والے پیر نے ہاتھ بڑھا کر رکھ لیا۔ ان دو تین دنوں میں گرمی کی وجہ سے مجھے قطعاً بھوک نہ لگی۔ پانی پی کر گزارہ کرتا رہا۔ قیدیوں کو جیل میں تولا جاتا ہے۔ مجھے تولنے کے لیے قیدیوں کی قطار میں کھڑا کر لیا گیا اور پھر ہسپتال لے گئے، قیدیوں کا وزن ہونے لگا جب میری باری آئی اور ڈاکٹر نے میری جانب دیکھا تو فرمایا کہ بھئی تم تو بیمار ہو۔ تم ہسپتال میں کیوں نہیں آ جاتے۔ میں نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب میں قیدی ہوں، حکم کے بغیر ہسپتال کیسے چلا آتا؟ ڈاکٹر نے پھر کہا کہ نہیں تم کو ہسپتال آ جانا چاہیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر دوسرے قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا اور مجھے بھول گیا۔ جو وارڈر مجھے ہسپتال لے گیا تھا۔ اس نے چلا کر کہا چلو جو وزن کرا چکے ہیں، لائن میں کھڑے ہو جائیں۔ میں لائن میں آ گیا۔ وہ سب قیدیوں کو ہانک کر وارڈ کی طرف لے گیا۔ ہمیں پھر کوٹھڑیوں میں پہنچا دیا گیا۔ ہسپتال کی اُمید بندھ کر ٹوٹ گئی میرے دل میں یہ شرک آ گیا تھا کہ ڈاکٹر مجھے پھانسی کوٹھڑی کی گرمی اور مصیبت سے بچا لے گا۔ خدا نے اس کی توجہ کو میری طرف سے ہٹا دیا۔ تب میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی کہ خدا پر بھروسہ چھوڑ کر ڈاکٹر کا بھروسہ کر کے دیکھ لیا۔ میں اپنی کوٹھڑی میں خاموش لیٹا رہا دو تین راتیں اس طرح گزریں۔ تین چار دن بعد حکم ہوا، چلو چکی میں مشقتیں ملیں گی۔ جب میں چکر جمعدار کے پاس پہنچا تو وہ کافی دیر میری مشقت کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے دریافت کیا تمہیں لکھنا آتا ہے میں نے اثبات میں جواب دیا۔ جمعدار نے کہا۔ نہیں ابھی منشی گیری نہیں مل سکتی تم نئے قیدی ہو۔ بالآخر میرے ٹکٹ پر مرمت کی مشقت لکھ دی گئی۔ میں نے دریافت کیا۔ کاہے کی مرمت کرائیے گا۔ حکم ہوا پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت، کیا کرنا۔ یہ سب سے آسان کام ہے۔ ڈاکٹر نے ٹکٹ پر سب سے ہلکی مشقت کی

Marfat.com

سفارش کی ہے۔ میں نے چکر جمعدار سے گفتگو کی اور اسے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ سے ملاقات تو کرا دیجیے اس کے بعد جن کپڑوں کی مرمت چاہو گے، عذر نہ ہوگا۔ دل چاہے تو باہر سے وزیروں کی پھٹی ہوئی پتلونیں مرمت کے لیے منگوا لینا، مجھے کوٹھڑی میں واپس بھیج دیا گیا۔ جو سپاہی مجھے چھوڑنے آیا تھا میں نے اس سے ملاقات کے بارے میں کہا۔ اس نے کہا کہ کل صبح میں جمعدار سے بات کروں گا۔

خداوندانِ جیل

نہ ہو بندہ کوئی بندے کے بس میں

چکر جمعدار نے مجھے سپرنٹنڈنٹ جیل سے ملاقات کی اجازت دلوا کر صبح آٹھ بجے ایک وارڈر کے ہمراہ ڈیوڑھی کے دروازہ پر بھجوا دیا۔ جیل میں قیدیوں کو مجسم ''کیو'' بنا دیا جاتا ہے۔ وہ چلتے ہیں تو قطار میں، کھڑے ہوتے ہیں تو قطار بنانا پڑتی ہے۔ مجھے تین اخلاقی قیدیوں کے ہمراہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر کے سامنے جس پر جالی لگی ہوئی تھی، پہنچا دیا گیا، ہم چاروں کھڑے رہے۔ میانوالی میں جون کے مہینے صبح آٹھ بجے لاہور کے بارہ بجے دوپہر کا گمان ہوتا ہے۔ دھوپ میں اچھی خاصی شدت ہوتی ہے۔ قیدی بیچارے کی اوقات ہی کیا ہے کہ وہ فریاد کی جرأت کر سکے۔ میری حالت یہ تھی کہ تین چار روز سے بھوکا، نیند کا مارا ہوا۔ عمر کے لحاظ سے بھی ضعیف اور ناتواں تھا، قریب کوئی درخت نہ تھا۔ سپاہی کی منشا یہ تھی کہ ہم ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلائیں۔ دم بخود مؤدب کھڑے رہیں، جب اس عذاب میں کھڑے کھڑے دو گھنٹے گزر گئے تو مجھے آنکھوں کے سامنے تاروں کا رقص نظر آنے لگا۔ پیاس سے بُرا حال ہو گیا۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ مجھے واپس لے چلو۔ اس نے جواب دیا۔ باقیوں کی ملاقات ہو جائے یہ لوگ عرض کر لیں تو سب کو اکٹھے واپس جانا ہوگا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ٹیوب ویل چل رہا تھا میں نے سپاہی کو بمشکل رضامند کیا کہ وہ مجھے پانی پی لینے کی اجازت دے۔ سپاہی نے مجھے اس شرط پر کنوئیں تک جانے کی اجازت دی کہ میں ناک کی سیدھ سیدھا جاؤں اور پانی پی کر واپس چلا آؤں۔ میانوالی جیل کا پانی پنجاب کی تمام جیلوں سے بہتر ہے۔ دھوپ کی شدت برداشت کرنے کے بعد ٹھنڈا پانی اللہ کی نعمتوں کا اقرار کرا لیتا ہے۔ پانی پی کر دم میں دم آیا تو پھر دھوپ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ دریافت کرو، کب ملاقات ہوگی۔ اس نے اشارے سے کہا آہستہ بولو، میں نے اور بلند آواز سے کہا کہ دھوپ میں کب تک کھڑے رہیں گے۔ ملاقات نہیں ہوتی تو واپس لے چلو۔ سپاہی

Marfat.com

مجبور ہو گیا۔ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو صاحب موجود نہ تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی ابھی کھانا کھانے گئے ہیں۔ آدھ گھنٹہ بعد آئیں گے۔ آدھ گھنٹے کے لیے ہمیں سرس کے ''قلاش'' درخت کے نیچے دم لینے کی اجازت مل گئی۔ سرس کے درخت میں پتے ہی کتنے ہوتے ہیں جو دھوپ کو روک سکیں تقریباً بارہ بجے ہوں گے کہ فریاد کی اجازت آئی۔ میں سب سے پیچھے تھا۔ آواز آئی، کیا عرض کرنا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں نہ قاتل ہوں، نہ ڈاکو، آپ نے مجھے 302 کے ملزموں میں کس گناہ کی پاداش میں بند کر رکھا ہے۔ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ ایک روزنامہ کا چیف ایڈیٹر، ایک جماعت کا صدر، اخبارات کی انجمن کا رکن ہوں۔ حکومت نے جو ڈیفنس کمیٹی بنائی ہے۔ اس کی رکنیت کا فخر بھی حاصل ہے۔ آج سے تیس! کتیس سال پیشتر اسی جیل میں سپیشل کلاس کے قیدی کی حیثیت سے قید کاٹ چکا ہوں۔ ڈاکو اور قاتل میری سوسائٹی کے لوگ نہیں۔ میں وہاں رہنا نہیں چاہتا۔ ان تمام گزارشات میں سپرنٹنڈنٹ کو صرف ایک بات پر تعجب ہوا۔ وہ تھی اکتیس سال پہلے قید کاٹنے کی بات، صاحب بہادر بڑے حیران ہوئے فرمانے لگے پھر آپ سی کلاس میں کیسے آ گئے؟ میں نے عرض کیا کہ بڑے وزیر یعنی میاں دولتانہ میرے کرم فرما ہیں یہ ان کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کچھ خفیف ہوئے مجھے فرمایا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ کے ہمراہ کلاس تو آئی نہیں۔ آپ کو کلاس لے کر آنا چاہیے تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں ایک مجبور قیدی ہوں یہاں خود نہیں آیا بلکہ لایا گیا ہوں۔ یا بدستے دگرے دست بدستے دگرے۔ آپ میری کلاس کے لیے سرگودھا جیل سے دریافت فرما لیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ آپ ایک درخواست لکھیں۔ میں بھیج دوں گا، میں نے درخواست لکھنے سے انکار کر دیا اور واپسی کی اجازت چاہی۔ صاحب نے فرمایا۔ بہت اچھا واپس چلے جاؤ۔ میں وارڈر کے ہمراہ واپس اپنی کوٹھڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور دل سے فیصلہ کیا کہ اب نہ کوئی درخواست لکھنا ہے اور نہ کوئی سہارا ڈھونڈنا ہے۔ مجھے قید کاٹنا چاہیے۔ رات گزاری، صبح تالے کھلے تو ہم سب جو اِس وارڈ میں تھے، باہر ہوا میں چٹائیاں بچھا کر بیٹھ گئے۔ 302 کے ملزم جو بڑے کڑیل جوان تھے۔ میرے گرد آ کر بیٹھ گئے۔ اب وہ میرا احترام کرتے تھے۔ دو ملزموں کو حکم سننے کے لیے عدالت میں جانا تھا۔ ان میں سے ایک نے یہ سمجھا کہ یہ بوڑھا قیدی نمازیں پڑھتا ہے، تسبیح کرتا ہے۔ یہ کوئی نیک انسان ہے۔ اس سے دعا کرائیں وہ میری چٹائی پر آ بیٹھا اور میرے پاؤں دبانے لگا اور بالآخر مجھے کہا کہ بابا دعا کرو، میں بری ہو جاؤں، میں نے اسے سمجھایا کہ جو تمہارے دل کو لگی ہے۔ وہ

Marfat.com

میرے دل کو نہیں جس خلوص سے تم خود اپنے لیے دعا مانگو گے، میں اُس درد خلوص اور عجز سے کیوں دعا مانگنے لگا۔ اللہ کے سامنے جھک کر صدق دل سے اقرار کرو کہ آئندہ خدا کی منشا کے مطابق زندگی گزارو گے۔ سچے دل سے توبہ کرو۔ وہ قبول کرنے والا ہے۔ مجھے کیا معلوم، تم نے کیا کیا ہے۔ تم خود ہی دعا مانگو۔ وہ وضو کر کے آیا۔ چٹائی میرے قریب بچھالی اور دعا کے لیے مجھے پھر مجبور کرنے لگا۔ میں نے ہر چند سمجھایا کہ نہ میں کوئی بزرگ ہوں اور نہ عالم دین، میں تو ایک گنہگار اور عاجز انسان ہوں۔ تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے سامنے پھنسا بیٹھا ہوں تمہارے لیے کیا دعا کروں گا اور کیا قبول ہوگی، اس نوجوان نے زبردستی میرے دونوں ہاتھ دعا کے لیے دراز کر دیئے۔ خدا جانے اس نوجوان نے کس خلوص سے دعا مانگی تھی کہ وہ عدالت میں جاتے ہی بری ہو گیا اور وہیں شور مچانے لگا کہ واہ بابا تمہاری دعا نے بیڑہ پار کر دیا۔ اس نوجوان کے رشتے داروں نے دریافت کیا یہ کس بابا نے بیڑہ پار کر دیا۔ نوجوان نے میرا نام بتایا اور جیل کی مصیبت کا افسانہ کہہ سنایا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت مجلس احرار میانوالی کا ایک کارکن اپنے کسی ذاتی کام سے عدالت کے باہر موجود تھا۔ اس نے جب رہا ہونے والے کے منہ سے میرا نام سنا تو اس نے کرید کرید کر دریافت کرنا شروع کیا اور حلیہ دریافت کیا تو اسے یقین ہو گیا کہ پھانسی کوٹھڑیوں میں کسے بند کیا گیا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا دفتر احرار میں پہنچا۔ میٹنگ ہوئی۔ احرار کے صدر نے ایک زبردست جلوس نکالا، مظاہرہ کیا اور ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کا رخ کیا۔ ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ آپ نے ہمارے لیڈر سے ناروا بدسلوکی کی ہے۔ ہم احتجاج کرنے آئے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے سپرنٹنڈنٹ کو فون پر کہا کہ آپ نے کیا غضب کر دیا ہے یہ لوگ تو سارے علاقے میں آگ لگا دیں گے۔ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی سے یہ جلوس سیدھا جیل کی طرف چل پڑا۔ میانوالی بہادر پٹھانوں کا علاقہ ہے۔ پٹھان جب ڈھول بجا کر میدان میں اتر آئیں تو عقل وخرد بھاگ جاتی ہے۔ اِدھر یہ کچھ ہو رہا تھا اُدھر مَیں جیل کی سختیاں اور مصیبتیں کاٹ کر ہسپتال کے کمرے میں بجلی کے پنکھے کے نیچے پلنگ پر دراز تھا اور محمد رمضان کی درد بھری کہانی سن رہا تھا کہ وہ کس طرح قتل کے قصے میں رشتہ داروں کی مہربانی سے پھانسی کے تختے پر پہنچا۔ محمد رمضان میرے احساسات کی دنیا میں درد بھری باتوں کی مضراب سے چوٹ لگا رہا تھا۔ ہوا یہ کہ جب میں سپرنٹنڈنٹ جیل سے ملاقات کر کے مایوس لوٹا تو میرے دل کو از خود اطمینان ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں بیٹھا ہی تھا کہ ہسپتال کا نمبردار آیا اور اس نے آ کر میرا نام لیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے، اسباب بھی لے چلو، میں نے چٹائی لپیٹ کر بغل میں دبائی اور لوٹا اٹھا کر اس کے

Marfat.com

ہمراہ ہولیا۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا، بڑی شفقت سے معائنہ کیا، نسخہ لکھا، دوائی تجویز کی اور کہا تم اب ہسپتال میں داخل ہو۔ مجھ سے میرا اتہ پتہ دریافت کیا۔ خود اٹھے اور ایک کمرہ جس مین نمبر دار اور قیدی رہتے تھے خالی کرنے کا حکم دیا اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اس عرصے میں چکر جمعدار نے قیدیوں اور نمبرداروں کے لیے جگہ کا بندوبست کر لیا تھا قیدیوں اور نمبرداروں نے کمرہ خالی کرانا شروع کیا جب کمرہ خالی ہو گیا تو میں اس کمرے میں چلا آیا جو میرے لیے تجویز کیا گیا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں سے آخری قیدی جو بہت بوڑھا تھا اپنا بستر لپیٹ رہا تھا۔ مجھے اس بوڑھے پر ترس آیا میں نے اسے کہا بڑے میاں ذرا ٹھہرو۔ میں ڈاکٹر صاحب سے عرض کرتا ہوں۔ اگر وہ مان گئے تو آپ کو اسی کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت مل جائے گی۔ میں دوبارہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ اس بوڑھے قیدی کو اگر آپ میرے پاس رہنے دیں تو میں تنہائی کی مصیبت سے بچ جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب مان گئے۔ وہ کافی دیر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ مجھے اپنا تعارف خود ہی کرانا پڑا، کمرے میں بجلی کا پنکھا بھی موجود تھا او ریلنگ بھی موجود تھا۔ تھکا ہارا اور گرمی کا مارا۔ میں پلنگ پر دراز ہو گیا۔ میرا بوڑھا ساتھی محمد رمضان عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس کی قید ختم ہو چکی تھی مگر آب و دانہ اُسے جیل میں لیے بیٹھا تھا۔ اتنے میں جیل کا وارڈن میرے کمرے میں آیا اور مجھے کہا چلیے، آپ کی ملاقات ہے۔ میں نے دریافت کیا کون آیا ہے۔ وہ کہنے لگا بہت سے لوگ ہیں۔ چل کر دیکھ لیجیے۔ جونہی میں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا میانوالی کے احرار رہنما اور کارکن دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ مجھے عام اخلاقی قیدیوں کے کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر میرے احرار رفیق سخت مشتعل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے افسران جیل کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے بیچ بچاؤ کر کے انہیں صبر کی تلقین کی اور انہیں واپس بھیج دیا اس ملاقات کے بعد جیل کی فضا میرے حق میں زیادہ سازگار ہوئی۔

میں جب جیل میں تھا تو باہر کیا ہو رہا تھا؟

ائمۂ مساجد اور خطیبوں کو سرکاری متولیوں نے دبانا چاہا۔ ڈپٹی کمشنروں نے اپنے اثر و رسوخ اور پراپیگنڈے سے کام لینا چاہا۔ ایک سرکل کا حوالہ دیا گیا کہ خطبوں میں غلام احمد قادیانی کے خلاف کچھ نہ کہا جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ احراری وطن دشمن ہیں، یہ پرائے اشارے پر مرزائیت کے خلاف اس لیے

Marfat.com

کام کر رہے ہیں کہ پاکستان کو نقصان پہنچایا جائے۔ غرض یہ کہ حکومت کے حاشیہ بردار اور سرکاری افسران نے تحریک کی روک تھام کے لیے بہترے جتن کیے مگر اس روک تھام کا الٹا اثر ہوا جو لوگ احرار کے مخالف تھے۔ وہ بھی اسلام کے بنیادی مسئلے تحفظ ختم نبوت کی حمایت میں احرار کے ہمنوا او رمدد ومعاون بن گئے۔ انتہا یہ ہوئی کہ خطیبوں نے جگہ جگہ اعلان کیا کہ اگر تحفظِ ختم نبوت کے لیے وعظ پر پابندی ہے اور ردِّ مرزائیت کے سلسلے میں کام کرنے والا احراری بن جاتا ہے تو ہم سب احراری ہیں۔ احرار کے جتنے رہنما اور مبلغ باہر کام کر رہے تھے۔ وہ بہت سُلجھے ہوئے ذہن کے لوگ تھے۔ وہ اس مسئلے کو ساری مسلمان قوم کا اور اسلام کا بنیادی مسئلہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے تحریکِ تحفظ ختم نبوت کو مجلس احرار کے نام الاٹ کرانے کی بجائے وسعتِ قلبی اور مومنانہ فراست کا ثبوت دیتے ہوئے ہر مذہبی جماعت سے اپیل کی کہ وہ سب مل کر خدمتِ اسلام کے لیے میدان میں آئیں۔ احرار کی اس فراخدلی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہر جماعت نے اپنے طور پر ردِّ مرزائیت کے لیے پراپیگنڈہ کیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ تمام جماعتیں ایک ہی نہج پر پہنچنے لگیں، چنانچہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ہدایت پر مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام 31 جولائی 1951ء کو صبح آٹھ بجے آل مسلم پارٹیز کنونشن کا ہنگامی اجلاس برکت علی محمڈن ہال لاہور میں زیر صدارت حضرت مفتی محمد حسن صاحب منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت پیر صاحب گولڑہ شریف، دیوان صاحب اجمیر شریف، غرض یہ کہ پیرانِ عظام اور حضرات علماء کرام بہ تعداد کثیر ہر گوشے سے تشریف لائے۔ اس اہتمام میں تقریباً سات سو جید علماء اور پیرانِ عظام نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں حکومت کے رویہ کے خلاف سخت احتجاج ہوئے۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں جن سے حکومت کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں اور حکام کی اکڑی ہوئی گردن خم کھا گئی۔

کنونشن کا دوسرا دور

دوسرا اجلاس بعد دوپہر حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد صاحب قادری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ہال سے باہر فدایانِ ختم نبوت کا بے پناہ ہجوم تھا۔ اس اجلاس میں تین مطالبات متفقہ طور پر پیش کیے گئے۔ مطالبات یہ تھے۔

1- مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔
2- سر ظفر اللہ خان کو وزارتِ خارجہ سے برطرف کیا جائے۔

Marfat.com

3- کلیدی اسامیوں سے مرزائی افسروں کو ہٹا دیا جائے۔

اسی اجلاس میں ہماری رہائی کا مطالبہ بھی پیش ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء کرام اور پیرانِ عظام کا یہ تاریخی اجتماع بہت ہی نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ حکومت کی جانب سے یہ پراپیگنڈہ ہوتا تھا کہ احرار دشمنِ وطن ہیں انہیں بھارت سے روپیہ ملتا ہے۔ یہ مرزائیوں کے بہانے اپنا کھویا ہوا اثر ورسوخ دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس گمراہ کن پراپیگنڈے نے اپنی جڑیں مضبوط کر لیں تھیں۔ اس پراپیگنڈے کو مرزائی اپنے اثر ورسوخ سے مسلم لیگ کے کیمپ سے چلاتے تھے۔ مسلم لیگ کی حکومت تھی سر ظفر اللہ خان کا طوطی بولتا تھا۔ خواجہ ناظم الدین دیندار ہونے کے باوجود اس پراپیگنڈے سے متاثر تھے مگر جب آل مسلم پارٹیز کے اس تاریخی اجتماع میں علماء کرام اور پیرانِ عظام نے احرار سے بھی زیادہ سخت رویہ اختیار کیا اور لگی لپٹی رکھے بغیر حکومت کو واضح الفاظ میں سمجھا دیا کہ یہ مطالبات ساری قوم کے مطالبات ہیں۔ اگر ان مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو حکومت کو رائے عامہ سے ٹکر لینا ہو گی تب حکومت نے کان کھڑے کیے۔ خواجہ ناظم الدین نے بھی ہوش سنبھالا۔ غلط اور گمراہ کن پراپیگنڈے کا جادو ٹوٹ گیا۔ اس شاندار اجتماع کے بعد تحریک کا رخ بدل گیا کوئی مسجد ایسی نہ تھی۔ جس میں ردِّ مرزائیت کے سلسلہ میں جلسہ یا وعظ نہ ہوا ہو کوئی شہر اور قصبہ نہ تھا جہاں احتجاج کے بعد یہ مطالبات دہرائے نہ گئے ہوں۔ ساتھ ساتھ ہم لوگوں کی رہائی کا مطالبہ بھی زور پکڑ گیا۔ تا آنکہ حکومت مجبور ہو گئی اور اس نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ ہمیں قید ہوئے ابھی ایک ماہ نہ گزرا تھا کہ ایک روز ڈیوڑھی سے اطلاع ملی کی رہائی آ گئی ہے۔ چلیے بوڑھا محمد رمضان رہائی سے خوش اور جدائی سے غمگین ہو رہا تھا۔ ملے جلے جذبات میں اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا کہ خدا کو منظور ہوا تو میں بھی ایک روز رہا ہو ہی جاؤں گا۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا..... مجھے اس بوڑھے قیدی سے بے حد ہمدردی تھی وہ نہایت ہی شریف انسان تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میاں رمضان اس میں کوئی شک نہیں کہ میاں دولتانہ صاحب کی حکومت میں میرے ساتھ ناروا سلوک اور سختی ہوئی مگر یہ سیاسی رنجش کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ انہیں میری ذات سے کوئی عناد نہیں تمہاری خاطر میں اُن سے ملوں گا۔ جس روز بھی ملاقات ہوئی۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پہلی بات یہی کہوں گا کہ محمد رمضان کو رہا کر دو۔ میرا وعدہ ہے۔ میں جا رہا ہوں، انشاء اللہ میں بھولوں گا نہیں۔ لو خُدا حافظ اللہ کو منظور ہوا تو باہر ملاقات ہو گی۔

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

Marfat.com

میں ہسپتال میں دوستوں سے مل کر ڈیوڑھی پر آ گیا۔ دفتر میں داخل ہوا تو میرے داخلے کے فوراً بعد سی آئی ڈی کا انسپکٹر ایک وارنٹ کی تعمیل کے لیے آ دھمکا۔ میں نے دریافت کیا کیسا وارنٹ ہے تو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا نے روزنامہ ''آزاد'' کے ایک آرٹیکل کے خلاف دعویٰ کیا ہے کہ اس آرٹیکل سے سپرنٹنڈنٹ کی شہرت کو دھچکا لگا ہے اور اس دھچکے سے سرکاری کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے خلاف یہ لکھا کہ ان حضرات پر مرزائیت کی ہمدردی کا جنون سوار ہے اور مرزائیت کی حمایت میں لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ آخر میں مَیں نے یہ لکھا تھا کہ مَیں نے ایک ذمہ دار افسر سے دریافت کیا کہ آپ کے خلاف پراپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ آپ مرزائی ہیں تو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فرمایا کہ میں مرزائی نہیں، میری بیوی مرزائی ہے۔ اس جرم کی پاداش میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا نے حکومت سے اجازت لی اور دعویٰ کر کے وارنٹ حاصل کر لیا۔ ٹھیک اس وقت جب میں رہا ہو رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کا دعویٰ میری رہائی کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اخبار میں ایڈیٹر اور پرنٹر پبلشر دونوں برابر کے ذمہ دار ہوتے ہیں میں نے کہہ دیا کہ اس لیڈنگ آرٹیکل کا میں تنہا ذمہ دار ہوں۔ میں نے لکھا ہے اور مجھے اقرار ہے اور اگر جرم ہے تو میں اس کی سزا بھگتوں گا۔ شیخ حسام الدین صاحب کو بری الذمہ قرار دینا چاہیے۔ انہیں تو اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ میں نے کیا کیا ہے کہ مگر ضابطے نے ان کو بھی زنجیر میں باندھ لیا۔ مجھے انسپکٹر پولیس نے کہا کہ ضمانت دے دیجیے۔ قابلِ ضمانت جرم ہے۔ میں نے کہا کہ آپ مجھے لینے کے لیے کار لے کر آئے ہوں گے۔ میں ریل میں دھکے کھاؤں، کرایہ پلے سے خرچ کروں اور آپ کار میں تنہا تشریف لے جائیں۔ یہ بات بہت خسارے کی ہے۔ میں ضمانت نہ دوں گا مجھے عدالت میں پیش کرنے کے لیے لاہور لے چلیے۔ کپتان صاحب نے لاہور میں دعویٰ کیا ہے۔ اب لاہور ہی میں ان کی زیارت ہو گی چنانچہ مقامی پولیس کے ایک تھانیدار صاحب اور تین سپاہی پک اپ جیپ کار میں شام کے وقت میانوالی سے مجھے لے کر روانہ ہوئے۔ راستے میں ہمیں مغرب اور عشاء کے لیے خوشاب اور سرگودھا میں ٹھہرنا پڑا، جب ہم سرگودھا پہنچے تو لبِ سڑک ایک تھرڈ کلاس ہوٹل میں چائے پی، میں سفر میں کھانا کھانے کا عادی نہیں ہوں، ہوٹل سے کچھ فاصلے پر میدان میں جلسہ عام ہو رہا تھا۔ اس روز شیخ عبداللہ رہا ہو کر سرگودھا پہنچے تھے۔ وہ ہاروں میں لدے ہوئے تھے۔ مجھے ایک بار تو یہ خیال آیا کہ جلسے میں پیغام بھیج دوں کہ اس جانب ہم بھی تشریف رکھتے ہیں پھر خیال آیا کہ تھانیدار نہایت شریف آدمی ہے۔ عزت و احترام سے لیے جا رہا ہے۔ اسے

Marfat.com

خواہ مخواہ جواب دہ ہونا پڑے گا۔ جلسے میں تقریر ہوتے ہوئے میرا اور شیخ صاحب کا نام بھی لیا گیا، مگر تھانیدار بالکل غیر سیاسی آدمی تھا، بہت سیدھا سادہ سیّد تھا، میں نے انہیں اشارے سے کہا کہ یہ جگہ خطرناک ہے اگر جلسہ گاہ میں کسی کو پتہ چل گیا کہ میں یہاں موجود ہوں تو سارا جلسہ اُٹھ کر اِدھر ہی دوڑ پڑے گا۔ چلیے کوئی دیکھ لے گا تو آپ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ ہم سرگودھا سے روانہ ہو کر جب لاہور پہنچے تو نو لکھا تھانے کی مسجد میں فجر کی جماعت ہو چکی تھی۔ میں نے تھانیدار سے کہا کہ مجھے تھانے میں سپرد کرنے سے پیشتر نماز ادا کر لینے دیجیے چنانچہ نماز ادا کر کے تھانے پہنچے تو سب کو ناواقف اور نو وارد پایا۔ مجھے حوالدار نے نہ پوچھا کہ کون ہو، کیسے ہو؟ اور نہ بیٹھ جانے کو کہا۔ اس سلوک کے جواب میں مَیں نے بھی مناسب رویہ اختیار کیا اور کہا کہ حوالات میں بند کرنا ہو تو کر دیجیے جو کچھ کرنا ہے۔ کیجیے میں رات کا جاگا ہوا ہوں۔ مجھ نیند آ رہی ہے۔ حوالدار نے کہا کہ ابھی بہت کچھ لکھنا پڑھنا ہے۔ افسران سے دریافت کرنا ہے۔ اس کے بعد حوالات میں بند کیے جاؤ گے میں نے کہا تو بہت اچھا یہ لو میں سونے لگا ہوں۔ وہیں بستر کی ٹیک لگا کر لیٹ گیا۔ اتنے میں ایس ایس پی مرزا نعیم الدین کا فون آیا کہ میں آ رہا ہوں۔ ماسٹر صاحب موجود ہیں۔ تب تھانے میں ہلچل ہوئی مگر ان کی تشریف آوری کے قبل مجھے معلوم ہوا کہ لاہور میں گزری رات بڑا خوفناک ہنگامہ ہوا، مسلم لیگ کا اجلاس لکشمی بلڈنگ میں منعقد ہوا۔ باہر سے لوگوں کے ہجوم نے لکشمی بلڈنگ کو گھیر لیا۔ خشت بازی ہوئی۔ لیڈران کرام کو بڑی مشکل سے کوٹھیوں تک پہنچنا نصیب ہوا۔ کاریں ٹوٹ گئیں اور سب سے زیادہ شرمناک یہ بات ہوئی کہ مستورات بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ بیگم جی اے خان کی کار پر حملہ ہوا۔ شیشے توڑ ڈالے گئے اور انہیں اور ان کے ڈرائیور کو زخمی کر دیا گیا۔ وہ ہسپتال پہنچ گئیں۔ مجھے تھانے ہی میں لوگوں کی سرگوشیوں سے اس واقعہ کا پتہ چل گیا۔ میں رہا ہو کر دفتر پہنچا تو تھوڑی دیر آرام کیا اور سیدھا میو ہسپتال بیگم جی اے خان کو دیکھنے کے لیے گیا، وہ میری ہم وطن اور میرے عزیز دوستوں کی بہن ہیں۔ مجھے ان سے دُہری ہمدردی تھی، جب انہیں معلوم ہوا کہ میں جیل سے آ رہا ہوں اور آج صبح پہنچا ہوں تو وہ حیران ہوئیں۔ فرمانے لگیں کہ تمہارے ذمے تو لگایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ تمہیں نے کیا ہے۔ میں نہ مانتی تھی۔ بہرحال میں واپس لاہور آیا تو اس ہنگامے نے حالات خراب کر دیئے تھے۔ دفعہ 144 کا نفاذ تھا، پانچ آدمی اکٹھے مل کر چل نہ سکتے تھے۔ شہر میں ہراس پھیلا ہوا تھا اور ایسا ہونا لازم تھا ؎

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

Marfat.com

ہمیں باہر آ کر معلوم ہوا کہ تحفظ ختم نبوت کے لیے قوم میں کس قدر جذبہ اُبھر آیا اور یہ کہ علماء دین اور پیرانِ عظام نے گوشہ تنہائی کو چھوڑ کر برکت علی محمڈن ہال میں کیا شاندار اجتماع کیا۔ جب ہمارے رفقاء نے ہمیں برکت علی محمڈن ہال کے تاریخی اجتماع کا آنکھوں دیکھا حال سنایا تو میری آنکھوں سے مسرت کے آنسو ٹپکنے لگے۔ معلوم ہوا کہ جب حضرت پیر صاحب گولڑہ شریف ہال میں تشریف لائے تو حضرت امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ صاحب بخاری بے تابانہ ان کے استقبال کے لیے پنجابی کا یہ شعر پڑھتے ہوئے آگے بڑھے۔

سبحان اللہ ماا جملك ما احسنك ماا كملك

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں

گھٹنوں پر جھکے عقیدت مندانہ سلام کیا، حضرت پیر صاحب نے بخاری صاحب کو گلے لگا لیا۔ دیکھنے والوں پر رقت طاری ہوگئی۔ عجیب سماں تھا۔ شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ حضرت شاہ صاحب پیر مہر علی شاہؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر چکے تھے۔ اپنے پیر کے صاحبزادہ بلند اختر کے لیے حضرت شاہ صاحب ایسے رقیق القلب، مخلص اور صاف دل انسان کے سینے میں جذبۂ عقیدت کس طرح موجزن ہوگا۔ اس تاریخی اجلاس کی کیفیت ہی عجیب تھی۔ تحفظِ ختم نبوت کے لیے بے پناہ جذبہ موجود تھا۔ آتش بیانوں نے عشق رسول میں سرشار ہو کر حرمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کٹ مرنے کے لیے کیا کچھ نہ کہا ہوگا۔ اس اجلاس کے انعقاد سے قبل حکومت تذبذب میں مبتلا تھی۔ کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ سب مکتب خیال کے علماء اور پیرانِ عظام اگر ایک جگہ جمع ہو گئے اور کوئی فیصلہ کر بیٹھے تو حکومت مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے اس اجتماع پر پابندی لگا دی جائے۔ پھر خیال آیا کہ اگر پابندی لگا دی گئی تو پراپیگنڈہ ختم ہو جائے گا کہ یہ سوال احراریوں کی طالع آزمائی کے لیے کھڑا کیا ہے اس لیے کہ پابندی ان لوگوں پر لگائی جائے گی، جنہیں احرار کے خلاف یا کم از کم احرار سے آج تک دور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غرض یہ کہ اس تذبذب میں حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار اور وزراء مشورہ کرتے رہے اور کوئی فیصلہ نہ کر سکے تا آنکہ اجلاس متعینہ تاریخ پر آ پہنچا۔ تب حکومت نے براہ راست مداخلت کی ٹھانی۔ یعنی یہ کہ سرکاری کارندے اجلاس میں شریک ہوں۔ احرار کے تجربہ کار سالاروں اور رضا کاروں نے جرأت، جوانمردی اور سیاسی فراست کا ثبوت دیا اور کسی سرکاری آدمی کو ہال کے اندر جانے نہ دیا جائے۔ اس پابندی پر جھگڑے کا احتمال تھا مگر بپھرے ہوئے مسلمانوں اور مذہبی رہنماؤں

Marfat.com

کے زبردست اجتماع نے حکومت کو ایسا مرعوب کیا کہ وہ دبک گئے، یہ اجتماع بہت دوررس نتائج کا حامل ہوا اور ساتھ پنجاب، سرحد اور سندھ بے حد متاثر ہوا اور مسئلہ تحفظِ ختمِ نبوت مسلمانوں کا قومی اور مذہبی مسئلہ قرار پا گیا۔ ان حالات میں یہ چرچا عام ہو گیا کہ اس گراں قدر بوجھ کو تنہا احرار کے کندھوں پر نہ ڈالا جائے۔ ساری ملت تحفظِ ختمِ نبوت کے مقدس فرض کی ادائیگی میں بقدر استطاعت.....اور تنہا احرار کو مرزائیوں اور حکومت کی ملی بھگت کا نشانہ بننے کا موقع نہ دے۔ اس بارے میں ذمہ دار حضرات نے تگ و دو شروع کر دی۔ اب سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کی کس کس جماعت کو دعوت دی جائے۔ اندیشہ یہ تھا کہ آج تک اختلافی مسائل کے جھمیلوں میں مسلمانوں نے جو گروہ بندی یا الگ الگ جماعتیں بنا رکھی ہیں یہ کیونکر ایک دوسرے سے قریب آئیں گی مگر برکت علی محمڈن ہال کے مشترکہ اجتماع نے حوصلہ دلایا کہ مسئلہ ختم نبوت ہی ایک ایسا متفقہ اور بنیادی مسئلہ ہے جس میں شیعہ، سنی، اہل حدیث، اہل سنت، دیوبندی اور بریلوی سب کے سب متفق ہیں۔ اور سرکارِ مدینہ ﷺ کے نام کی برکت سے تمام جماعتوں کو خواہ وہ کسی بھی مکتب خیال سے تعلق رکھتی ہوں آسانی سے جمع کیا جا سکتا ہے۔

مجلس عمل کا قیام

دینی جماعتوں میں جب یہ جذبہ انتہائی عروج کو پہنچ گیا کہ سب کو مل کر ختم نبوت کے بنیادی مسئلے پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے تو جولائی 52ء میں لاہور میں مندرجہ ذیل جماعتوں کے نمائندوں کا اجتماع ہوا۔

مجلس احرار اسلام پاکستان	جماعت اسلامی
جمعیت علماء پاکستان	جمعیت علماء اسلام
جمعیت اہل حدیث	تنظیم اہل سنت والجماعت
ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان	

اخباری نمائندگان میں مولانا اختر علی خاں، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش

پہلا اجلاس زیر صدارت حضرت مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری مدظلہ، کارخانہ حاجی دین محمد صاحب بادامی باغ میں منعقد ہوا۔ ابتدائی گفتگو نہایت خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ نمائندگان نے اپنی جماعتوں سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ وہ ذمہ دارانہ حیثیت سے اس گفتگو میں شمولیت فرمائیں گے حضرت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی علالتِ طبع کے باوجود اجلاس میں شریک ہو گئے۔

Marfat.com

انتخاب

پہلی نشست میں مجلس عمل کی تشکیل عمل ہوئی اور عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ اتفاق رائے سے حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب صدر اور مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مولانا محمد طفیل صاحب جماعت اسلامی کو نائب صدارت کا عہدہ تفویض کیا گیا اور ابتدائی مرحلہ نہایت ہی کامیابی سے اختتام پذیر ہوا۔ جونہی مجلس عمل نے میدان عمل میں قدم بڑھایا۔ مسلمانوں کے اس اقدام سے قادیانی محل کی دیواریں متزلزل ہونے لگیں۔ مرزا محمود نے اس صورت حال کو بھانپا اور جب محسوس کیا کہ مسلمانوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ ردِّ مرزائیت اور تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں مل کر کام کریں گے تو وہ بوکھلا گئے اور اول فول بکنا شروع کیا۔ انہیں یہ محسوس ہوا کہ ان کے باوا کی امت پر مایوسی اور ہراس چھا رہا ہے تو اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے انہیں کراچی اور سر ظفر اللہ کو ربوہ آنا جانا پڑا۔ خاموش بیٹھ کر موت کا انتظار کرنے کی بجائے انہوں نے مسلمانوں پر تابڑتوڑ حملے شروع کردیئے۔ مرزا محمود کو الہامی خواب آنے لگے۔

مجلس عمل کی مکمل تشکیل

صدر: حضرت مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری (جمعیت علماء پاکستان)

نائب صدر: مولانا محمد طفیل صاحب (جماعت اسلامی)

ناظم اعلیٰ: مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی (جمعیت اہل حدیث)

ناظم: سید مظفر علی شمسی (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان)

ہر جماعت سے دو دو نمائندے لیے گئے جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

1- جمعیت علماء پاکستان (i) مولانا ابوالحسنات (ii) مولانا غلام محمد ترنم صاحب

2- جمعیت علماء اسلام (i) مولانا محمد طفیل صاحب (ii) مولانا عبدالحلیم صاحب

3- جمعیت اہل حدیث (i) مولانا محمد داؤد غزنوی صاحب (ii) مولانا عطا اللہ حنیف

4- جمعیت المشائخ صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب

5- جمعیت ناجیہ مولانا محمد امین صاحب ترنگزئی

6- انجمن حزب الاحناف (i) مولانا غلام دین صاحب (ii) مولانا ارشد بناہلوی صاحب

Marfat.com

7- جماعت اسلامی (i) مولانا نصر اللہ خان عزیز (ii) مولانا محمد طفیل صاحب
8- تنظیم اہل سنت والجماعت (i) مولانا نور الحسن شاہ بخاری (ii) مولانا عبدالعلیم
9- مجلس احرار اسلام (i) ماسٹر تاج الدین انصاری (ii) شیخ حسام الدین صاحب
10- اخبارات کی جانب سے (i) مولانا اختر علی خان (ii) مولانا مرتضٰی احمد خان میکش

سیاسی خواب

یہاں میں مرزا محمود کے خوابوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

مرزا محمود اپنی کامیابی کے لیے ایک پروگرام مرتب کرتے ہی اور اسے لباسِ عمل پہنانے کے لیے اعلان کرنا چاہتے ہیں تو وہ کھل کر بات نہیں کہتے بلکہ ''الفضل'' کے ذریعے اپنا مافی الضمیر استعاروں میں بیان فرماتے ہیں۔ پروگرام کے مطابق انہیں خواب آتا ہے وہ اپنے خواب کو رویا کہتے ہیں۔ ان کے ماننے والے اور عقیدت مند جانتے ہیں کہ مرزا محمود قادیان کے جھوٹے نبی کا کامیاب بیٹا ہے۔ ''الفضل'' ان خوابوں کو نہایت اہتمام سے چھاپتا ہے۔ مرزائی حضرات اس خواب کا مطلب سمجھ جاتے ہیں اور بیگانے شور مچا کر حکومت کو متوجہ کرتے ہیں کہ دیکھیے مرزا محمود کیسے خطرناک خواب بیان فرما رہے ہیں۔ حکومت سنتی ہے اوّل تو اسے مرزا محمود کے کھونٹے کی جانب دیکھنا نہیں ہوتا، اگر عوام کے احتجاج میں زیادہ زور ہوا تو حکومت بحالت مجبوری قانون کو حرکت میں لانا چاہتی ہے۔ قانونی مشیر سے دریافت کیا جاتا ہے کہ مرزا محمود اور اس کا آرگن قانونی گرفت میں آسکتا ہے؟ جواب ملتا ہے قانون عاجز ہے۔ مرزا محمود یا ''الفضل'' قانونی گرفت سے باہر ہیں۔

خواب کی بات ہی کیا خواب گیا، بات گئی

اس طرح مروجہ قانون منہ تکتا رہ جاتا ہے اور مرزا محمود اپنا پروگرام سمجھا اور چلا لیتے ہیں۔

مرزا محمود کو خواب آیا

مجلسِ عمل کے قیام سے قبل جب احرار نے مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ امتِ مرزائیہ ملتِ اسلامیہ کی بدترین دشمن ہے۔ وہ اسلام کے بنیادی مسئلے تسلیم نہیں کرتی تو مرزائیوں نے بھی احرار کے خلاف اتہامات کا طوفان کھڑا کر دیا۔ کبھی احرار کو پاکستان کا دشمن بتایا اور کبھی بھارت کا ایجنٹ بنا کر عوام میں احرار کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی مگر حق کی فتح

Marfat.com

ہوئی اور مرزائیوں کے اوچھے وار ناکام ہوگئے۔ البتہ مرزائیت مسلمانوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگی۔ تا آنکہ مرزائیوں کے کیمپ میں ہراس پھیل گیا اور مرزا محمود خود بھی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں مرزا محمود نے محسوس کیا کہ زمین ان کے پیروں تلے سے نکلی جا رہی ہے اور یہ کہ مرزائی کیمپ پر مردنی چھا گئی ہے تو مرزا صاحب نے خوابوں کا پروگرام چالو کر دیا۔ خواب بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس خواب کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ امت مرزائیہ کو پاکستان کی سرزمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ نظر آنے لگی۔ مرزا محمود نے اپنے خطبوں میں یہ بھی کہا کہ مرزائیوں کو پاکستان سے باہر رشتے ناطے تلاش کرنے چاہئیں۔ تاکہ مصیبت کے وقت پاکستان سے جانا پڑے تو باہر کے رشتے داروں کے ہاں ٹھکانہ مل سکے۔ ان پیش بندیوں نے اُمتِ مرزائیہ کو بالکل بے حوصلہ کر دیا۔ اب مرزا محمود کو نئی ترکیب سوجھی۔ اس نے بھارت کا سہارا لینا چاہا۔ ظاہر ہے کہ بھارت اور پاکستان دو ہمسایہ ملک ہیں۔ سرحدیں ملتی ہیں چنانچہ مرزا محمود نے ایک اور بڑا عجیب و غریب خواب دیکھا۔ مرزا محمود نے خود ہی بتایا کہ کیا دیکھتا ہوں۔ میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوں۔ اتنے میں مہاتما گاندھی جی میری طرف آئے اور چارپائی پر میرے ساتھ لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر لیٹے۔ پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا جسم کس قدر موٹا ہے۔

خواب کی تعبیر

خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے مرزا محمود نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ''پاکستان اور بھارت دونوں ملک پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ ان دو ملکوں کی علیحدگی عارضی ہے''۔ دیکھا مرزا محمود نے کتنی خوفناک پیش گوئی کی اور کس خوبصورتی سے اپنے باوا کی اُمت کو تسلی دی کہ پاکستان میں اگر آج مرزائیوں کی ریشہ دوانیاں طشت از بام ہو چکی ہیں تو کیا ہوا؟ ہم بھارت سے تعلق پیدا کر لیں گے اور یہ پاکستان ہے کیا؟ بلا یہ تو زہے گا نہیں۔ چند دنوں کی بات ہے۔ دونوں ملک ایک ہو جائیں گے۔ اس قسم کی باتیں ملک سے غداری اور صریح بغاوت کا پیش خیمہ ہیں مگر مرزا محمود کو کسی نے ٹوکا تک نہیں، کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ مرزا صاحب آپ کے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ اس خواب کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مرزائیوں کو ایک امید بندھی کہ پاکستان تھوڑے عرصے میں ختم ہو جائے گا۔ گاندھی جی مرزا محمود کی چارپائی پر لیٹ کر پیار کر گئے ہیں۔ مرزا محمود نے بادلِ ناخواستہ ان کے ساتھ لیٹے رہنا قبول کر لیا۔ اب

Marfat.com

مرزائیوں کا بھارت سے یارانہ پکا ہو جائے گا گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ حوصلے سے چند دن گزارا کرو۔ غرض یہ کہ خواب بیان کر کے اونگھتے ہوئے مرزائیوں کو مرزا محمود نے جگالیا اور مطلب حل کر لیا۔

مرزا محمود نے مرزائیوں کو اُکسایا

مرزا محمود کے پہلے خواب یعنی گاندھی جی کے قرب والے خواب سے اُمتِ مرزائیہ نئے اندازِ فکر سے لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر آئی۔ کہیں ظفر اللہ خان کا دورہ اور کہیں مناظروں کا چیلنج اور کہیں مرزائی افسروں کے سہارے۔ غرض یہ کہ مرزائیوں نے اودھم مچانا شروع کیا۔ جس کھاتے پیتے مرزا کو دیکھو، پستول لگائے ہوا ہے اور جس مبلغ کو دیکھو لٹھ لیے پھرتا ہے۔ اچھی خاصی ہلچل شروع ہو گئی۔ مرزا محمود نے ایک خوفناک تقریر کی۔ اس تقریر میں مرزا محمود نے بڑے حوصلے سے اُمتِ مرزائیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے باوا کی امت 1952ء گزرنے نہ پائے۔ مرزائیت کے ہر مخالف کو مجبور کر دو کہ وہ مرزائیت کے سامنے جھک جائے اور ہتھیار ڈال دے۔ اس تقریر سے کافی حد تک تلخی پیدا ہوئی اور حالات بگڑ گئے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔ حکومت کے کل پرزے مرزائیت کے مقابلے میں بے حس ہو چکے تھے۔ مرزا محمود کو نہ کوئی نوٹس جاری کیا گیا اور نہ حکومت نے مرزا صاحب کو اس قسم کی فساد انگیز تقریر کرنے سے منع کیا اگر کوئی مسلمان عالم کہیں اتنی بات کہہ دیتا کہ سال گزرنہ نہ پائے، ختم نبوت کے منکر جانے نہ پائیں اور انہیں اس قدر مجبور کر دیا جائے کہ وہ اسلام کے سامنے جھک جائیں اور ہتھیار ڈال دیں اور فاسد عقیدے سے تائب ہو جائیں تو ایک قیامت بپا ہو جاتی۔ حکومت کی مشینری فوراً حرکت میں آ جاتی اور مسلمان عالم کو خانہ خدا کی بجائے جیل میں قیدیوں کے سامنے وعظ کہنے پر مجبور ہو جانا پڑتا۔ ''آزاد'' ایسی تقریر شائع کر دیتا تو وہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جاتا اور اس کے ایڈیٹر کو جیل کی ہوا کھانا پڑتی۔ حکومت نے ایک آنکھ موند رکھی تھی اسے بالکل نظر نہ آتا تھا کہ مرزائی کیا گُل کھلا رہے ہیں۔ اس کا عتاب صرف مسلمان جماعتوں پر تھا۔

مرزائی سرکاری ملازمین کو ہدایت

مرزا محمود ایک قدم اور آگے بڑھے اور ''الفضل'' کے ذریعے مرزائی سرکاری ملازمین کے نام ہدایات جاری کیں۔ جن کا مفہوم یہ تھا کہ ملازمت کے یہ معنی نہیں کہ اس ذریعے سے صرف روٹی کمائی

Marfat.com

جائے بلکہ اس ذریعے سے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مرزائیت کی کیا خدمت ہوئی یعنی مرزائی سرکاری ملازمین کو سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے مرزائیت کے مبلغ کا کام بھی کرنا چاہیے۔ یہ ہدایت ایسی تھی۔ جس پر حکومت کو فوراً نوٹس لینا چاہیے۔ تبلیغ کانفرنسوں میں علماء حضرات نے احتجاج کیا اخبارات نے مقالے لکھے "آزاد" نے مسلسل اداریے لکھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ حکومت کیوں خاموش ہے اور مرزا محمود کو کیوں کھلی چھٹی دے رکھی ہے؟ مگر حکومت کی مشین میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی اور خلیفہ محمود من مانی کارروائیاں کرتے رہے۔

ایک خطرناک واقعہ

اٹک کے پُل پر پولیس کے علاوہ فوجی پہرہ بھی موجود رہتا ہے۔ آنے جانے والوں کی سختی سے دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ ایک روز پل کے پہرہ داروں نے ایک مشکوک ٹرک کو روک لیا۔ تلاشی لینے پر اس ٹرک سے تھری ناٹ تھری کی رائفلیں برآمد ہوئیں۔ یہ رائفلیں ایک مرزائی کپتان چرا کر لیے جا رہا تھا۔ ٹرک پکڑا گیا اور فوجی کپتان کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس کے بعد ضابطے کے مطابق مرزائی فوجی کپتان کو فوج کے سپرد کر دیا گیا ہوگا تاکہ اس کے خلاف فوجی عدالت میں کارروائی ہو۔ ہمیں اتنا دور جانے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہمیں یہ حق پہنچتا تھا کہ ہم دریافت کرتے کہ اس فوجی کپتان کا کیا حشر ہوا مگر اس واقعے سے جب یہ اخبارات میں شائع ہوا تو ایک سنسنی پھیل گئی۔ ہم نے اسے ایک بار شائع کیا۔ حکومت کو متوجہ کرنے کے لیے اسے اخبارات میں اچھالنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ مجلس عمل نے ایسی تمام شکایات پر غور کیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ مرزائیت نے ملکی نظام کو جس طریقے پر سبوتاژ کرنا شروع کیا ہے اس کا تدارک ہونا چاہیے۔ چنانچہ وزیراعظم ناظم الدین صاحب کی خدمت میں درخواست کی گئی کہ مجلس عمل کا ایک وفد آپ سے ملاقات کی اجازت چاہتا ہے۔ موقع دیجیے کہ وفد حاضرِ خدمت ہو سکے۔ تاریخ، وقت مقرر ہو گیا۔ وفد نے ملاقات کی اور حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے مطالبہ کیا کہ حکومت کو مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں پر توجہ دینا چاہیے۔ مرزا محمود اور اس کے کارندے حدود سے آگے قدم بڑھا رہے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ملک و ملت کو گزند پہنچا دیں گے اور خطرناک پروگرام کو جامۂ عمل پہنانے میں کامیابی حاصل کر لیں گے۔ اس ملاقات میں جب فوجی ٹرک اور مرزائی کپتان کے بارے میں شکایت کی گئی کہ وہ سرکاری اسلحہ چرا کر لیے جا رہا تھا کہ پکڑا گیا تو خواجہ صاحب فرمانے لگے

Marfat.com

کہ آپ حضرات کس قسم کے افسانے سنا رہے ہیں۔ بھلا ایسی حرکت بھی ہوسکتی ہے؟ تب وفد نے انہیں یقین دلایا اور کہا کہ یہ خبر تمام اخباروں میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں کہ جسے ہم نے گھڑا ہے اور آپ کو گمراہ کرنے کے لیے سنا رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے، حیرانی ہے کہ ایسے سنگین واقعات سے آپ کو بے خبر رکھا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے سیکرٹری کی طرف دیکھا اور فرمایا: کیوں بھئی ایسا کوئی واقعہ ہوا؟ ہمیں اس قسم کی کوئی خبر سرکاری ذرائع سے پہنچائی گئی ہے؟ سیکرٹری بڑا مستعد اور باخبر نوجوان تھا۔ اس نے فوراً کہا کہ ہاں حضور اٹک کے پُل پر ایک ٹرک پکڑا گیا۔ جس میں چوری کا اسلحہ تھا اور ایک کپتان اس اسلحے کو چرا کر لیے جا رہا تھا۔ واقعہ درست ہے۔ اس پر ہمیں کچھ سہارا مل گیا اور ہم نے باقی شکایات کا دوبارہ تذکرہ کیا اور ہر شکایت پر ذمہ داری سے ثبوت مہیا پہنچانے کا وعدہ کیا۔ بشرطیکہ حکومت فوراً تحقیقات کا وعدہ کرے۔ خواجہ صاحب نے آخر میں فرمایا کہ ہم اپنے طریقے سے تحقیقات کریں گے۔

دوسرا خطرناک واقعہ

چونیاں ضلع لاہور کے ایک مرزائی ریلوے افسر نے ریلوے کا بہت سا سرکاری مال چرا کر ربوہ بھجوا دیا۔ وہ بہت سا پیتل اور سکہ بھی چرا چکا تھا۔ جسے اس نے گودام سے نکلوا کر باہر چھپا رکھا تھا۔ یہ خبر کسی طرح پولیس کے کانوں تک پہنچ گئی۔ پولیس نے چھاپہ مارا۔ مال برآمد کر لیا اور مرزائی ریلوے افسر کو دھر لیا گیا۔ تحقیقات شروع ہوگئی۔ ہمیں ریلوے کے باقی مال کے چرائے جانے کی چنداں پروانہ تھی۔ مرزائی ربوہ کی تعمیر میں مصروف تھے جب سرکار نے انہیں لاکھوں کروڑوں روپے کی زمین کوڑیوں کے دام عطا کر دی تو تھوڑا سا سامان بھی سرکاری گوداموں سے ربوہ پہنچ جائے تو کیا قیامت آ جائے گی مگر ہمیں حیرانی تو یہ تھی کہ سکہ کس غرض کے لیے ربوہ لے جایا جا رہا تھا؟ ہمارا دھیان فوراً اس بارود کی طرف منتقل ہوگیا جو چنیوٹ سے مرزائیوں نے خریدا تھا۔ قارئین بھولے نہ ہوں گے کہ ایک روز چنیوٹ کے لائنس دار سے مرزائیوں نے تقریباً سوا من بارود خریدا۔ جب احرار نے شور مچایا کہ مرزائی اس بارود کو ربوہ کس کام کے لیے لے گئے ہیں۔ حکومت تحقیقات کرے۔ اس بارود کا قصہ اخبارات میں بھی شائع ہوا اور لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں، سب کچھ ہوا مگر ہماری حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی جب چونیاں کے واقعات نے صحیح صورت حال کو سمجھ لینے میں آسانی پیدا کر دی۔

Marfat.com

بارود کے کارتوس اور سکے سے گولی بنتی ہے۔ مرزا محمود کا اعلان کہ ''52ء گزرنے نہ پائے بہادر مرزائیو تیاری کرلو'' ہم نے بات کو سمجھا اور کوشش کی کہ مسلمان قوم بھی سمجھے اور خبردار ہو جائے۔ اگر حکومت نہیں سنتی تو نہ سنے ہم اپنا فرض تو ادا کریں۔ مسلم لیگ کی ''خالص اسلامی'' حکومت نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی اور کانوں میں تیل ڈال لیا کہ مجلسِ عمل کی آواز سنائی نہ دے مگر مجلس عمل نے قوم کو بیدار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، کانفرنسوں کا جال بچھ گیا۔ ''زمیندار'' اور ''آزاد'' کے صفحات تحفظِ ختمِ نبوت کے لیے وقف تھے۔ حضرت مولانا ابوالحسنات کی قیادت میں جو کانفرنسیں ہوئیں۔ ان میں حاضری کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ فدایانِ ختم نبوت کا ہجوم سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ یہ کانفرنسیں کراچی سے لے کر پشاور کے سرحدی علاقے تک منعقد ہونے لگیں۔ پنجاب جہاں مرزائیت کا مرکز تھا تحفظ ختم نبوت کی تحریک کا مرکز بن گیا۔ راولپنڈی، جہلم، گجرات، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، لاہور، شیخوپورہ، منٹگمری، ملتان، ڈیرہ غازیخان کے اضلاع میں کوئی شہر یا قصبہ ایسا باقی نہ رہا، جہاں ردِّ مرزائیت کے سلسلے میں عظیم الشان کانفرنسیں نہ ہوئی ہوں۔ جوں جوں تحریک زور پکڑ رہی تھی، مرزا محمود بھی چوکس ہو کر مرزائیوں کے مورال کو قائم رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی حرکت کرتے رہتے تھے مگر مجلسِ عمل کے رہنما ٹھوس بنیادوں پر تحریک چلا رہے تھے۔ ان تبلیغ کانفرنسوں میں چند اعتراضات پیش کیے جاتے تھے۔ جن کا مرزائیوں کے ہاں کوئی جواب نہ تھا اور حکومت زبان حق کو بند کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ ان اعتراضات کی نوعیت یہ تھی: مثلاً مجلس عمل کے رہنما کہتے تھے کہ۔

1: سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ ہیں یا مرزائیت کے مبلغ، وہ بیرونی ممالک اور پاکستانی سفارت خانوں کے ذریعے بیرونی دنیا میں مرزائیت کو متعارف کروا رہے ہیں۔ پاکستان کے خزانے سے تنخواہ وصول کر کے انہیں اسلام کے خلاف تبلیغ کا کیا حق ہے؟ مرزائیت کی تبلیغ کرنا مقصود ہے تو سر ظفر اللہ خان مستعفی کیوں نہیں ہو جاتے۔ مسلمان قوم مطالبہ کر رہی ہے کہ سر ظفر اللہ سے قلمدانِ وزارت چھین لیا جائے۔

2- سر ظفر اللہ خان پاکستان گورنمنٹ ... زیادہ اپنے خلیفہ محمود کے وفادار ہیں چونکہ ان کی وفاداری کا مرکز ربوہ میں ہے۔ ا... رت خارجہ کی اہم ترین ذمہ داری ایسے شخص کو سونپنا بالآخر سخت خسارے کا باعث ہو

3- مرزا محمود کے ارادے بڑے خطرناک ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ ربوہ مرزائیوں کا مضبوط

Marfat.com

قلعہ بنتا جارہا ہے۔خدا جانے اس کے اندر کیا کچھ ہورہا ہے۔اسی لیے کسی غیر مرزائی کو ربوہ میں رہنے کی اجازت نہیں، سرکاری کارندے بھی ربوہ میں بلا اجازت داخل نہیں ہو سکتے، کس طرح معلوم ہو سکے گا کہ اندر کوئی سازش تو جنم نہیں لے رہی؟

4- ہم جاننا چاہتے ہیں کہ چنیوٹ سے سوامن کے قریب بارود کس لیے خرید کر ربوہ لے جایا گیا۔وہاں آتش بازی کی دُکان تو ہے نہیں۔پھر اس بارود کا مصرف سمجھایا جائے؟

5- مرزائی افسر نے ریلوے کا مال چرا کر ربوہ پہنچایا اور اب وہ سکہ چرا کر کس لیے جارہا تھا، بتائیے کہ اس سکے سے گولیوں کے سوا اور کیا بنایا جا سکتا تھا؟

6- خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان کے حکم کے مقابلے میں یعنی جب خواجہ صاحب نے ظفر اللہ کو مرزائیوں کے جلسہ عام میں جانے سے منع کیا تو سر ظفر اللہ خان نے خلیفہ محمود کے حکم کی تعمیل کی اور وہ دندناتا اسلام کے خلاف تبلیغ کرنے کے لیے جلسہ عام میں جا پہنچے۔ہمیں بتایا جائے کہ ایسے شخص کو وزارت خارجہ جیسا اہم کلیدی عہدہ کیوں سپرد کر رکھا ہے؟

7- مرزا محمود نے مسلمان قوم کو بُری طرح للکارا ہے اور مرزائیوں کو اُکساتے ہوئے کہا ہے کہ 52ء گزرنے نہ پائے، مرزائیت کے مخالفوں کو گھٹنے ٹھکنے پر مجبور کر دو، اس قسم کی اشتعال انگیز باتیں کرنے والے کی حکومت گوشمالی کیوں نہیں کرتی؟

8- جس ملک کی بنیاد قرارداد مقاصد ہے۔وہاں مرزائیت کی تبلیغ کے کیا معنی؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ٹھوس باتیں عظیم الشان کانفرنسوں میں کہی جاتیں تھیں۔نہ تو مرزائیوں کے پاس ان کا جواب تھا اور نہ حکومت میں یہ جرأت تھی کہ مرزا محمود یا سر ظفر اللہ کے خلاف کوئی قدم اٹھاتی۔حکومت سر ظفر اللہ کے سامنے عاجز تھی اور ہمارے نیک دل وزیراعظم خواجہ ناظم الدین یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی عمارت کو سر ظفر اللہ خان سنبھالے کھڑے ہیں، اگر انہیں برطرف کر دیا گیا تو ساری عمارت ہی خدانخواستہ دھڑام سے نیچے آ جائے گی۔یہ وہم یقین کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔بہرحال عوام چلاتے رہے، مجلس عمل خبردار کرتی رہی اور حکومت بے بسی کے عالم میں چپ چاپ بیٹھی تماشہ دیکھتی رہی۔یہ صورت حال مرزائیوں کے لیے حوصلہ افزا تھی، چنانچہ مرزا محمود نے اپنے قلعے کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ربوہ مرزائیوں کی چھاؤنی بن گیا۔پہاڑیوں کی اوٹ میں باقاعدہ مسلح پریڈ ہونے لگی۔مجلس عمل کو معلوم ہوا تو مجلس عمل نے خواجہ ناظم الدین کو پھر خبردار کرنا چاہا۔چنانچہ ان سے ملاقات کا وقت مانگا گیا۔اجازت مل گئی تو مجلس عمل کے

Marfat.com

وفد نے خواجہ صاحب سے پھر ملاقات کی اور انہیں سابقہ شکایات کے ساتھ یہ بھی کہا کہ مرزائی فوجی پریڈ کر رہے ہیں۔ آپ کلہاڑی رکھنے کی اجازت نہیں دیتے اور ان کے پاس تھری ناٹ تھری کی رائفلیں موجود ہیں۔ ربوہ مرزائیوں کا بہت مضبوط قلعہ بن گیا ہے۔ خواجہ ناظم الدین بھلے اور شریف مگر کمزور آدمی تھے۔ وزارت عظمیٰ کو چلانا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ بیل گاڑی چل رہی ہو گاڑی بان کسی بچے کو گاڑی ہانکنے کو بٹھا دے تو گاڑی چلتی رہتی ہے بچہ نہ بھی ہو اور گاڑی بان سو جائے تب بھی بیل چلتے رہتے ہیں مگر مشکل وہاں پیش آتی ہے جب کوئی موڑ آ جائے۔ پاکستان کی گاڑی چل رہی تھی، خواجہ صاحب کی جگہ کوئی اور سادہ مزاج ہوتا تو وہ بھی کام چلا لیتا مگر مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں اور حکومت پر قبضہ کرنے کے خواب نے پاکستان کی گاڑی کو ایک ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا، جہاں ایک ہوشمند، تجربہ کار اور باحوصلہ انسان کی ضرورت تھی۔ یہ حوصلہ خواجہ ناظم الدین میں موجود نہ تھا اور نہ وہ اس خطرناک صورت حال کو ٹھیک طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ہم نے یہ عرض کیا کہ مرزائیوں نے ربوہ کو مضبوط قلعہ بنا لیا ہے تو خواجہ صاحب نے چونک کر فرمایا: یہ بالکل غلط ہے۔ ہم سرگودھا کی سڑک پر سے موٹر میں گزرے ہیں۔ ہم نے راہ چلتے ربوہ دیکھا ہے۔ وہاں تو کوئی قلعہ نہیں، بے ہنگم سے پتھروں کی ایک چھوٹی سی چار دیواری ہے۔ آپ کو کس نے بتایا کہ وہاں قلعہ بن گیا ہے؟ ہمیں خواجہ صاحب کی سادگی اور معاملہ فہمی پر ہنسی بھی آئی اور دُکھ بھی ہوا کہ یہ ہمارے وزیر اعظم ہیں یہ قلعہ کا مفہوم بھی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ہم نے انہیں سمجھایا کہ اُمتِ مرزائیہ ربوہ میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ باہر والوں کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے اس شکایت پر بھی عرض کیا کہ وہاں بلا لائسنس کا اسلحہ بھی موجود ہے اور مسلح پریڈ ہوتی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آج ہی چھاپہ مارنے کا بندوبست کیجیے اور ہمارے ہمراہ کسی کو بھیج دیجیے کل کے لیے ہم ذمہ داری نہیں لے سکتے اس لیے کہ حکومت کی مشین پر سر ظفر اللہ خان چھائے ہوئے ہیں۔ وہ مرزا محمود کو خبردار کر دیں گے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو مرزا محمود کی اپنی سی آئی ڈی یعنی سرکاری مرزائی ملازم مرزا محمود کو قبل از وقت اطلاع دے کر احتیاطی تدابیر کر لینے کا موقع دیں گے۔ تب ہم جھوٹے ثابت ہوں گے۔ خواجہ صاحب نے اس بارے میں مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم اپنے طور پر تحقیقات کا بندوبست کریں گے۔ ہم نے اسی وقت معذرت کی اور کہا کہ آپ کی تحقیقات بحالات موجودہ مکمل نہ ہو گی۔ بہر حال اس ملاقات میں بھی صرف اتنا ہوا کہ ہم نے خواجہ صاحب ایسے نیک انسان کو صرف خبردار کیا مگر ہم جانتے تھے کہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکے گا۔

Marfat.com

پھر ملاقات

حالات کی رفتار بدستوری جاری رہی۔ مرزائیوں نے اپنا کام جاری رکھا مگر مسلمانوں میں کافی بیداری پیدا ہوگئی تھی۔ مجلس عمل نے حکومت کے سربراہوں کو خبردار کیا کہ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھیوں پر ان مرزائیوں کا قبضہ کرادیا گیا ہے جو معمولی حیثیت کے لوگ تھے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کے اپنے مکان نہ تھے اگر تھے۔ تو وہ بالکل معمولی تھے۔ ان موزائیوں کو بحالیات کے مرزائی افسران اور ذمہ داروں نے کارخانوں میں حصے اور عمدہ دکانوں اور مکانوں پر قبضہ کرادیا ہے۔ ایک ہی شخص نے مختلف شہروں میں مختلف الاٹمنٹس کرارکھی ہیں۔ مسلمان مارے مارے پھر رہے ہیں اور یہ مرزائی جن کی پاکستان بننے سے پہلے معمولی حیثیت تھی، کاروں میں دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ انکوائری کی جائے مگر صاحب کون سنتا ہے۔ مجلس عمل کا ایک وفد خواجہ صاحب سے ملا۔ اس مرتبہ خواجہ صاحب نے متاثر ہوکر یہ مہربانی کی کہ اپنی کیبنٹ کے معزز اراکین کو بھی بُلا لیا۔ سر ظفر اللہ خاں کے علاوہ باقی سب حضرات تشریف لے آئے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی نے ایک اعتراض کیا اور کہا کہ سر ظفر اللہ خان اُن ہی لوگوں کو سفارتوں میں آگے لاتے ہیں جو مرزا محمود کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ دیکھیے مولانا وہ بات نہ کہیے کہ جو پایہ ثبوت کو نہ پہنچ سکے۔ ہم اپنے عقیدے پر پکے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہے۔ میرا اس پر ایمان ہے۔ میرے ایمان اور سر ظفر اللہ خان کے ایمان میں بیّن فرق ہے مگر میں ان کے خلاف غلط باتیں نہیں سُن سکتا۔ مولانا بدایونی صاحب نے فرمایا حضور والا اگر میں نام بتادوں تو؟ خواجہ صاحب نے فرمایا بتایئے، کوئی ایسا واقعہ، مولانا نے ایک سفارتخانے کے افسر کا نام لیا کیبنٹ کے ایک وزیر نے تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات ہم نے بھی سنی ہے اور درست معلوم ہوتی ہے تب خواجہ صاحب پر زیادہ اثر ہوا۔ وہ ہمیں زیادہ تسلی تو نہ دے سکے مگر انہیں یہ یقین ہوگیا کہ مسلمان شکایت کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اس ملاقات میں چونکہ سردار بہادر خان تشریف نہ لا سکے۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کے بنگلے پر بھی حاضری دیں، چنانچہ فون پر ان سے بات ہوئی اور ملاقات کا وقت مقرر کرکے ہم ان سے بھی جا ملے۔ وہ بڑے صاحب قسم کے پٹھان ہیں۔ فرمانے لگے، میری سر ظفر اللہ خان سے اچھی خاصی دوستی ہے مگر میں اپنے عقیدے کا پکا ہوں۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ آپ وزیر مواصلات ہیں۔ آپ

Marfat.com

کی موجودگی میں مرزائیوں کو ریلوے کے محکمے میں پھلنے پھولنے کا بہت موقع ملا ہے۔ سردار بہادر خان نے فرمایا کہ آج تک سر ظفر اللہ خان نے مجھے کسی مرزائی کی سفارش نہیں کی۔ پھر میں کیسے مان لوں کہ ان کے اثر ورسوخ سے ریلوے میں مرزائیوں کا تسلط ہو رہا ہے۔ ہم نے ان سے ایک واقعے کا تذکرہ کیا۔ واقعہ یہ تھا کہ ریلوے میں ٹی ٹی کی غالباً تیس آسامیاں خالی تھیں درخواستیں مانگی گئیں۔ جب ان آسامیوں کو پُر کیا جانے لگا تو تیس مرزائی لے لیے گئے اور صرف دو یا تین مسلمانوں کو لیا گیا۔ ان میں سے ایک ہوشیار نوجوان نے مرزائیوں کی سی اچکوسی داڑھی رکھ لی اور ملازم ہو کر حلیہ درست کر لیا۔ سردار بہادر نے تحقیقات کا وعدہ فرمایا۔ یہ ایسا واقعہ تھا جو کہ ''آزاد'' میں شائع ہو چکا تھا۔ اس ملاقات میں ہمیں معلوم ہوا کہ سر ظفر اللہ خان کتنے ہوشیار ہیں اور کس احتیاط سے کام کر رہے ہیں۔ سردار بہادر نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے یاد ہے کہ سر ظفر اللہ خان نے صرف ایک دفعہ مجھے ایک مرزائی افسر کے تبادلے کے بارے میں کہا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا مگر بعد میں مجھے وہ تبادلہ اس لیے منسوخ کرنا پڑا کہ خود مسلمانوں نے میری چوکھٹ گھسا ڈالی اور یکے بعد دیگرے میرے پاس آ کر اس تبادلے کی منسوخی کے لیے اس قدر تنگ کیا کہ میں نے تبادلہ منسوخ کر دیا۔ آپ کے مسلمان ہی مرزائی افسر کے لیے ہاتھ باندھ رہے تھے۔ فرمائیے میں کیا کرتا؟ ہم نے حالات کی نزاکت کو اچھی طرح بھانپ لیا کہ یہ مرزائی کس طرح مسلمان وزیروں کو ہموار کرتے ہیں اور کس طرح چیدہ مگر نامعقول قسم کے مسلمانوں کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ ریلوے میں بڑے بڑے افسر جنہیں مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ اچانک معلوم ہوا کہ انہیں ایک ایک کر کے کس طرح ربوہ کی سیر کرائی گئی اور پھر اندر ہی اندر انہیں کس ترکیب سے مرتد بنانے کی کوشش ہوئی۔ ان خطرناک صورت حال نے ہمیں اور چوکنا کر دیا۔ کوئی گوشہ نیک اور درد دل رکھنے والے مسلمانوں سے خالی نہیں چنانچہ ایک ذمہ دار مسلمان افسر نے ہمارے کیمپ میں اطلاع بھیجی کہ فلاں مسلمان افسر بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ اس کا ایمان ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔ کسی اچھے مبلغ کو بھیجیے، تاکہ ایک باحیثیت مسلمان افسر کے ایمان کو بچایا جا سکے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی صاحب اپنے بکس سمیت ان کے بنگلے پر تشریف لے گئے۔ ان کی واپسی پر معلوم ہوا کہ افسر مذکور کی باتوں سے ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مرزائیت کی روحانیت یا اصلیت کا زیادہ قائل نہیں، جتنا وہ موجودہ ماحول میں مرزائیت کے لیے فضا سازگار پا کر مرزائیت کی طرف مائل ہے مگر قاضی صاحب نے انہیں ایمان کی قدر و قیمت بتا دی۔ مبلغ کا کام تبلیغ کرنا ہے نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ واپسی پر قاضی صاحب

Marfat.com

سو فیصد مطمئن نہ تھے مگر اتنا تو ہوا کہ افسر مذکور نے بہکی بہکی باتیں کرنا ترک کر دیں۔ یہ واقعہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ قارئین کرام اندازہ لگا سکیں کہ ہم نے کن حالات میں اور کیسی دشواریوں میں ردِّ مرزائیت کا کام کیا۔ مجلسِ عمل مرزائیت کے پھیلائے ہوئے جال کو کاٹنے اور سمیٹنے کی فکر میں تھی۔ مرزا محمود کو معلوم ہوا تو متفکر ہوا اور سر ظفر اللہ خان کی معرفت انہوں نے اپنے مبلغوں کی ایک ٹولی جن میں اللہ دتہ جالندھری وغیرہ شامل تھے کراچی بھیج دی۔ ان مرزائیوں نے مسلمان وزراء پر ''تبلیغ'' کا ہلہ بول دیا۔ وہ ایک ایک وزیر کی کوٹھی پر جانے لگے۔ سردار عبدالرب نشتر نے تو ان سے باقاعدہ دو دو ہاتھ کیے، وہ اچھے خاصے مولوی ہیں اور ایسے ماں باپ کی آغوش میں پرورش پائی ہے، جہاں دین کا باقاعدہ چرچا ہوتا رہتا تھا۔ ان سے مرزائی گھبراتے تھے۔ اگر سردار عبدالرب نشتر نے اپنی گورنری کے زمانے میں ''الشہاب'' ضبط نہ کی ہوتی (الشہاب وہ کتاب تھی جو شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے قتل مرتد کے بارے میں لکھی تھی۔) تو ہم سردار صاحب کو اپنا سردار مان لیتے۔ الشہاب کی ضبطی کا داغ ان کی گورنری کے دامن پر لگ ہی گیا۔ بہرحال وہ مذہبی ذہن کے وزیر تھے۔ اس لیے کیبنٹ اور مرزائی کیمپ میں انہیں مولوی منسٹر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مرزائی مبلغوں نے غلام احمد کی کتابوں کا پلندہ بغل میں دبا کر ہر مسلمان منسٹر کا پیچھا کیا۔ سب سے پُر لطف اور مختصر مناظرہ فضل الرحمٰن صاحب وزیر تعلیم سے ہوا۔ مرزائیوں نے ''تبلیغ'' کے لیے ملاقات کی اجازت چاہی۔ سر ظفر اللہ خان کے ہوتے ہوئے کون کہتا کہ معاف کرو باوا، ہم تمہیں اور تمہارے پیغمبر کو جانتے ہیں، چاروناچار موقع دینا ہی پڑتا تھا۔ فضل الرحمٰن صاحب کے ہاں جب مرزائی مبلغ کتابوں کا پلندہ کھولنے لگے تو فضل الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ سُنیے مولوی صاحبان ہم زیادہ باتیں کرنا نہیں جانتے اور نہ زیادہ بحث میں پڑنا چاہتے ہیں۔ پہلے آپ میری ایک بات سن لیں اور وہ یہ ہے کہ اگر دنیا بھر کے مسلمان جو غلام احمد کو نبی نہیں مانتے کافر ہیں تو میں کافر ہوں، خدا کے لیے مجھے کافر ہی رہنے دو، میں مسلمانوں کے ساتھ کافر رہنا چاہتا ہوں، اب آپ فرمائیے آپ اور کیا کہتے ہیں؟ مرزائیوں نے بغلیں جھانکنا شروع کیں اور پلندے پھر سے باندھ کر رخصت چاہی۔ فضل الرحمٰن صاحب نے کہا کہ آپ شوق سے جا سکتے ہیں۔ مرزائی مبلغوں کے اس دورے میں یہ سب سے بڑھیا قسم کی ملاقات تھی۔ دراصل سر ظفر اللہ خان وزیروں کی نبض پر ہاتھ رکھ چکے تھے ہمیں کیبنٹ کے مسلمان وزراء میں سے صرف ایک وزیر کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ ربوہ تشریف لے گئے تھے یا کسی ترکیب سے وزیر صاحب کو ربوہ بھجوایا

Marfat.com

گیا تھا مگر ہر چند کوشش کے بعد یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ وزیر کون تھا؟ مجلسِ عمل کی جدوجہد کے بعد یہ سلسلہ رُک گیا کہ پھر مرزائی مبلغوں کو مسلمان وزراء کے بنگلوں پر جانے کی جرأت نہ ہوئی۔

انڈیا ہاؤس

ہندوستان تقسیم ہوا تو ہندوستان کی غیر منقولہ جائیداد جو بیرونی ممالک میں تھی وہ بھی تقسیم ہوئی۔ بغداد میں انڈیا ہاؤس کے نام کی شاندار عمارت پاکستان کے حصے میں آئی چونکہ وزارت خارجہ کا قلمدان سر ظفر اللہ خان کے پاس تھا اور بیرونی سفارتخانے انہی کے ماتحت تھے اس لیے بغداد کی اہمیت کے پیش نظر مرزائیوں نے بغداد کا رخ کیا اور مسلمانوں کو نکال کر مرزائیوں نے انڈیا ہاؤس پر قبضہ جما لیا اور اسے مرزائیت کا مستقل اڈہ بنا لیا۔ مسلمان بہت سیخ پا ہوئے وہ جب احتجاج کرنے پر اتر آئے اور بات مرکز تک پہنچی تو انڈیا ہاؤس پر مرزائیوں کے قبضہ کا چرچا ہوا۔ صورت ایسی ہوئی کہ یہ علاقہ مرزائیوں کی دستبرد سے باہر ہو گیا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کس مسلمان سفیر نے حوصلہ کیا اور مسلمانوں کی دادرسی کی کہ انڈیا ہاؤس پر مرزائیوں کا قبضہ نہ رہا۔ انہی دنوں مجلسِ عمل نے جس حد تک ہو سکا بیرونی سفارتخانوں پر دھیان دیا اور یہ جاننا چاہا کہ امتِ مرزائیہ جو اندرون ملک میں مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول ڈال کر جو کچھ نظر آتا ہے ہتھیا لیتی ہے۔ باہر جہاں وزارت خارجہ کی دیوار حائل ہے خدا جانے کیسا اندھیر ہوگا؟ معلوم ہوا کہ مرزائی لٹریچر سرکاری ذرائع سے بیرونی ممالک میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس صورت حال نے مسلمانانِ پاکستان کو مجبور کر دیا کہ وہ سر ظفر اللہ خان کی علیحدگی کا مطالبہ سختی سے کریں اور سارا زور اس پر لگا دیں کہ کسی صورت سر ظفر اللہ خان سے وزارت خارجہ کا قلمدان چھین لیا جائے۔ ردِّ مرزائیت کے سلسلے میں مجلسِ عمل کے رہنما حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر سر ظفر اللہ خان آج وزارت خارجہ سے علیحدہ ہو جاتے ہیں تو مرزائیت کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ آدھی فتح صرف اس مطالبے کے تسلیم کر لیے جانے میں مضمر ہے۔ عام اندازہ یہی تھا کہ سر ظفر اللہ خان کی علیحدگی سے مرزائیت کا پچاس فیصد زور ختم ہو جائے گا اور اقلیت قرار دیئے جانے پر بقایا کا بھی صفایا ہو جائے گا۔

قابلیت کا پراپیگنڈہ

سرکاری کیمپ اور ولایتی قسم کے مسلمانوں نے پراپیگنڈہ کیا کہ کشمیر کا کیس جس خوبصورتی اور تندہی سے سر ظفر اللہ خان لڑ رہے ہیں، یہ انہی کا حق ہے۔ اس پایہ کا دوسرا آدمی پاکستان میں موجود نہیں

Marfat.com

ہے، کشمیر چاہتے ہو تو سر ظفر اللہ خان کی مخالفت کا نام نہ لو، سر موصوف بڑے نامور وکیل اور بہت بڑے اثر ورسوخ کے مالک ہیں۔ یہ پراپیگنڈہ بظاہر سرکاری کیمپ اور پڑھے لکھے مسلمانوں کی طرف سے ہو رہا تھا مگر اس پراپیگنڈہ کی تہہ میں مرزائیت کارفرما تھی اور مرزائیوں کی پراپیگنڈہ مشین سر ظفر اللہ خان کی شہرت کو ہوا دے کر چار چاند لگانے میں مصروف تھی۔ مجلس عمل نے حقیقت کو بے نقاب کرنا شروع کیا اور مسلمانوں کو اس بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کی اپیل کی، انہیں جب یہ سمجھایا گیا کہ ابتداء میں میدان کھلا تھا، مقبوضہ کشمیر میں بھارت کا کوئی مضبوط مورچہ نہ تھا، ایک ہی ہلے میں مظلوم کشمیریوں کی جان چھڑائی جا سکتی تھی مگر یہ قیمتی وقت باتوں میں ضائع کر کے بھارت کو موقع دیا گیا کہ وہ اپنے غاصبانہ قبضے کو مضبوط بنا لے، چنانچہ اِدھر باتیں اور صرف باتیں ہوتی رہیں۔ قانونی موشگافیوں میں وقت ضائع کیا گیا۔ اُدھر بھارت بے کھٹک مورچے بناتا گیا۔ کُھلے میدان میں دو دو ہاتھ ہو جاتے تو بھارت کے سورما دہلی کی راہ لیتے۔ اب سیمنٹ کے مورچوں سے ٹکر مارنا ہو گی۔

سر ظفر اللہ خاں کی لمبی تقریر

حفاظتی کونسل کا اجلاس ہوا تو پاکستان کی نگاہیں کونسل کے اجلاس پر مرکوز ہو گئیں کہ دیکھیں اب ہمارے وزیر خارجہ کس طرح موتی بکھیر کر حفاظتی کونسل کو مسحو رکرتے ہیں اور کس ترکیب سے کشمیر کو اپنی جھولی میں ڈال کر آتے ہیں اور پاکستانیوں کو فخریہ انداز میں کہتے ہیں کہ لو ناقدر شناسو تم میرے خلاف شور مچاتے رہتے ہو، یہ لو کشمیر لے آیا ہوں۔ سر ظفر اللہ خان نے حفاظتی کونسل میں بہت لمبی تقریر کی، اس قدر لمبی تقریر کی کہ اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا۔ حفاظتی کونسل کے بعض ارکان اپنی نشستوں پر سو گئے اور بعض اخبارات کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہو گئے، اس ''تاریخی تقریر'' کے بعد پراپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھا۔ سر ظفر اللہ خان کے حمایتوں نے فخریہ انداز میں کہا کہ دیکھا ہمارے شیر کی گرج، جس محفل میں دم مارنے کی جرأت نہ تھی وہاں ہمارا نمائندہ آٹھ گھنٹے گرجتا رہا اور مخالف کے دانت کھٹے کر دیئے۔ جن کے دانت کھٹے ہو گئے تھے۔ اس کے فریق مخالف کا وہ نمائندہ یعنی مسٹر مینن اٹھے اور آدھ گھنٹے میں اس ''شیر'' کی گرج کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا۔ بیرونی ممالک میں چونکہ پاکستان کا کوئی پراپیگنڈہ نہ تھا اور ہم دنیا کو اپنی مظلومیت سمجھا نہ سکے تھے اور نہ یہ وضاحت کر سکے تھے کہ کشمیر پر بھارت نے خلافِ انصاف دھاندلی مچا کر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس لیے بیرونی ممالک کے نمائندوں نے

Marfat.com

ہمارے ''قابل وکیل'' کی لمبی تقریر کا کوئی اثر نہ لیا اور ہم جیسے گئے تھے، ویسے ہی گھر کو واپس آ گئے۔ ولایت کے اخباروں نے سر ظفر اللہ خان کا قصیدہ لکھا۔ ان کی تصویریں چھپیں اور مرزائی ان تصویروں کو لیے لیے پھرے اور سر ظفر اللہ خان کی قابلیت کے ڈھنڈورے پیٹتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سر ظفر اللہ خان کی لمبی تقریر نے ہمیں لمبے راستے پر ڈال دیا اور ہمارا نہایت ہی قیمتی وقت برباد ہوا۔ ہمیں نقصان اور بھارت کو فائدہ پہنچا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ بیرونی ممالک میں پراپیگنڈہ کیا جاتا، ہمدردی حاصل کی جاتی، تعلقات بڑھائے جاتے۔ یہ کام وزارت خارجہ کا تھا مگر وزارت خارجہ جہاں بھی موقع میسر آتا تھا، مرزائیت کا وعظ کہتی۔ بیرونی ممالک میں مرزائیت کے اڈے مضبوط کیے گئے۔ سر ظفر اللہ خان کی اس روش کے خلاف اسلامی پریس نے بارہا احتجاج کیا۔ مختصر یہ کہ سر ظفر اللہ خان کی لمبی تقریر پاکستان کو کشمیر کے بارے میں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی بلکہ مضر اور سخت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ نتیجہ بھارت کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ اسے مورچے بنانے کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ سر ظفر اللہ خان نے اس ضرورت کو لمبی تقریر کر کے اور مقدمے کو طول دے کر پورا کر دیا۔

52ء گزر گیا

مرزا محمود نے خدا جانے کس کس سے مشورہ کیا اور کس بل بوتے پر یقین کے ساتھ اعلان کیا کہ اِسی سال مسلمانوں کو زِیر کر کے پاکستان پر مرزائیت کا جھنڈا گاڑ دینا ہے۔ اس اعلان نے خطرناک صورتِ حال اختیار کر لی۔ جہاں کہیں مسلمانوں نے سرکاری دفاتر میں مرزائی ملازموں کو دندناتے دیکھا، انہیں مرزا محمود کے اعلانات نے مرعوب کیا، ہم نے بعض کو یہ کہتے بھی سنا کہ اب کیا ہوگا؟ مجلسِ عمل کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ اس خطرناک پراپیگنڈے کا اثر زائل کرے۔ اس پراپیگنڈے کا اصل کھونٹا سر ظفر اللہ خان تھے۔ اس لیے تمام تر توجہ پراپیگنڈہ کی بنیاد پر مرکوز کر دی گئی اور خواجہ صاحب وزیر اعظم پاکستان سے مجلس عمل کے ایک وفد نے اسی بارہ میں ملاقات کی۔ خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ حضور ہم نے پہلی ملاقات میں آپ سے عرض کیا تھا کہ اُمتِ مرزائیہ کی وفاداریوں کی تار ربوہ میں بندھی ہے۔ اگر احکامات کا تصادم ہوا تو آپ کے قلم کو پسِ پشت ڈال کر ربوہ کا حکم مانا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا وقت بھی آ جائے کہ ملک نازک دور سے گزر رہا ہو اور ہر فرد کی وفاداری او رجاں نثاری ازبس ضروری ہو، جان کی بازی لگا دینے کا تقاضا ہو تو اُمتِ مرزائیہ اپنے خلیفہ سے دریافت کرے گی! اگر خدانخواستہ خلیفہ صاحب کا دماغ اندھا ہو گیا اور وہ اَڑ گئے اور فرما دیا کہ خاموش

Marfat.com

رہو یا دوسرا طریقہ اختیار کرو، تب کیا ہوگا؟ پاکستان کی کلیدی آسامیوں اور نازک ذمہ داری کے محکموں میں سے آپ نے مرزائیوں کو چودھری بنا کر بٹھا رکھا ہے۔ فرمائیے اس وقت کیا ہوگا؟ خواجہ صاحب موصوف نے فرمایا کہ ایسی بے بنیاد باتیں اور مفروضے پیش کر کے ابتری اور بددلی نہ پھیلاؤ۔ وفد نے واقعہ پیش کیا کہ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ چودھری سر ظفر اللہ خان صاحب وزیر خارجہ پاکستان نے مرزا محمود کے حکم اور پروگرام کے مطابق کراچی میں یعنی آپ کی راجدھانی میں تبلیغِ مرزائیت کے لیے جلسہ عام کیا اس میں پہلے روز گڑبڑ ہوئی دوسرے دن آپ سے معزز شہریوں کے وفود ملے۔ اخبارات نے احتجاج کیا، آپ نے مناسب سمجھا کہ سر ظفر اللہ خان اس جلسے میں نہ جائیں مگر کیا وہ مرزا محمود کے حکم کے مقابلے میں آپ کا حکم مان گئے تھے؟ پھر خواجہ صاحب کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹالنے لگے۔ وفد نے اس ملاقات میں ایک اور شکایت کی اور وہ یہ تھی کہ اس جلسے کے لیے جو قدِ آدم پوسٹر شائع ہوئے اور الفضل وغیرہ میں جو پراپیگنڈہ ہوتا ہے اس میں سر ظفر اللہ خان کے نام کے ساتھ ان کا عہدہ ضرور لکھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سر ظفر اللہ خان نہیں بلکہ وزیر خارجہ پاکستان، تبلیغِ مرزائیت کے ڈھنڈورچی ہیں۔ پاکستان اس لیے معرض وجود میں نہیں آیا کہ اس کا وزیر خارجہ اینٹی اسلام پراپیگنڈے کا علمبردار ہو اور مسلمان خاموشی سے مرزائیت کو پھیلنے کا موقع دیں۔ اس ملاقات کے نتیجے میں حکومت کی جانب سے اعلان ہوا کہ کوئی سرکاری افسر یا وزیر اس قسم کے جلسوں میں نہ جائے۔ یہ حکم بھی ہمارے مطالبے کے مطابق نہ تھا۔ انصاف کا تقاضا اس سے بہت زیادہ تھا۔ قراردادِ مقاصد کے ملک میں اسلام کے خلاف ہر قسم کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ ہونا چاہیے تھا مگر ہم نے یہی غنیمت سمجھا کہ وزیر اعظم پاکستان نے اتنا محسوس کر ہی لیا کہ سر ظفر اللہ خان حدود سے آگے بڑھ کر مرزائیت کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

نازک مسئلہ

ہمیں مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں میں سب سے زیادہ تشویش اور پریشانی اس بارے میں تھی کہ یہ قادیانیت کی بیماری فوجیوں میں نہ پھیل جائے مگر یہ ایسا نازک مسئلہ تھا جسے چھیڑنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ قارئین کرام کو معلوم ہے کہ جب ہم نے مرزائی فوجی افسروں کی وہ فہرست جسے خود مرزائیوں نے ایک خوبصورت ٹریکٹ کی صورت میں شائع کر کے حکومت کو مرعوب کرنا چاہا تھا۔ روزنامہ آزاد میں شائع کی تو گورنر پنجاب کو مرکزی حکومت نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ آزاد اخبار کے ایڈیٹر کو بلا کر متنبہ کریں۔ مجلسِ عمل اس بارے میں احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ تاہم اس طرف سے آنکھیں موند لینا

Marfat.com

کسی صورت مناسب نہ تھا۔ سر ظفر اللہ خان کے ہم زلف میجر جنرل نذیر احمد پاکستانی فوج میں چوتھے ستون کی حیثیت سے موجود تھے۔ مرزا محمود کو بہت ممکن ہے یہ وہم بھی ہو کہ موقع پا کر ایک روز میجر جنرل نذیر احمد پاکستان کے کمانڈر ان چیف ہی بن جائیں گے۔ خدانخواستہ ان کی یہ آرزو پوری ہو جاتی تو پاکستان کی قسمت پھوٹ جاتی مگر

تدبیر کند بندہ و تقدیر زند خندہ

اچانک ایک صبح معلوم ہوا کہ کچھ فوجی افسر خوفناک سازش میں ملوث ہو کر پکڑے گئے ہیں۔ یہ وحشت ناک خبر پاکستان کے کونے کونے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لاہور میں یہ کیفیت تھی کہ گلی کوچوں اور چوک چوک پر لوگوں کے جھمگٹے لگ گئے۔ واقعہ بہت اہم تھا دوسرے دن لوگوں نے معلوم کرنا چاہا کہ اس سازش میں کون کون پکڑا گیا؟ جب یہ معلوم ہوا کہ میجر جنرل نذیر اس سازش میں شامل ہیں تو ہمارے حواس پراں ہو گئے اور ہر پاکستانی نے محسوس کیا کہ اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو کیا ہوتا؟ ''آزاد'' میں اس سازش کے بارے میں مسلسل آرٹیکل لکھے گئے۔ ہم نے میجر جنرل نذیر کی اس سازش میں شمولیت پر لکھا کہ مرزائیوں کی تنظیم کے ہم قائل ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ کوئی ذمہ دار مرزائی مرزا محمود سے مشورہ کیے بغیر، پوچھے بغیر شادی بھی نہیں کر سکتا۔ اس نیک کام کے لیے بھی اجازت لینی پڑتی ہے بھلا ملکی نظام کے خلاف خوفناک سازش میں میجر جنرل صاحب از خود چپکے سے کیسے شامل ہو گئے؟ یہ عجیب بات ہے کہ مرزا محمود کو معلوم نہ ظفر اللہ خان کو خبر اور سر موصوف کے ہم زلف پاکستان کا تختہ الٹنے میں شامل ہو گئے۔ بہر حال وہ پکڑے گئے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ واقعی سازش میں شریک تھے۔ عدالتی تحقیقات کے بعد انہیں تابر خاست عدالت بٹھا کر حکم ہوا کہ اب فوجی چھاؤنی کی بجائے ٹھنڈے ٹھنڈے گھر تشریف لے جایئے یعنی انہیں فوج سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ہمیں جو کھٹک تھی وہ درست ثابت ہوئی کہ ان مرزائیوں کو کلیدی آسامیوں پر بٹھانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ایک مرزائی فوجی کپتان کا قصہ آپ سُن چکے ہیں کہ وہ سرکاری اسلحہ چرا کر لیے جا رہا تھا کہ اٹک کے پُل پر پکڑا گیا اور سرحدی علاقے میں ایک فوجی کپتان کی خودکشی کا واقعہ جو ''الفلاح'' میں شائع ہوا۔ اس سے بھی آپ باخبر ہیں ان حالات میں مجلس عمل کس طرح مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی۔ مجلس عمل نے دن رات ایک کر کے پاکستانی عوام اور حکومت دونوں کو خبردار کیا اور اس حد تک مرزائیت کے خلاف صحیح پراپیگنڈہ کیا کہ مرزائیت کے ناسور پر جو خوبصورت پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے اتار ڈالیں۔ مسلمانوں نے مرزائیت کو جب اصل روپ میں دیکھا تو وہ چِلّا اٹھے۔ پہلا موقع تھا جب مسلمانوں کے ہر مکتب

Marfat.com

خیال کے لوگوں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اسلام کے بنیادی مسئلے کے لیے یک جہتی کا مکمل ثبوت دیا۔

مرزائیوں کا پراپیگنڈہ

راولپنڈی میں کسی جھگڑے کی بنا پر ایک مرزائی مارا گیا۔ ایک مسلمان پکڑا گیا۔ مرزائیوں کے ڈھنڈورچی ''الفضل'' نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ بے انتہا پراپیگنڈہ کیا کہ یہ مسلمان احراری ہے۔ احرار نے ہمارا آدمی مروا دیا۔ مرنے والا نہ کوئی مقرر تھا اور نہ مبلغ، بہت ہی بے ضرر سا آدمی تھا۔ مارنے والا یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ احرار کہاں بستے ہیں مگر مرزائیوں نے جھوٹا پراپیگنڈہ اس زور سے کیا کہ توبہ بھلی۔

دوسرا واقعہ

اوکاڑے کے قریب ایک گاؤں کے مرزائی سکول ماسٹر کو کسی نوجوان نے قتل کر ڈالا۔ روزانہ قتل کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ایک ایک دن میں کئی کئی قتل ہوتے ہیں۔ اسی دنیا میں مرزائی بھی رہتا ہے مگر کسی مرزائی کو کوئی مار دے یا مرزائی کو مرزائی ہی مار ڈالے۔ مرزا محمود کا ڈھنڈورچی ''الفضل'' احرار کے خلاف پراپیگنڈے کا تہیہ کر کے بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی مرزائی خربوزے کے چھلکے پر سے پھسل جائے۔ الفضل کو شور مچانا ہے کہ احراریوں نے دھکا دے کر ٹانگ توڑ دی چونکہ اس پراپیگنڈے کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کا کوئی خاص اثر بھی نہیں ہوتا چنانچہ تفتیش اور تحقیق کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جو مرزائی بھی قتل ہوا۔ اسے مارنے والا کوئی احراری نہ تھا جب مجلسِ عمل میدان میں آ گئی تو احرار کا سوال جاتا رہا۔ احرار پر مرزائیوں کو براہ راست حملہ کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ ردِ مرزائیت کے بارے میں جو بھی قدم اٹھایا جاتا۔ اسے مجلس عمل ذمہ دارانہ حیثیت میں خود اٹھاتی تھی۔

وزیر اعلیٰ سے پہلی ملاقات

مجلس عمل نے مناسب سمجھا کہ صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ سے ملاقات کر کے انہیں بتائے کہ مطالبات کیا ہیں اور مطالبات کی اہمیت کیا ہے اور مجلس عمل کا طریق کار کیا ہو گا؟ چنانچہ میاں صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر ہوا اور ان کی کوٹھی پر مجلس عمل کے وفد نے مولانا ابوالحسنات کی قیادت میں ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مطالبات کی شائع شدہ فہرست پیش کرتے ہوئے مطالبات کی اہمیت پر روشنی ڈال دی گئی۔ میاں صاحب منجھے ہوئے سیاستدان اور بڑے ہی ذہین انسان ہیں۔ پنجاب کی دو شخصیتوں کے بارے میں یہ اندازہ کرنا کہ کون ایک دوسرے سے اعلیٰ

Marfat.com

اورافضل ہے بڑا ہی مشکل کام ہے۔مخالف اور موافق مانتے ہیں کہ پنجاب کی یہ دو برگزیدہ شخصیتیں یعنی میاں مشتاق احمد صاحب گورمانی اور میاں ممتاز احمد خان دولتانہ خداداد قابلیت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ شخصیتیں ہیں۔میاں مشتاق احمد گورمانی کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ ان کا بدترین مخالف بھی اگر ایک بار تبادلہ خیال کرنے، ان کے پاس چلا جائے تو اُسے واپسی پر اپنی سابقہ رائے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔یہی حال میاں دولتانہ صاحب کا ہے۔دونوں حضرات کو خدا نے یہ صلاحیت عطا کی ہے وہ اپنے مخالف کے دل سے مخالفت کے جراثیم کو کرید کرید کر اس خوبصورتی سے نکال دیتے ہیں کہ ملاقاتی اگر رائے بدلنے پر مجبور نہیں ہو جاتا تو کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ مخالفت کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے اور طبیعت غیر جانبدارانہ انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔دونوں حضرات کا مطالعہ بڑا وسیع ہے، بہترین مقرر ہونے کے علاوہ بہت شیریں بیاں ہیں۔مجھے پہلی بار مجلس عمل کی وساطت سے میاں دولتانہ کی گفتگو سننے کا موقع ملا۔اس لیے کہ میں مجلس عمل کے اس وفد میں شامل تھا جو میاں ممتاز دولتانہ سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی المتاز میں حاضر ہوا۔المتاز کیا ہے؟ ایک صاف ستھرا خوبصورت محل۔ہر شے قرینے اور سلیقے سے سجی ہوئی۔میاں صاحب نے چونکہ دروازے ہی پر وفد کا استقبال کیا اور خوش خلقی سے ہمیں اپنی شیریں بیانی میں اُلجھالیا۔اس لیے ہم المتاز کی بجائے میاں ممتاز ہی کو دیکھتے اور سنتے رہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم میاں صاحب کی کوٹھی اور شان وشوکت سے مرعوب ہو گئے تھے مگر یہ تو ہے کہ ہر خوبصورت شے دل پر کمندیں ڈالتی ہے کمزور گرفتار ہو جاتے ہیں اور جنہیں خدا نے حوصلہ اور طاقت دی ہے۔وہ خوبصورت کمندوں کی گرفت سے محفوظ رہتے ہیں مگر صاحبِ المتاز کی تعریف نہ کرنا قدر ناشناسی کے مترادف ہے، یہ کوٹھی سکھوں کے دورِ حکومت میں بنتی اور کوئی سکھ حاکم اسے دیکھ پاتا تو میاں صاحب بندی خانے میں ہوتے اور سکھ حاکم کچہرے میں مست خوبصورت کیاریوں کو روندتا پھرتا۔بہر حال مکین اور مکان جاذب نگاہ اور دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔دونوں میں مقناطیسی کشش موجود ہے مگر ہم خدا جانے کس مٹی سے بنے تھے کہ ایک جھلک کے بعد طبیعت ٹھکانے آ گئی اور اصل موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔اس گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ ہمارے مطالبات اسلام کے بنیادی مسئلے سے متفق ہیں ان کا موجودہ سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں۔ان مطالبات میں تنسیخ وترمیم کی گنجائش بھی نہیں، قرارداد مقاصد کی موجودگی میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کر لے۔ہماری تحریک نہایت پرامن ہے، ہمارا مقصد امن عامہ میں دخل اندازی ہرگز نہیں ہے۔میاں صاحب نے وفد کی باتیں بہت غور سے سنیں اور آخر میں یہ فرمایا کہ میری ذمہ داری

Marfat.com

یہ ہے کہ امن کو بحال رکھوں۔ اس فرض کی ادائیگی مجھ پر لازم ہے کہ کسی صورت بدامنی نہ ہونے دوں گا۔ بحیثیت مسلمان اِن مطالبات سے مجھے ہمدردی ہے۔

میرا وعدہ

جونہی میاں صاحب نے مجھے وفد کے ہمراہ جیل سے باہر آنے کے بعد پہلی مرتبہ دیکھا۔ وہ میری طرف بڑھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس سلوک سے جو میرے ساتھ جیل میں روا رکھا گیا تھا ندامت محسوس کر رہے ہیں۔ چنانچہ مجھ سے مصافحہ کرتے ہی فرمانے لگے، میں مجبور تھا۔ آپ کو بہت زحمت اٹھانا پڑی میں نے گزرے واقعات کا تذکرہ ختم کرنے کے لیے ان سے کہا کہ میاں صاحب چھوڑیئے اِس قصے کو، وقت گزر گیا۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں میری گزارش سنیے جو ہو چکا، اسے دہرانے کی فرصت نہیں اور جو ہونا ہے، وہ ہوتا رہے گا۔ ایک نیک کام تو کیجیے؟ میاں صاحب نے فرمایا کہیے کیا بات ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ جیل سے رہائی کے وقت میں نے ایک بوڑھے عمر قیدی سے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی میری میاں صاحب سے ملاقات ہوئی، میں تمہاری سفارش ضرور کروں گا۔ پہلے تمہاری رہائی کا مطالبہ کروں گا پھر اور بات ہوگی۔ میں وعدہ کا پکا ہوں۔ اس لیے آپ سے استدعا ہے کہ محمد رمضان نامی ایک مظلوم بوڑھا عمر قید کی چودہ سالہ معیاد کبھی کی پوری کر چکا ہے۔ اس کا کوئی سفارشی نہیں جو اسے رہا کراتا۔ جیل والوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ایک بے ضرر قیدی کو رہا کریں۔ میاں صاحب میں کچھ خرابیاں بھی ہوں گی مگر بعض اوصاف ایسے ہیں جنہیں سراہنا لازم ہے۔ اسی وقت میاں صاحب نے سیکرٹری کو بلایا اور رہائی کا حکم لکھوایا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے محمد رمضان کی رہائی کے حکم سے بے حد مسرت ہوئی۔ وفد کے ارکان میں سے حضرت مولانا ابوالحسنات، مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی اور مولانا میکش نے گفتگو اور تبادلہ خیال میں نمایاں حصہ لیا۔ مجلسِ عمل کے مطالبات وزیر اعلیٰ کے پاس پہنچ گئے تاکہ وہ مرکز کو ان مطالبات سے مطلع کر سکیں اور ہم سب میاں دولتانہ کے ہاں سے رخصت ہو کر واپس آ گئے۔

حکومت کی جانبدارانہ سخت گیری

51ء کے وسط میں حکومت پنجاب نے جانبداری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو دبانا اور مرزائیوں کی حرکات کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ حکومت کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ ہمیں امید نہ تھی کہ میاں دولتانہ کی حکومت مغلوب القلب ہو کر ہمارا پیچھا مساجد کے اندر تک کرے گی مگر

Marfat.com

انتظامیہ کی مشین تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے خلاف بہت تیزی سے گھومنے لگی۔ جہاں کہیں بھی مرزائی افسروں کا بس چلا۔ وہ وابستگانِ تحریک کو کچل دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ بالآخر جب پکڑ دھکڑ کی سختی سے اُلٹا اثر ہوا اور تحریک زیادہ تیز ہوگئی تو حکومت کو چاہیے تھا کہ رویہ بدلتی۔ مسلمانون کے خلاف یکطرفہ کارروائی جاری رکھنے کے بجائے اسے مرزائیوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہیے تھی۔ انہی دنوں جب حکومت نے مسلمانوں پر سختی شروع کی۔ مرزائیوں نے مسلمانوں کی دل آزاری میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ الفضل نے ان دنوں سخت نیش زنی سے کام لینا شروع کیا۔ مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے مشتعل کرنے کا سامان پیدا کیا مگر حکومت نے مرزائیوں کی جانب سے آنکھیں موند لیں۔ تا آنکہ ملتان کا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ ہم ابھی سرگودھا جیل میں تھے کہ ایک روز آنے جانے والے قیدیوں نے یہ وحشت اثر خبر سنائی کہ ملتان میں گولی چل گئی اور بیشمار آدمی شہید ہو گئے ہیں۔ ہنگاموں، جلسوں، جلوسوں اور گولی چلنے کی خبروں میں غلط فہمی اور پراپیگنڈہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جس شہر میں واقعہ گزرا ہو، اُس شہر والے حقیقت حال سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔ افواہیں پھیلتی ہیں اور ان افواہوں کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔ افواہ پھیلانے والے سے کوئی نہیں پوچھتا کہ میاں تم کو کیسے معلوم ہوا کہ پچاسوں آدمی مارے گئے؟ جس کسی نے جو کہا اُسی پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ راوی کا معتبر ہونا ضروری نہیں خیال کیا جاتا چنانچہ ملتان کے بارے میں بھی کہا گیا کہ پچاسوں مسلمان شہید ہو گئے۔ اوّل تو یہ خبریں ہم تک باہر سے آنے والے قیدیوں کی معرفت موصول ہوئیں۔ ہم ان خبروں پر نہ تو زیادہ اعتبار کر سکتے تھے اور نہ ان خبروں کو جھٹلا سکتے تھے۔ بہرحال اس اندوہناک حادثے کی اطلاع سے ہمیں بڑا دکھ ہوا جیل میں بند تھے۔ ملتان کیسے پہنچتے، کیا کرتے اور کیا نہ کرتے؟ بل کھا کر رہ گئے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ مسلمانوں کا برسر اقتدار طبقہ یا تو حکومت کی مشینری پر قابض نہیں، وہاں مرزائیوں کا قبضہ ہے یا یہ کہ وہ خود بھی مرزائیوں سے مرعوب ہو کر سر ظفر اللہ خان کی خوشنودی حاصل کر رہا ہے۔ بہرحال ہمیں اندر بیٹھے کیا معلوم کہ باہر ہمارے عزیز بھائیوں پر ملتان میں کیا گزری؟ باہر آئے تو معلوم ہوا کہ چھ مسلمان شہید ہوئے اور اس خونی حادثے پر مسلمانانِ پاکستان نے خون کے آنسو بہائے۔

ملتان کا فائرنگ کیس

غالباً 9 جولائی 51ء کو پاکستان میں یوم انتباہ منایا گیا۔ لاہور کے بعد ملتان کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ملتان میں بھی تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی جانب سے جامع مسجد جنازگاہ میں زیر صدارت جناب شوکت حسین سجادہ نشین دربار پیر صاحب جلسہ عام منعقد ہوا۔ حاضری بہت زیادہ

Marfat.com

تھی۔ مسجد کے وسیع میدان میں جب لوگ سما نہ سکے تو مسجد سے باہر دور تک پھیل گئے۔ اس عظیم الشان تاریخی جلسے میں مولانا ہدایت اللہ صاحب (خیر المدارس) اور مولانا عبدالقادر کے علاوہ تمام ذمہ دار حضرات نے مطالبات کو دہرایا اور حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ ان بنیادی اور جائز مطالبات کو فوراً تسلیم کرے۔ ورنہ نتائج کی ذمہ داری اس پر ہوگی وغیرہ۔ جلسے کے بعد یہ عظیم الشان اجتماع جلوس کی شکل میں چل پڑا۔

جلوس اور گڑبڑ

میری رائے ہے کہ مذہب ہو یا سیاست، عوامی اجتماعات کو صرف جلسوں تک محدود رکھنا چاہیے۔ جلسے بھی بسا اوقات سر پھٹول اور دھینگا مشتی کا اکھاڑہ بن جاتے ہیں مگر جلسوں کو اس لیے قابو میں رکھا جا سکتا ہے کہ شرارتی عناصر عوام کے سامنے ہوتا ہے اور شرارت اس طرح منظر عام پر آتی ہے کہ حاضرین اسے دیکھ لیتے ہیں اور جان جاتے ہیں کہ کون شرارت کر رہا ہے اور کیونکر شرارت کی جا رہی ہے۔ اس لیے ایسی شرارتوں پر قابو پا لیا جاتا ہے۔ بہر حال جلسے کبھی خطرناک صورت اختیار نہیں کرتے مگر جلوس..... اللہ محفوظ رکھے۔ جلوس کو قابو میں رکھنا نیک نیت اور ذمہ دار لوگوں کے اپنے بس کا روگ نہیں، شرارتی یا مخالف لوگ شرارت نہ کر سکیں تو اور بات ہے۔ ورنہ دو تین شیطان سارے جلوس کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تین آدمیوں میں سے دو آدمی اپنے تیسرے ساتھی کو مارنا شروع کر دیں تو یہ مار پیٹ ان تین تک محدود نہیں رہ سکتی۔ فوراً ہٹو بچو اور پکڑ لو، جانے نہ پائے، کا شور ہوتا ہے۔ اس دھینگا مشتی میں لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہیں اور گالی گلوچ سے معاملہ بڑھ کر دنگا اور فساد کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ تینوں شیطان یہ سب کچھ کرا کے پان سگریٹ فروش کی دوکان پر کیپٹن سگریٹ کا نرخ دریافت کرتے ہوئے نظر آئیں گے یا اگر خود پولیس نے انہیں اس ''کارِ خیر'' کے لیے متعین کیا ہے تو تھانے میں بیٹھ کر اس شاندار کارنامے کی ڈائری مرتب کرنے میں مصروف ہوں گے اور سنہری سرٹیفکیٹ کے خواب دیکھنے لگیں گے۔ انگریز بہادر کے دور میں یہی کچھ ہوتا تھا۔ تعزیہ کے جلوس پر پتھر پھنکوا دیا، اور شیعہ سنی فساد کا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ہولی کے دنوں میں سرِ بازار کسی تیز مزاج مسلمان پر رنگ پھنکوا دیا یا گلال ملایا اور ہندو مسلمانوں کا منہ کالا کرا دیا۔ برطانیہ کے دور اقتدار میں جلوسوں اور تہواروں پر یہ داؤ آسانی سے چل جایا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے میں ذاتی طور پر ہر قسم کے جلوسوں کے سخت خلاف ہوں جلوسوں کو قابو میں رکھنا بے انتہا مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ جلوس اسی وقت پر امن طریقہ پر نکل سکتا ہے۔ جب کسی کو امن شکنی اور شرارت کی ضرورت نہ ہو، یا رات نہ ہو، ورنہ گنجائش ہر

Marfat.com

وقت موجود ہے۔ جلوس نکالنے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ انتہائی ضرورت کے علاوہ کبھی جلوس نہ نکالنا چاہیے۔ جلسہ عام ختم ہوا تو لوگوں نے جلوس نکال لیا۔ یہ کام جلسہ عام کے سربراہوں کا تھا کہ وہ جلسے سے قبل فیصلہ کرتے کہ آیا انہیں جلوس نکالنا ہے یا نہیں، اگر نکالنا ہے تو وہ کونسی برگزیدہ اور با اثر شخصیت ہے جو جلوس کی رہنمائی کرے گی، ذمہ دار حضرات اس جلوس کو کس طرح کنٹرول کریں گے۔ کن کن راہوں سے جلوس گزرے گا؟ راستہ زیادہ لمبا تنگ اور خطرناک تو نہیں ہے؟ ان احتیاطی تدابیر کے بعد جلوس نہایت احتیاط سے کم از کم وقت اور زیادہ مختصر اور محفوظ راستے سے نکال کر بخیر وخوبی ختم کر دیا جائے۔ بہر حال جلوس نکلا اور بڑا ہی پُر امن جلوس تھا۔ عوام اور خواص سوائے مرزائیوں اور مرزائیوں کے پٹھوؤں کے، اس جلوس کے لیے چشم براہ تھے حتیٰ کہ جلوس حرم دروازے پہنچا تو وہاں شہرِ کوتوال موجود تھے۔ وہ آگے آئے۔ جلوس سے خطاب کیا اور فرمایا کہ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں، میں بھی مسلمان ہوں اور مسلمانوں کے جائز مطالبات کا معتقد ہوں، کوتوال کی اس فراست نے فضا کو اور زیادہ سازگار اور پر امن بنا دیا۔ جلوس آگے چل پڑا۔ جب یہ جلوس تھانہ کپ کے قریب پہنچا تو اس تھانے کے عقلمند تھانیدار نے حفاظت کے لیے تھانے پر مسلح گارڈ متعین کر رکھی تھی۔ یہ ضابطے کی بات تھی مگر بندوقیں اور سنگینیں مست دیوانوں کو سرخ پھریرا دکھا کر خواہ مخواہ مشتعل کر دینے کی بات تھی۔ بہر حال یہاں تک غنیمت تھا۔ جلوس چلا، جب تھانہ کے دروازے پر آ گیا تو چند نوجوانوں اور تھانے والوں میں کچھ تیز کلامی ہوگئی۔ جب جلوس چلتا ہے تو اس کی رفتار یکساں نہیں رہتی۔ آگے چلنے والے ذرا رفتار سست کر دیں تو پیچھے سے دھکا آتا ہے جو آخری سرے تک پہنچتا ہے اور نادانستہ طور پر دھکم پیل میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جلوس میں بعض افراد کے پاؤں اُکھڑ جائیں، پاؤں اُکھڑتے ہی جسم کا توازن درست نہیں رہتا، سنبھل گئے تو سنبھل گئے۔ ورنہ گر پڑے۔ جلوس میں ایک آدمی کے گرنے سے درجنوں اوندھے منہ ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت تھانہ کپ کے سامنے ہوئی تھانہ کے باہر لکڑی کا پرانا بوسیدہ سا جنگلہ تھا۔ کچھ لوگ بے قابو ہو کر جنگلے پر گرے۔ جنگلہ کمزور تھا۔ جنگلہ ٹوٹنے سے جو تڑاخ کی آواز آئی۔ وہ بالآخر گولی کی آواز پر ختم ہوئی۔ چھ مسلمانوں کو تحفظ ختم نبوت کے جلوس کے موقعے پر خون میں نہا کر جنت الفردوس کو سدھارنا تھا۔ سو وہ خوش نصیب سدھار گئے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ چین نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے مگر اس واقعے نے نہ صرف ملتان بلکہ سارے پاکستان میں آگ لگا دی۔ ملتان شہر میں ہڑتال ہوگئی۔ تمام شہر بند ہو گیا۔ مخدوم صاحب اور دیگر زعماء نے اسی وقت ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اس حادثے کے وقت باہر دورے پر تھے مگر کچھ دیر

Marfat.com

بعد واپس تشریف لے آئے تھے۔ان سے مطالبہ کیا گیا کہ شہیدوں کی لاشیں ہمارے سپرد کیجیے۔لاشیں مل گئیں۔ہسپتال سے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کا جلوس شہیدوں کے جنازوں کو لے کر قبرستان پہنچا۔

مطالبات

ملتان کے چھ مسلمانوں کی شہادت نے ایک کہرام مچا دیا۔مسلمانوں نے پولیس کی فائرنگ پر شہر میں مکمل ہڑتال کر کے غم و غصے کا اظہار کیا۔ہڑتالیں عام طور پر بہت برے نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ہڑتال کے دن چونکہ کاروبار بند ہوتا ہے۔اس لیے عوام کو چلنے پھرنے یا بیٹھ کر ہڑتال کے موضوع پر گفتگو کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا۔اس لیے شرارتی عنصر کے لیے لوگوں کو بھکانا یا مشتعل کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ مجھے اس بارے میں ہمیشہ تامل ہوتا ہے، میں ہڑتال کے حق میں نہیں ہوں۔ البتہ جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہے تو ہڑتال کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، مثلاً ملتان کے خونی حادثے کے بعد ہڑتال ناگزیر تھی۔ چھ فدایانِ ختم نبوت کو سپردِ خاک کرنے کے بعد کس کا دل گردہ تھا کہ وہ کاروبار میں مشغول ہوتا۔زخمی اور مجروح دل مسلمان کیونکر دوکانیں کھولتے؟ صفِ ماتم بچھی ہو تو دنیاداری کسے سوجھتی ہے؟ چنانچہ مکمل ہڑتال ہو گئی ہڑتال کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہڑتال کیوں ہے اور اب ہم کیا چاہتے ہیں؟ پولیس کی فائرنگ کے بعد مسلمانانِ ملتان نے مطالبہ کیا کہ ہمارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کی تحقیقات ہونی چاہیے۔

مسلمانانِ ملتان کے تین مطالبات

1- عدالت عالیہ ہائیکورٹ کے معزز جج صاحبان کی معرفت تحقیقات کی جائیں اور حکومت تحقیقاتی کمیشن کا اعلان کرے۔

2- شہیدوں کے وارثوں کو خوں بہا دلوایا جائے۔

3- تھانہ کپ کے انچارج کو معطل کیا جائے۔

ان ہر سہ مطالبات کی پنجاب پریس نے پرزور تائید کی۔اس بارے میں سرحد، پنجاب، بہاولپور اور سندھ میں جلسے ہوئے اور مطالبات کی تائید کی گئی۔ملتان فائرنگ کے فوراً بعد مجلس عمل کی تشکیل ہو چکی تھی۔ظاہر ہے کہ مجلس عمل اس سلسلے میں خاموش نہ رہ سکتی تھی۔اس پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے چنانچہ جب ملتان کی عام ہڑتال نے طول کھینچا تو مجلسِ عمل نے فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا ابوالحسنات کی

Marfat.com

سرکردگی میں ذمہ دار حضرات کا ایک وفد ملتان جا کر حالات کا جائزہ لے اور مطالبات پر زور دے کر سردست ہڑتال کھلوا دے۔ تاکہ فضا سازگار ہو اور تحقیقات کرائی جائیں۔

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے شہدائے ختم نبوت ملتان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر کے اسلام کے بنیادی عقیدہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس کا ذب و مفتری سے کسی قسم کا مناظرہ کر کے دعویٔ نبوت کے جواز میں دلیل طلب نہیں کی۔ اگر کیا تو یہ کہ سات ہزار سے زائد حافظ قرآن صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین، ناموسِ رسالت اور تاجِ ختم نبوت پر قربان کر دیے اور اِس طرح مسلمانوں کی متاعِ دین و ایمان کو ایک عیار و مکار کی دست برد سے بچا لیا اور آئندہ کے لیے ملت اسلامیہ کو سبق دیا کہ جو شخص اِس قسم کی ناپاک کوشش کرے، اُس کے لیے اسلام اور ملت اسلامیہ کا فیصلہ کیا ہے؟

ملتان کے غیّور اور صاحبِ ایمان مسلمانوں نے بھی اِس پر آشوب دور میں جبکہ کفر و اِستبداد کی سیاہ گھٹاؤں نے ایمان و یقین کو پریشان کر رکھا ہے، اسلام کی لاج رکھ لی اور اپنے جگر گوشوں کو شمعِ رسالت پر پروانہ وار نثار کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان آج بھی فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی خاطر گولیوں کی بارش میں مسکرا سکتا ہے:

رتبہ شہیدِ ناز کا گر جان جایئے
قربان جانے والے کے قربان جایئے

خدا کی نعمتیں نچھاور ہوں تم پر شہیدانِ ناموسِ رسالت! سلام ہو تم پر اے ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس پر قربان ہونے والو۔ مبارک ہیں، اِن کے والدین کہ ان کے نذرانے سرکار رسالت مآب میں شرفِ قبولیت حاصل کر گئے۔

یوں تو اِس دنیا میں ہزاروں بچے جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور ہزاروں کلیاں کھلتی ہیں اور بادِ صموم کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر مرجھا جاتی ہیں، مگر وہ موت جو حق اور راستی کی راہ میں آئے، حیاتِ جاوداں بن کر آتی ہے:

جو موت آئے تو زندگی بن کے آئے
قضا کی نرالی ادا چاہتا ہوں

(روزنامہ "آزاد" لاہور ۲۸ر جنوری ۱۹۵۲ء)

Marfat.com

وفد کی روانگی

21 جولائی کو مجلس عمل کا وفد زیر سرکردگی حضرت مولانا ابوالحسنات ملتان کے لیے روانہ ہوا۔ اس وفد میں مولانا مرتضٰی احمد خان میکش، صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب اور مولانا محمد علی جالندھری شامل تھے۔ ریلوے اسٹیشن ملتان پر بہت بڑے ہجوم نے وفد کا استقبال کیا۔ اسٹیشن سے باہر آئے تو لوگوں نے نعرے لگائے۔ ان نعروں میں پولیس افسر کی معطلی کا نعرہ بھی لگ رہا تھا۔ یہ وفد جیپ کار میں بیٹھ کر سیدھا مخدوم شوکت حسین صاحب کے ہاں پہنچا۔ مخدوم صاحب سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ مخدوم صاحب بھی پولیس کے رویہ سے نالاں تھے۔ نماز ظہر کے بعد وفد مشورے میں مصروف تھا کہ ملتان کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا ہجوم نعرے لگاتا ہوا دربار حضرت پیر صاحب میں آ موجود ہوا۔ اس جلوس کو حضرت ابوالحسنات نے خطاب کیا اور مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔ شام تک دو اور جلوس آ گئے۔ شہر میں مکمل ہڑتال تھی، لوگ غم و غصہ کے اظہار کے لیے جلوس مرتب کر کے رہنماؤں کو اپنے جذبات سے خبردار کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے دن

دوسرے دن صبح کے وقت مخدوم صاحب کی معیت میں وفد کے ارکان نے ہسپتال میں زخمیوں سے ملاقات کی۔ ان زخمیوں میں ایک بچہ بھی تھا۔ جس کے سر میں چھروں کے زخم تھے۔ وہ زخموں کی ٹیس سے بیقرار ہو کر چلاتا اور اٹھ اٹھ کر دوڑتا تھا۔ یہ دلخراش منظر ناقابل برداشت تھا۔ غمگین جذبات لے کر وفد اپنی جائے رہائش یعنی دربار حضرت پیر صاحب میں واپس آ گیا اور باہم مشورے سے طے ہوا کہ سب سے پہلے ہڑتال کھلوانے کا بندوبست ہونا چاہیے، چنانچہ حضرت مولانا ابوالحسنات نے مشورہ دیا کہ بازاروں کے چودھریوں اور مکھیا لوگوں کو بلایا جائے اور ان سے بات کی جائے، جلسہ عام میں لوگوں کو سمجھانا خالی از خطر نہیں۔ اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے ہر بازار کے چودھری اور ذمہ دار حضرات کو دربار حضرت پیر صاحب میں بلایا گیا۔ چودھری صاحبان اپنے اپنے بازاروں اور منڈیوں کے ذمہ دار ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ حضرت مخدوم صاحب کا اندرونی صحن جو کافی وسیع ہے، بھر گیا۔ اس قسم کے حادثات کے بعد لوگ اپنے مخلص رہنماؤں کو غیر نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ سرگوشیوں میں باتیں ہونے لگیں۔ حاضرین کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب نے فیض الحسن صاحب سے کہا کہ آپ ان بپھرے ہوئے شیروں کو خطاب کریں۔ ان کے دل

Marfat.com

زخمی ہیں اور سب کی دلداری اور صحیح رہنمائی ہم پر فرض ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے نہایت ہی پیارے اور مؤثر انداز میں چودھری صاحبان اور نمائندگانِ شہر کو خطاب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ واقعہ تو ہو چکا ہے مرنے والوں کو واپس نہیں بلایا جا سکتا۔ اب سوچنا چاہیے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟

دو راستے

ہمارے سامنے دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم سب یہاں سے اٹھیں۔ ہم وفد کے ارکان آگے آگے چلیں اور آپ سب حضرات ہمارے پیچھے چلیں۔ اسلحہ تو ہمارے پاس نہیں۔ راستے سے اینٹیں پتھر جو کچھ بھی میسر آئے اٹھا لیں اور تھانہ کپ پر دھاوا بول دیں۔ ان کے پاس بندوقیں، رائفلیں اور پستول موجود ہیں۔ وہ ہم کو موقع پا کر ہلاک کر دیں۔ یہ منظور ہے تو چلیے، ہم آپ سے آگے ہوں گے۔ لوگوں کی سرگوشیاں ختم ہو گئیں، بدظنی کے خانے بند ہو گئے۔ اعتقاد، اعتماد اور صحبت کے خانے کھل گئے، تیور درست ہو گئے، گردنیں جھک گئیں۔ صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ ہائی کورٹ کے جج صاحبان واقعے کی تحقیقات کریں یہ مطالبہ حکومت نے تسلیم کر لیا۔ اب اگر آپ تحقیقات کے لیے تیاری نہیں کرتے تو حکومت اور پولیس دونوں مل کر پراپیگنڈہ کریں گے کہ یہ لوگ کوئی معقول بات ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اگر آپ تحقیقات کا بندوبست کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے قانونی سہولت اور امداد موجود ہے۔ ملتان بار ایسوسی ایشن نے طے کیا ہے کہ وہ آپ کی ہر ممکن مدد فرمائیں گے اور ان کا مشورہ ہے کہ ایک دفتر قائم کر لیا جائے۔ جہاں شہر کے عینی شاہد آئیں اور انہیں اپنے بیانات لکھائیں۔ جن بیانات کو بار ایسوسی ایشن کے اراکین رہنما مناسب سمجھیں گے، مسٹر کیانی جج ہائی کورٹ کی خدمت میں پیش کر دیں گے مگر تحقیقات میں حصہ لینے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ آپ حالات کو سازگار کرنے میں امداد فرمائیں۔ اس امداد کی صورت یہ ہے کہ آپ ہڑتال ختم کریں۔ آپ حضرات اب آپس میں فیصلہ کر لیں اور ہمیں بتا دیں کہ آپ کیا پسند کرتے ہیں۔ ہم سب جو مجلس عمل کی جانب سے آئے ہیں۔ بہر حال آپ کا ساتھ دیں گے فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ صاحبزادہ صاحب کی اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا اور چودھری صاحبان نے فیصلہ کیا کہ وہ کل صبح ہڑتال ختم کر دیں گے، چنانچہ دوسری صبح ملتان شہر نے ہڑتال ختم کر دی۔ مجلس عمل کا وفد تبادلۂ خیال اور ہڑتال کھلوا کر لاہور واپس آ گیا۔ ملتان میں مسلمانوں پر گولی چلنے کے واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پاکستان بھر میں تحفظ ختم نبوت کا جذبہ تیز تر ہو گیا۔ حضرت مولانا ابوالحسنات کی قیادت میں مجلس عمل کی عظیم الشان کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔ ان کانفرنسوں کی خصوصیت یہ تھی کہ پاکستان میں

Marfat.com

ہر مکتب خیال کے علماء اور رہنما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور مجلس عمل کانفرنسوں میں جہاں حضرت مولانا ابوالحسنات عوام کو خطاب کرتے تھے وہاں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری حضرت مولانا داؤد غزنوی صاحب (اہل حدیث)، علامہ حافظ کفایت حسین صاحب اور سید مظفر علی شاہ شمسی (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان)، حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری (دیوبندی)، حضرت صاحبزادہ پیر سید فیض الحسن شاہ صاحب، سجادہ نشین آلومہار شریف، حضرت مولانا نور الحسن شاہ صاحب بخاری (تنظیم اہل سنت)، مولانا نصر اللہ خان صاحب عزیز (جماعت اسلامی)، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری (جمعیت علماء اسلام)، مولانا غلام محمد ترنم (جمعیت العلماء پاکستان)، مولانا غلام دین صاحب، ضیغم احرار شیخ حسام الدین صاحب، حضرت مولانا اختر علی خان صاحب (روزنامہ زمیندار)، حضرت مولانا غلام غوث صاحب (سرحد) غرض یہ کہ ہر مکتب خیال کے جید علماء اور مسلمانوں کے مُسلّم رہنما اسلام کے بنیادی مسئلے پر عوام کو ایک ہی پلیٹ فارم سے خطاب کرنے لگے۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمانوں نے باہم اختلافات کی خلیج کو پاٹ دیا اور پیار و محبت سے آقائے نامدار احمد مختار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو پر کٹ مرنے کے لیے دیوانہ وار میدان میں نکل آئے۔ مجلسِ عمل کے رہنماؤں نے عوام کو پرامن رہنے اور تحریک کو صحیح لائن پر چلانے کی تاکید کی۔ یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کی اشتعال انگیزی اور حکومت کی مجرمانہ خاموشی کے باوجود مسلمان کسی ایک مقام پر بھی مشتعل نہ ہوئے، جوش پر قابو تھا۔ اس لیے کوئی ناخوشگوار واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا۔

مولانا اختر علی خان کی خواجہ ناظم الدین سے ملاقات

یکم اگست کو مولانا اختر علی خان ایڈیٹرز کانفرنس کے سلسلے میں کراچی تشریف لے گئے۔ خواجہ ناظم الدین سے ملاقات ہوئی تو مولانا اختر علی خان نے خواجہ صاحب سے تحریک کے بارے میں مفصل گفتگو کی اور خواجہ صاحب کو سمجھایا کہ یہ تحریک اسلام کے بنیادی مسئلے کی تحریک ہے۔ آپ اس کی اہمیت کو سمجھیں اور ایک مرزائی کی خاطر ساری مسلمان قوم کی خفگی مول نہ لیں۔ مولانا نے ایسے انداز میں گفتگو کی کہ خواجہ صاحب نے ان سے سب سے اہم مطالبے کے بارے میں فرمایا کہ میں مسلمانوں کا یہ مطالبہ تسلیم کرلوں گا یعنی سر ظفر اللہ خان کو الگ کر دیا جائے گا۔ اس بارے میں 14 اگست کی تقریر میں اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ مولانا اختر علی خان صاحب لاہور واپس تشریف لائے تو انہوں نے اپنا انٹرویو اور سر ظفر اللہ خان کی علیحدگی کے بارے میں اپنے اخبار روزنامہ زمیندار میں خبر شائع کر دی۔ یہ ایسی خبر تھی کہ مسلمانوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور وابستگانِ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت مارے خوشی

Marfat.com

کے اُچھل اُچھل گئے۔ مجلس عمل کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں مولانا نے کراچی کی ملاقات کی وضاحت کرتے ہوئے اس خبر کی تصدیق کر دی۔ اس اہم خبر پر ہمیں بار بار خیال آتا کہ خواجہ صاحب نے اس نیک اقدام کا کس طرح فیصلہ کر لیا۔ وہ تو اس مطالبے کو سُن کر بہت گھبرا دیا کرتے تھے۔ مولانا اختر علی خان نے کیا جادو کیا کہ خواجہ صاحب جنت خرید لینے پر آمادہ ہو گئے۔ بہر حال مولانا اختر علی خان نے لگی پٹی رکھے بغیر زمیندار میں ملاقات کا نتیجہ شائع کر ہی دیا تو شک کی گنجائش باقی نہ رہی۔ خواجہ صاحب نے اس خبر کی تردید نہیں کی۔ مرزائیوں پر اوس پڑ گئی اور مسلمانوں نے بغلیں بجانا شروع کر دیں۔ مسرت وشادمانی کی ایک لہر تھی جو پاکستان کے کونے کونے میں بجلی کی رفتار سے پھیل گئی۔

مجلسِ عمل کے وفد کی روانگی

11 اگست کو مجلسِ عمل کا وفد خواجہ صاحب سے ملاقات کے لیے کراچی پہنچا۔ اس وفد میں حضرت مولانا ابوالحسنات، ضیغم احرار شیخ حسام الدین، مولانا میکش، مولانا عبدالحامد بدایونی شامل تھے۔ مجھے ہر وفد میں شامل ہونے کا موقع ملا، میں اس وفد میں بھی شامل ہوا۔ خواجہ صاحب نے مصروفیت کی وجہ سے فرمایا کہ کل کی بجائے پرسوں ملاقات ہو سکے گی، چنانچہ 13 اگست کو خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو وفد نے انہیں مجلسِ عمل کی جانب سے میمورنڈم پیش کیا۔ حضرت مولانا ابوالحسنات نے میمورنڈم پڑھ کر سنایا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد خواجہ صاحب نے فرمایا کہ مفصل گفتگو تو میں آپ سے 14 اگست کو کر سکوں گا۔ آپ 14 اگست کو ضرور تشریف لے آئیں۔ انشاء اللہ دل کھول کر گفتگو ہو گی۔ ہم 14 اگست تک کے لیے ٹھہر گئے۔

14، اگست کا جلسہ

14 اگست کے جلسے کی اہمیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس دن پاکستان کے کونے کونے میں عظیم الشان جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ کراچی کے جلسۂ عام کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس دن حکومت کی جانب سے وزیراعظم بعض اہم ملکی مسائل پر حکومت کی پالیسی کا اعلان کرتے ہیں۔ ملک بھر میں اس مرتبہ سر ظفر اللہ خان کی علیحدگی کے بارے میں عام چرچا تھا۔ خواجہ صاحب نے چونکہ مولانا اختر علی خان سے وعدہ فرمایا تھا اس لیے مسلمانوں کی آنکھیں کراچی کے جلسے پر لگی ہوئی تھیں۔ عظیم الشان جلسہ ہوا مگر خواجہ صاحب خلافِ اُمید اِس مطالبے کو گول کر گئے اور تحفظِ ختم نبوت کے بارے میں ایک لفظ تک نہ فرمایا۔ حاضرین جلسہ سخت مایوس ہوئے۔ جلسے میں گڑبڑ ہوئی، لوگوں نے اُٹھ اُٹھ کر جانا شروع

Marfat.com

کر دیا۔ منتظمین یعنی سرکاری لوگوں نے عوام کو بٹھانا چاہا، لوگ مانتے نہ تھے۔ خواجہ صاحب گھبرا تو چکے تھے اس صورتحال نے جلسے کو اور بھی بدمزہ کر دیا۔ نہایت افسردگی کے عالم میں یہ جلسہ ختم ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑی ہوئی۔

ہمیں اس جلسہ میں جانے کی بجائے دوسرے پروگرام پر عمل کرنا تھا یعنی ہم باقی وزراء سے ملاقاتوں کا پروگرام بنا کر چل پڑے۔ ہم نے 14 اگست کو جناب مشتاق احمد گورمانی، سردار عبدالرب نشتر، فضل الرحمٰن صاحب کو خطوط لکھ کر ملاقات کا وقت مانگا۔ ان حضرات نے 14 اگست کی بجائے 15 اگست کو ملاقات کا وعدہ فرمایا چنانچہ سردار عبدالرب نشتر سے طویل ملاقات ہوئی خوب بحث ہوئی۔ سردار صاحب کو مسئلے سے ہمدردی تھی۔ وہ مرزائیوں کو کافر سمجھتے تھے مگر انہیں طریق کار سے کسی قدر اختلاف تھا۔ وہ یہ فرماتے تھے کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانا خسارے کی بات ہے۔ انہیں اقلیت تو قرار نہ دیجیے بلکہ اسی طرح رہنے دیجیے، مگر کوشش کیجیے کہ انہیں کسی سیٹ پر نہ آنے دیا جائے۔ احرار نے انہیں شکست دے کر حال ہی میں یوم تشکر منایا تھا۔ اسی طرح ان کو نمائندگی سے محروم کیجیے۔ اگر آپ نے انہیں اقلیت قرار دلوا دیا تو انہیں نمائندگی دینا پڑے گی خواہ ایک ہی سیٹ دیں مگر ان کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہم انہیں سمجھاتے تھے کہ یہ بے اصول پن کی بات ہے۔ مسلمانوں کے اندر بحیثیت مسلمان رہتے ہوئے ان مرزائیوں نے کلیدی آسامیوں پر بحیثیت مسلمان قبضہ کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ وزارت خارجہ پر مرزائی قابض ہے۔ علاوہ ازیں آپ ہمیں یہ سمجھائیے کہ جب مسلمان ووٹروں کی فہرست بنے گی تو ان مرزائیوں کو کس کھاتہ میں ڈالا جائے گا۔ اگر آپ انہیں مسلمانوں کی فہرست میں درج کرتے ہیں تو یہ فرما دیجیے کہ اسلام کے کس اصول اور ضابطے کے مطابق آپ ان کافروں کو مسلمانوں کی فہرست میں درج کرائیں گے۔ ہم یہ بھی کہتے تھے کہ بیرونی ممالک میں مرزائیوں نے مسلمانوں کو جو دھوکہ دے رکھا ہے۔ اقلیت قرار دیئے جانے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جب اسلامی دنیا کو معلوم ہو گا کہ مرزائی مسلمانوں سے علیحدہ ایک الگ قوم ہے تو مرزائیت کے اڈے ختم ہو جائیں گے۔ بحالات موجودہ مرزائی بہت مزے میں ہیں۔ وہ پاکستان اور اسلام کے نام پر بیرونی دنیا کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اسلام ہی کے نام پر کفر کا جال پھیلا رہے ہیں۔ یہ انتہائی نامناسب بات ہے۔ اس حقیقت سے اسی صورت چھٹکارا مل سکتا ہے کہ مرزائیوں کو مسلمانوں کی فہرست میں درج نہ ہونے دیا جائے۔ صبح نو بجے سے ایک بجے دوپہر تک نشتر صاحب سے مفصل گفتگو ہوتی رہی۔ گو مقصد میں ہم ایک تھے مگر اندازِ فکر بالکل جدا تھا ہم مرزائیوں کو علیحدہ کر کے مرزائیت کا گلا گھونٹ کر دبانا چاہتے تھے۔ سردار صاحب

Marfat.com

بیچ میں رکھ کر دم نکال دینے کے حق میں تھے۔

خواجہ ناظم الدین سے ملاقات

16 اگست کی صبح کو خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے ایک کمیونک شائع کیا جس میں وزراء اور حکام کو مذہبی اجتماعات اور جلسوں وغیرہ میں جانے سے روکا گیا اور سرکاری عہدوں اور وزارتوں کے نام سے ایسے اجتماعات میں شمولیت کو ممنوع قرار دے کر قابل مواخذہ گردانا گیا۔ یہ کمیونک دراصل خواجہ صاحب کے دلی جذبات کی کمزوری جھلک تھی، خواجہ صاحب مرزائیت کے خلاف تھے۔ خواجہ صاحب دل سے چاہتے تھے کہ سر ظفر اللہ خان کی بلائے ناگہانی از خود ٹل جائے۔ اسے یا تو دوسری دنیا سے بلاوا آ جائے یا وہ مغرور ہو کر خود ہی گھر چلا جائے مگر خواجہ صاحب میں یہ حوصلہ ہی نہ تھا کہ وہ آگے بڑھیں اور سر ظفر اللہ خان کو دھکا دے کر باہر نکال دیں۔ تھے ایک نیک نمازی، شریف انسان مگر بہت ہی کمزور۔ تبھی تو کہا ہے کہ بزدل کا ایمان ہی کیا؟ کسی نے ڈرایا تو ڈر گئے اور دھمکایا تو دبک گئے۔ بیچارے چاہتے تو تھے کہ علماء کرام کی بات مان لی جائے مگر دائیں بائیں دیکھ کر مکر جاتے تھے۔

اس کمیونک کے جواب میں سر ظفر اللہ خان نے سب سے پہلے بیان دیا اور بہت مزیدار بیان دیا۔ یعنی وہ یہ سمجھ کر کہ کمیونک صرف انہی کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسے ماننے پر مجبور تھے۔ اس لیے کہ عہدہ سے مستعفی ہونے پر آمادہ نہ تھے مگر جب یہ محسوس کرتے تھے کہ اس کمیونک سے وہ ریشہ دوانیاں اور پراپیگنڈہ جو وہ بحیثیت وزیر خارجہ کر لیتے تھے، ان پر قدغن لگ گئی ہے تو بل کھا کر کہتے تھے کہ مذہبی آزادی کا دور ہے۔ ہر شخص اپنی عقیدے پر قائم رہنے کا حق رکھتا ہے۔ غرض یہ کہ سر ظفر اللہ خان نے کمیونک پر بل کھاتے ہوئے تسلیم اور انکار کے ملے جلے جذبات کا مظاہرہ کیا۔ ہمیں چونکہ خواجہ صاحب نے 16 کی شام کو بلا بھیجا تھا۔ اس لیے ہمارا وفد شام کو خواجہ صاحب کی کوٹھی پر حاضر ہوا۔ جہاں سر ظفر اللہ خان اور سردار بہادر خان کے علاوہ باقی وزراء موجود تھے۔ ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ اس ملاقات میں سردار عبدالرب نشتر بڑی خوبصورتی سے ہماری تائید فرماتے تھے۔ ہمیں یہ خیال تھا کہ اس ملاقات میں مولانا اختر علی خان والی بات کی صفائی ہو جانا چاہیے چنانچہ ہم نے خواجہ صاحب پر اچانک سوال کر دیا کہ آپ نے مولانا اختر علی صاحب سے یہ فرمایا تھا کہ سر ظفر اللہ خان کو علیحدہ کر دینے کا مطالبہ مان لیا جائے گا۔ خواجہ صاحب نے کسی توقف کے بغیر جواب دیا کہ میں نے ان سے اخبار میں شائع کرنے کو کب کہا تھا؟ اس جملے سے ہم نے اندازہ لگا لیا کہ مولانا اختر علی خان کی بات بالکل درست تھی۔ خواجہ صاحب نے وعدہ ضرور فرمایا تھا مگر..... اخبار میں شائع کر دینے سے بات

Marfat.com

بگڑ گئی اور سر ظفر اللہ خان نے اودھم مچا دیا اور خواجہ صاحب کو اس قدر ڈرایا اور معلوم ہوتا ہے کہ اوپر سے ایسا دباؤ ڈلوایا کہ خواجہ صاحب فیصلے پر قائم نہ رہ سکے۔ قبل از وقت اگر خوشی سے بے قابو ہو کر بات منہ سے نکل جائے یا راز افشا ہو جائے تو بنا بنایا کام بگڑ جایا کرتا ہے۔ ہمیں اس صورت پر ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا۔

بھگت سنگھ کی پھانسی

بھگت سنگھ کو کون نہیں جانتا کہ یہ نوجوان سردار کشن سنگھ کا لخت جگر اور نوجوان بھارت سبھا کا سب سے بڑا ہیرو تھا۔ جس نے اسمبلی ہال کے بھرے اجلاس میں بم پھینک کر انگلستان کے وقار کی چولیں ڈھیلی کر دی تھیں۔ بھگت سنگھ پکڑا گیا۔ اسے جب پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا تو ہندوستان میں کہرام مچ گئی۔ کانگریس کیمپ میں آگ لگ گئی اور کانگریس کے رہنماؤں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوا، ہندو ہوں یا مسلمان سب کے دلوں میں عام طور پر بھگت سنگھ ایسے بہادر نوجوان سے ہمدردی تھی۔ ہندوستان میں جگہ جگہ احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کی بھرمار ہوئی۔ انگریز بہادر بھی گھبرایا مگر وہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا دہلی میں اجلاس ہوا۔ ان دنوں جوش کا یہ عالم تھا کہ لوگ اجلاس کے باہر دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ اس اجلاس میں سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ مہاتما گاندھی جو عدم تشدد کے دیوتا مانے جاتے تھے۔ اس بات پر مُصر تھے کہ میں تو کسی قسم کے تشدد کی تائید میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا مگر جب قوم کسی مطالبے پر اُتر آئے تو نیتا جھک جایا کرتے ہیں۔ بہت لمبی چوڑی بحث کے بعد گاندھی جی کو آمادہ کیا گیا کہ وہ وائسرائے سے مل کر پھانسی کی سزا کو عمر قید کی سزا میں تبدیل کرائیں۔ چنانچہ گاندھی جی وائسرائے سے ملے۔ اندر جو بات ہوتی ہے۔ وہ مشکل سے اندر رہ سکتی ہے۔ بات کے پر ہوتے ہیں۔ بات اندر سے باہر آ ہی جایا کرتی ہے۔ برطانیہ نے اپنے جاسوس قدم قدم پر بٹھا رکھے تھے، چنانچہ وائسرائے نے گاندھی جی سے چھوٹتے ہی یہ فرمایا کہ آپ تو عدم تشدد کے پرچارک ہیں۔ آپ تشدد کرنے والوں کی حمایت میں کیسے تشریف لے آئے، گاندھی جی کو سیاسی زبان کے استعمال کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں ورکنگ کمیٹی کی آرزو لے کر آیا ہوں اور اس سے میرے مشن کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ میں خون خرابے کے دروازے کو بند کرنے کے لیے اس تجویز کے حق میں ہوں کہ بھگت سنگھ کی پھانسی کی سزا بدل دی جائے۔ وائسرائے مان گیا۔ گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی کو مطلع کر دیا، خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی مگر اسی میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ باہر بات نہ جانے پائے۔ تا آنکہ حکومت سزا کی تبدیلی کا خود اعلان نہ کر دے۔ ڈاکٹر ستیہ پال ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔ بھگت سنگھ کی پھانسی کا چرچا پنجاب میں بہت زیادہ تھا۔ بھگت سنگھ بھی پنجابی تھے۔ ڈاکٹر ستیہ پال راتوں

Marfat.com

رات لاہور پہنچے اور یہ مژدۂ جانفزا کہہ سنایا۔ گھر میں نہیں، کسی خاص دوست سے نہیں بلکہ جلسۂ عام میں اعلان کر دیا۔

گورنر پنجاب کو معلوم ہوا تو اس نے وائسرائے کی خدمت میں استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا اور لکھ دیا کہ راج پاٹ سنبھالیے۔ اس پنجاب میں اب کوئی انگریز حکمرانی نہیں کر سکتا۔ وائسرائے مجبور ہو گئے اور پھانسی کا حکم بحال رکھا گیا۔ بھگت سنگھ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ ڈاکٹر ستیہ پال کے محبّ وطن ہونے میں کس کو شک ہے مگر قبل از وقت راز کے افشا ہونے سے بنا بنایا کام بگڑ گیا۔

یہی صورت حال خواجہ ناظم الدین کے وعدے کی ہوئی۔ مولانا اختر علی خان جس خلوص سے تحریک ختم نبوت میں کام کر رہے تھے۔ مصروفیت کے باوجود وہ باہر کانفرنسوں میں تشریف لے جاتے اور اس راہ میں اپنی جیب سے روپیہ خرچ کرتے، اخبار زمیندار اس تحریک کے لیے وقف تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس تحریک کو چار چاند لگا دیئے۔ اس تحریک میں مولانا اختر علی خاں نے کسی دوست سے کم حصّہ نہیں لیا۔ خواجہ ناظم الدین کے وعدے کو مولانا نے مرد آہن کا وعدہ سمجھا۔ حالانکہ ان کا وجود سیاسی روئی سے بنایا گیا تھا۔ وہ دور سے بڑے مضبوط انسان نظر آتے تھے مگر ہاتھ لگانے سے معلوم ہوتا تھا کہ سارا جسم پلپلا ہے۔ بہر حال جس طرح اللہ کو منظور تھا، وہی ہوا۔ اس ملاقات میں، میں نے سرکاری کمیونک کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ اپنے کمیونک کی تعریف تو بہت کرتے ہیں مگر اس کمیونک کی سیاہی خشک ہونے سے قبل سر ظفر اللہ خان نے بیان دینا ضروری سمجھا۔ ان کی یہ حرکت کمیونک سے انحراف اور ضابطے کے خلاف ہے۔ وزیر اعظم کے اعلان کو کوئی وزیر استعفیٰ دیئے بغیر چیلنج نہیں کر سکتا اور نہ اپنی منشاء کے مطابق اس کی تشریح و توضیح کا حق رکھتا ہے۔ میرا اعتراض ختم نہیں ہوا تھا کہ سردار عبدالرب نشتر نے خواجہ صاحب کو سہارا دیتے ہوئے مسکرا کر فرمایا، ماسٹر صاحب آپ یہ توقع کیوں رکھتے ہیں کہ جس شخص کو چابک مارا جائے۔ وہ فریاد بھی نہ کرے۔ آپ نہیں دیکھتے کہ اِس کمیونک کی زد براہ راست چودھری صاحب پر پڑتی ہے۔ سارا جھگڑا تو انہی کی ذات کا ہے۔ اس کمیونک کے، دور رس نتائج ہوں گے اور آپ دیکھیں گے کہ حالات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کمیونک سے آپ کی بہت سی شکایات کا ازالہ ہو جائے گا۔ ہمارا وفد کراچی سے واپس ہوا تو راستے کے سٹیشنوں پر بھاری ہجوم نے ہمارے وفد کا استقبال کیا۔ لاہور اسٹیشن پر بھی کافی ہجوم تھا جو فلک بوس نعرے لگا رہا تھا۔

18 اگست کو دفتر زمیندار میں مجلس عمل کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا اور طے پایا کہ دو کمیٹیاں بنائی جائیں۔ ایک پراپیگنڈے کا کام کرے اور دوسری کمیٹی فنڈ جمع کرے تا کہ تحریک کو پرامن طریقے پر

Marfat.com

چلانے میں آسانیاں ہوں۔ پوسٹر اور پمفلٹ شائع کیے جائیں اور ملک کے ہر گوشے تک پیغام پہنچایا جا سکے۔ 19 تاریخ کو مجھے اور شیخ حسام الدین صاحب کو اہل ملتان نے جلسۂ عام کے لیے دعوت دی ہم دونوں ملتان پہنچے اور رات کو مخدوم شوکت حسین کی صدارت میں جلسۂ عام کو خطاب کیا۔ گولی چلنے کے واقعہ اور جیل سے باہر آنے کے بعد ہمیں مجلس عمل کے رکن کی حیثیت سے پہلی بار عوام کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد پنجاب کے مشہور شہروں میں یعنی سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور راولپنڈی، شیخوپورہ وغیرہ میں مجلس عمل کے زیر اہتمام عظیم الشان کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ جن میں تاریخی اجتماعات ہوئے۔ مطالبات کو دہرایا گیا۔ عوام کو پرامن جدوجہد کی تلقین کی گئی اور حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو منظور کرے۔ راولپنڈی میں جو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں مجلس عمل کے تمام ذمہ دار اراکین نے شمولیت کی۔ ابھی کانفرنس جاری تھی کہ خواجہ ناظم الدین صاحب کا پیغام آیا۔ ڈپٹی کمشنر راولپنڈی کی وساطت سے خواجہ صاحب نے مولانا ابوالحسنات صدر مجلس عمل اور مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی کو دستور کے سلسلے میں بلا بھیجا اور تاکید فرمائی کہ ہوائی جہاز کے ذریعے فوراً تشریف لائیں چنانچہ ہر دو حضرات راولپنڈی سے لاہور پہنچے اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی کو ہمراہ لے کر ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی تشریف لے گئے۔ کراچی میں خواجہ ناظم الدین صاحب نے علماء کرام سے بیک وقت ملاقات کرنے کی بجائے ہر مکتب خیال کے علماء سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی۔ مولانا مودودی صاحب علیحدہ ملے، مولانا ابوالحسنات اور مولانا بدایونی سے الگ ملاقات کی اور مولانا محمد داؤد غزنوی سے تنہا تبادلۂ خیال کیا۔ غرض کہ اس ملاقات میں برطانوی ڈپلومیسی کا مظاہرہ باقاعدگی سے ہوتا رہا۔ یہ ملاقاتیں 19 نومبر تک ہوتی رہیں۔ خواجہ صاحب دستور پر دستخط کرنے کے لیے اصرار فرما رہے تھے۔ مولانا ابوالحسنات اور مولانا بدایونی کی ملاقات میں دستور کے علاوہ سر ظفر اللہ خان کی علیحدگی کے مطالبے پر زور دیا گیا تو خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ مطالبہ تو کر رہے ہیں کہ سر ظفر اللہ خان کو علیحدہ کر دیا جائے مگر آپ اس مشکل کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اگر ہم ظفر اللہ خان کو علیحدہ بھی کر دیتے ہیں تو ہمارے کتنے کام بگڑ جائیں گے۔ ان کے بغیر ہم کن مشکلات میں گرفتار ہوں گے۔ خواجہ صاحب کے اس ارشاد پر مولانا ابوالحسناتؒ نے فرمایا کہ خواجہ صاحب ہم تو اللہ کے نیک بندے سے ملنے اور اپنی آرزو بیان کرنے آئے تھے۔ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ ہم ظفر اللہ خان کے بندے سے ملاقات کر رہے ہیں۔ مولانا نے بگڑ کر فرمایا کہ چلئے مولانا بدایونی صاحب! یہاں ظفر اللہ خان ہیں تو سب ٹھیک ہے۔

Marfat.com

ورنہ سب کام چوپٹ ہو جائیں گے۔اس پر خواجہ صاحب کچھ خفیف ہوئے اور مولانا سے نرم نرم باتیں کرنے لگے۔

ماہ دسمبر میں تحریک نے نئی کروٹ بدلی

مجلس عمل کی میٹنگ میں غور وفکر کے بعد یہ طے ہوا کہ حضرات پیرانِ عظام کی عملی ہمدردیاں حاصل کی جائیں۔اس سلسلے میں ایک تحریر لکھی گئی جس میں تحفظ ختم نبوت کے بنیادی مطالبات کو دہرایا گیا اور اعلان کیا گیا کہ حکومت ان مطالبات کو جن کی پشت پر ہر مکتب خیال کے مسلمانوں کی ہمدردیاں موجود ہیں، فوراً تسلیم کرے۔اب یہ سوال پیدا ہوا کہ سجادہ نشین حضرات کرام سے دستخط حاصل کرنے کے لیے وفد میں مجلس کے کون کون حضرات تشریف لے جائیں، چنانچہ طے ہوا کہ حضرت مولانا ابوالحسنات، صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب اور مولانا عبدالغفور صاحب ہزاروی اس کارِ خیر کو سرانجام دیں۔الحمدللہ کہ ان تینوں بزرگ ہستیوں نے پیرانِ عظام کے دستخط حاصل کر لیے اور مجلس عمل نے اس تحریر کو پوسٹر کی صورت میں شائع کر کے پاکستان بھر میں مشتہر کیا۔ان پوسٹروں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ حکومت منہ دیکھتی رہ گئی۔مرزائیوں کے ہاں بڑی ہلچل ہوئی۔مرزا محمود سخت پریشان ہوئے۔تحریک نے ایک نئی کروٹ لی۔پاکستان کے گوشے گوشے میں تحریک سے دلچسپی لی جانے لگی۔تحریک کی مخالفت کے لیے مرزائیوں اور حکومت کے دامن بالکل خالی ہو گئے۔حقیقت یہ ہے کہ سجادہ نشین حضرات کے اعلان نے مرزائیوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔پیر صاحب گولڑہ شریف، پیر صاحب سیال شریف، پیر صاحب چوڑا شریف اور دیوان صاحب سرگودھا کے وسیع حلقۂ اثر میں تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت پورے شباب پر آ گئی۔

19 دسمبر کو دفتر روزنامہ زمیندار میں مجلس عمل کی میٹنگ ہوئی جس میں طے پایا کہ آل پاکستان مجلسِ عمل کے زیر اہتمام 16 جنوری کو آخری فیصلے کے لیے مجلس عمل میں شامل تمام جماعتوں کے نمائندے کراچی میں جمع ہوں۔اُن ہی دنوں حضرات علماء کرام دستور کے سلسلے میں کراچی تشریف لانے والے تھے۔اگر مجلس عمل ان تاریخوں کے علاوہ جنرل اجلاس کا بندوبست دوسری تاریخوں میں کرتی تو مجلس عمل کو بلاوجہ زیر بار ہونا پڑتا۔علاوہ ازیں حضرات علماء کرام کو دوبارہ زحمتِ سفر اٹھانا پڑتی۔ دور دراز مقامات سے ان حضرات کی تشریف آوری مشکل ہو جاتی ہے۔حضرات علماء کرام کا تقاضا بھی یہی تھا کہ مجلسِ عمل کا اجلاس انہی دنوں بلایا جائے۔

Marfat.com

مجلسِ عمل آل مسلم پاکستان کنونشن کی تیاری

14 جنوری بروز جمعہ کراچی میں مجلس عمل آل مسلم پاکستان کنونشن کا اجلاس منعقد ہونا قرار پایا۔ دعوت نامے جاری کر دیئے گئے۔ پراپیگنڈہ شروع ہو گیا۔ انہی دنوں دستور کے سلسلے میں حضرات علماء کرام کا کراچی میں اجتماع ہو رہا تھا۔ ملک بھر میں تحفظ ختم نبوت کی تحریک شباب پر تھی۔ دستور کا چرچا بھی اچھا خاصا تھا مگر اسے ثانوی درجہ حاصل تھا۔ مسلمانوں میں زیادہ جوش وخروش اور دلی وابستگی دستور کی بجائے صرف دستورِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے تھی۔ اس مرحلہ پر خاص واقعہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر دل کی بات زبان پر آ کر رک جاتی تھی کنونشن کی تاریخیں قریب آ رہی تھیں مجلس عمل میں شامل جماعتیں بیتابی سے ان تاریخوں کا انتظار کر رہی تھیں مگر جماعت اسلامی کی کیفیت اس سے مختلف تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جماعت اسلامی کے نمائندے پس وپیش کر رہے ہیں چنانچہ انہی کی تحریک پر حضرت مولانا ابوالحسناتؒ کے دولت کدہ پر مجلس عمل کا اجلاس بلایا گیا۔ کورم پورا نہ ہو سکا تاہم گفتگو ہوئی۔ مولانا نصر اللہ خان عزیز نے فرمایا کہ ابھی بہت سا کام باقی ہے بنگال میں پراپیگنڈہ کی ضرورت ہے۔ ان تاریخوں کو آگے بڑھایئے۔ مولانا نصر اللہ خان کے اشارے سے پس وپیش والی بات سمجھ میں آ گئی۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ کنونشن کا اجلاس فلاں تاریخ کو منعقد ہونا چاہیے۔ ایک خاص تاریخ کے تعین پر زور تھا مگر حضرت مولانا ابوالحسنات نے یہ کہہ کر اس مطالبے کو ٹالا کہ کافی پراپیگنڈہ بھی ہو چکا ہے اور تاریخوں کا تعین ہو جانے کے بعد اجلاس کی تاریخوں کو بدلنا شک وشبہات کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ مولانا نصر اللہ خان نے بے حد زور لگایا اور بار بار ایک خاص تاریخ کے لیے اصرار کیا مگر ان کی بات قبول نہ کی گئی اور وہ ناکام ہو گئے۔ جماعت اسلامی ایسا کیوں چاہتی تھی یہ بات آگے چل کر اس وقت صاف ہو گئی جب راست اقدام کے پروگرام پر بحث ہوئی اور جماعت اسلامی کے ذمہ دار نمائندے نے لگی لپٹی رکھے بغیر دل کی بات کہہ ڈالی۔

کنونشن کا اجلاس

14 جنوری کو بعد نماز جمعہ حاجی مولا بخش صاحب سومرو کی کوٹھی میں زیر صدارت حضرت مولانا ابوالحسنات صدر مجلس عمل آل مسلم پاکستان کنونشن کا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس میں جن نمایاں ہستیوں اور بزرگانِ ملت نے حصہ لیا۔ ان کے نام یہ ہیں حضرت مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیت علماء پاکستان، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری خدام الدین لاہور، حضرت مولانا محمد داؤد

Marfat.com

صاحب غزنوی جمعیت اہلحدیث، مولانا ابواعلیٰ مودودی جماعت اسلامی، حاجی صاحب ترنگزئی، پیر صاحب سرسینہ شریف امیر حزب اللہ، راغب حسن ڈھاکہ، مولانا حبیب الرحمٰن ناظم حزب اللہ، مولانا اظہر علی صاحب ڈھاکہ، مولانا سخاوت الانبیاء مولانا محمد یوسف کلکتوی (کراچی)، مولانا مفتی صاحب دادخان سندھ، مولانا احتشام الحق کراچی، مولانا عبدالحامد خان بدایونی کراچی، مولانا ظفر احمد انصاری، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ، مولانا محمد علی جالندھری، قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی، علامہ حافظ کفایت حسین صاحب ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، سید مظفر علی شاہ شمسی، مولانا محمد متین ناظم جمعیت علماء اسلام کراچی، مولانا محمد شفیع صاحب کے علاوہ پاکستان کے گوشے گوشے سے جید علماء اور رہنمایانِ عظام نے کنونشن میں شمولیت کی، اس تاریخی اجتماع میں بہت گرما گرم تقریریں ہوئیں۔ تحریک کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی اور مطالبات منوانے کے لیے مختلف پروگرام پیش ہوئے۔ ذمہ دار حضرات کے اس اجتماع میں حکومت کی بے توجہی، مرزائیوں کی تنظیم اور سر ظفر اللہ خان کے اقتدار پر سخت اعتراضات ہوئے۔ بعض حضرات کی یہ رائے تھی کہ مطالبات کے لیے آج اور اسی وقت اقدام ہونا چاہیے۔ تاکہ حکومت کا دماغ درست ہو جائے مگر اکثر حضرات نے مسئلے کی اہمیت اور تقدیس کے پیش نظر پروگرام پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کی اپیل کی۔ طویل بحث ومباحثہ کے بعد صاحب صدر نے مسئلہ کی اہمیت اور وقت کی نزاکت کے پیش نظر شرکاء مجلس سے تقریریں مختصر اور مطلب کی بات کہنے کی اپیل کی۔ دوسرے حضرات کے علاوہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا کہ چند آدمی الگ بیٹھ کر باہمی مشورے سے ہاؤس کے سامنے کوئی مناسب اور قابل عمل تجویز پیش کریں۔ تاکہ بے ضرورت باتوں میں قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔ یہ معقول تجویز مان لی گئی تو تیرہ آدمیوں کو منتخب کر کے یہ کام ان کے سپرد کیا گیا اور اجلاس 18 جنوری کے لیے ملتوی ہو گیا۔ 17 جنوری کی رات کو تیرہ میں سے صرف نو یا دس حضرات جمع ہوئے اور باہم مشورہ اور تبادلۂ خیال کیا گیا۔

سب کمیٹی کی میٹنگ

مجھے اس وقت مندرجہ ذیل حضرات کے نام یاد ہیں جو سب کمیٹی کی میٹنگ میں شامل ہوئے۔

حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی
حضرت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی
علامہ حافظ کفایت حسین صاحب
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب
مولانا عزیز الرحمٰن صاحب بنگالی
حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی

Marfat.com

مولانا محمد علی صاحب جالندھری مولانا محمد یوسف کلکتوی

سید مظفر علی شاہ صاحب شمسی ماسٹر تاج الدین انصاری

سب کمیٹی کی کارروائی شروع ہوئی اور تحفظ ختم نبوت کی تحریک کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ابتدائی گفتگو کے وقت خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ سوچتے رہے مگر جب وہ گویا ہوئے تو فرمانے لگے کہ آپ کے اس مطالبے کو ہم نے آٹھ مطالبات کی فہرست میں نواں مطالبہ بنا کر پیش کر دیا ہے۔ اب اس تحریک کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ دستور ہی میں آپ کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ آئندہ تمام جدوجہد دستور ہی کے نام سے ہونی چاہیے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے اس ارشاد کے جواب میں مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی نے فرمایا کہ مولانا صاحب آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ آل مسلم پارٹیز کنونشن پنجاب سے بن کر آئی ہے اور جو مطالبات پیش کیے جا رہے ہیں یہ بھی محض پنجاب والوں کے مطالبات ہیں۔ میں آپ کی آگاہی کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ 2 جون 52ء کو زیر صدارت مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی تھیوسافیکل ہال کراچی میں تمام اسلامی پارٹیوں کی جانب سے ایک کنونشن بلائی گئی تھی۔ جس میں جماعت اسلامی کا نمائندہ بھی موجود تھا۔ اس کنونشن میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے لیے بڑے پیمانے پر آل مسلم پارٹیز کنونشن بلائی جائے۔ موجودہ کنونشن دراصل ہماری اُس کنونشن کا نتیجہ ہے۔ جو 2 جنوری کو منعقد ہوئی تھی جس کی غرض و غایت واضح اور محدود تھی۔ آج مجھے یا آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اصل مطالبات سے اِدھر اُدھر جا سکیں۔ اگر ہم ان مطالبات کو دستوری جدوجہد سے وابستہ کر دیں تو یہ بات ضابطہ کے بالکل خلاف ہوگی۔ مولانا بدایونی صاحب کے ارشادات کی تائید میں، مَیں نے اصولی اختلاف پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ جس کام کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اور جس غرض کے لیے یہ کنونشن بلائی گئی ہے اس کی بالکل جداگانہ حیثیت ہے۔ دستور اپنی جگہ ہے۔ تینتیس جید علماء دستور کے کام میں مصروف ہیں ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اپنے احاطۂ اختیار سے باہر جائیں۔ ہمیں کنونشن نے جو کام سپرد کیا ہے۔ وہ صرف اسی قدر ہے کہ ہم طریق کار کی تجویز مرتب کر کے ہاؤس کے سامنے پیش کریں۔ اس کے علاوہ اگر کچھ کیا گیا تو وہ خلاف ضابطہ ہوگا۔ ہماری گزارشات کے بعد مولانا مودودی نے ایک طویل تقریر فرمائی اور بار بار یہی فرماتے رہے کہ جو کچھ کرنا ہے۔ دستور کے نام پر کیجیے۔ ہم نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ہم سب مل کر صاحبِ دستور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کی حفاظت اور اس مقدس جدوجہد میں کامیابی حاصل کر

Marfat.com

لیتے ہیں تو دستور کا کام بھی بہت آسان ہو جائے گا۔ دستور کی راہ میں مرزائیت اور مرزائیت نواز پہاڑ بن کر کھڑے ہیں یہ مرحلہ طے ہو جائے تو دستور کی کامیابی قریب تر ہو جاتی ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو معقول بات اپیل تو کر رہی تھی مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل میں پوشیدہ خواہشات اور اقتدار حاصل کرنے کے سنہرے خواب انہیں اس بات کے تسلیم کرنے پر راضی نہ ہونے دیتے تھے۔ بحث جاری رہی حضرت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی ناسازی طبع کی وجہ سے معذرت کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ اسی تکلیف کی حالت میں ہم انہیں دو مرتبہ اٹھا کر میٹنگ میں لائے مگر انہیں اس درجہ تکلیف تھی کہ زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکے۔

مولانا محمد علی جالندھری نے کیا کہا

سب کمیٹی کے اجلاس میں جو کارروائی ہوئی اسے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تحریک کے خاتمے اور جیل سے رہائی حاصل کرنے کے بعد لائل پور کے جلسۂ عام میں اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا اور مولانا محمد علی جالندھری صاحب کے دامن سے ایسا الزام باندھنے کی کوشش کی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قصہ یہ ہوا کہ مولانا مودودی نے جب میں نہ مانوں اور میری مانو کی رَٹ لگاتے لگاتے عشاء کے بعد تہجد تک گفتگو کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا تو مولانا محمد علی جالندھری صاحب نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو مخاطب فرما کر کے کہا کہ مولانا صاحب تحفظ ختم نبوت کے مطالبات ایسے مطالبات ہیں۔ جن کی پشت پر بلا کسی اختلاف کے ہر مکتب خیال کے مسلمانوں کی ہمدردیاں موجود ہیں۔ جہاں تک دستور کا تعلق ہے نیک نیتی سے بیسیوں قسم کے اختلافات اب بھی علماء میں موجود ہیں۔ دستور میں بار بار ترمیم اور تنسیخ ہو رہی ہے۔ یہ سلسلہ ابھی کافی وقت لے گا۔ دوسری بات جس پر آپ کو ٹھنڈے دل سے غور فرمانا چاہیے۔ یہ ہے کہ جب دستور کا نام آتا ہے تو غلط یا صحیح، میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا اور صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ لوگوں کا ذہن آپ کے بے پناہ پراپیگنڈہ کی وجہ سے جماعت اسلامی کی طرف منعطف ہو جاتا ہے جماعت اسلامی سے لوگوں کو وہ ہمدردی نہیں جو ہمدردی اور لگاؤ مسئلہ ختم نبوت سے ہے یا جو جذبہ مرزائیت کے خلاف ہر مکتبِ خیال کے مسلمانوں میں موجود ہے۔ اس طرح آج سے چھ ماہ پیشتر یہی حال مجلس احرار کا تھا۔ جہاں ردِّ مرزائیت کا نام آتا تھا لوگوں کا ذہن مجلس احرار کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ اسی خیال سے ہم نے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر برکت علی محمڈن ہال میں ہتھیار ڈال دیئے تھے اور دین کا یہ کام دوسری تمام دینی جماعتوں کے سپرد کر کے خود کو رضا کارانہ حیثیت میں پیش کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اگر تحفظ ختم نبوت کا نام آتا ہے تو لوگوں کے ذہن

Marfat.com

میں آل مسلم پارٹیز کی مجلسِ عمل کا تصور لازمی طور پر آ جاتا ہے۔ اصولی اعتراض کے علاوہ اس مشکل کی طرف سے بھی آپ توجہ فرمائیں اور اس اہم مطالبے کو نواں نقطہ بنانے کا خیال ترک فرمائیں سب کچھ سننے کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی بات پر اڑے رہے بحث نے مایوس کُن صورت پیدا کر دی۔

اس مرحلے پر مولانا محمد علی جالندھری نے حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی دکھتی رگ کو چھیڑا اور ان سے عرض کیا کہ مولانا صاحب اگر آپ کی طرح احرار کا اندازِ فکر بھی یہی ہوتا اور وہ بھی اسی طرح سوچتے کہ مجلس عمل کہاں سے آ گئی۔ ردِّ مرزائیت تو ہمارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ کام ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو ہم کہاں جائیں گے؟ فرمایئے اگر ایسی خودغرضانہ ضد ہم بھی کرتے تو پھر کیا موجودہ صورت حال پیدا ہو سکتی تھی؟

آج ہر مکتبہءِ خیال کے علماء اور سجادہ نشین حضرات اس بنیادی مسئلے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے نام کا خیال رکھتے، ترک نہ کرتے تو کیا مسلمانوں میں یہ بے پناہ جوش اور عقیدت کا یہ والہانہ جذبہ پیدا ہو سکتا تھا۔

یہ تھی وہ گفتگو جو مولانا محمد علی جالندھری اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب میں ہوئی۔ جسے توڑ مروڑ کر جس انداز میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے پیش فرمایا ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔

انصاف فرمایئے

آٹھ دس معزز نمائندے مجلس میں موجود ہیں۔ بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مولانا محمد علی اگر یہ کہتے کہ یہ تحریک، اسلامی دستور کے نام سے چلائی جائے تو احرار کہاں جائیں گے؟ مولانا محمد علی صاحب اگر ایسی گفتگو کرتے تو دوسرے معزز نمائندے جو اس میٹنگ میں موجود تھے، مولانا محمد علی کی کیا گت بناتے؟ کیا ان سب حضرات کو یہ حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ مولانا محمد علی کی اس قسم کی نامناسب اور خودغرضانہ گفتگو سنتے تو انہیں برملا کہہ دیتے کہ احرار جائیں بھاڑ میں، یہ مطالبہ تو مجلس عمل کا مطالبہ ہے۔ احرار تنہا کون ہوتے ہیں؟ احرار تو نو جماعتوں میں سے صرف ایک ہیں۔ مولانا بدایونی، مولانا تھانوی، مولانا غزنوی، حافظ کفایت حسین، مولانا عزیز الرحمٰن (بنگال) اور مظفر علی شمسی ایسے نڈر اور مخلص حضرات اور دیگر اکابر موجود ہیں۔ کیا یہ سب کے سب منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے اور کسی نے زبان تک نہ ہلائی، کیا یہ بات قرین قیاس بھی ہے؟

Marfat.com

میں مولانا سید ابواعلیٰ مودودی صاحب سے دریافت کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ مولانا محمد علی صاحب نے یہی کہا تھا جو آپ ان سے منسوب فرماتے ہیں۔ ایسی لغو بات پر تو آپ دوسرے ہی دن احرار کے خلاف ایک بیان دے کر انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ آپ نے ایسی مجرمانہ درگزر سے کام کیوں لیا؟ میں آپ کو بزدلی اور منافقت کا طعنہ نہیں دیتا۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے مولانا محمد علی کے خلاف تہمت تراشی ہے۔ جو آپ ایسے ''صالح'' انسان کے شایانِ شان نہیں۔ آپ نے کوئی تہمت ہی لگانا تھی تو کچھ سوچ سمجھ کر کوئی اچھا سا افسانہ گھڑا ہوتا۔ کس سادگی سے آپ نے مولانا محمد علی جالندھری سے یہ بات منسوب کی کہ ''اگر دستور کے نام پر ہر کام ہو تو احرار کہاں جائیں گے۔''

انتخابات کا سوال

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جب آل مسلم پارٹیز کو جماعت اسلامی کی دُم چھلہ بنانے کی کوشش میں رات کے بارہ بجا دیئے تو مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی نے سب کمیٹی کے ارکان کے سامنے ایک خدشے کا اظہار کیا۔ وہ غالباً اس طویل اور غلط بحث سے اکتا گئے تھے۔ وہ فرمانے لگے، آپ حضرات میری ایک خلش کو دور فرما کر ممنون فرمائیں۔ مجھے یہ خدشہ ہے کہ آپ حضرات جو مختلف جماعتوں کے نمائندوں کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں۔ مجھے یہ بتائیں کہ اگر تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت طول پکڑ جائے اور اس عرصے میں الیکشن آ جائیں تو کیا آپ الیکشنوں میں اُلجھ تو نہ جائیں گے؟ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو یہ مقدس تحریک تباہ و برباد ہو جائے گی اور دانستہ یا نادانستہ اس تحریک کے ساتھ غداری ہوگی۔ مولانا احتشام الحق صاحب کے اس اہم سوال نے سب کو چونکا دیا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تو لبوں پر زبان پھیر کر پینترے بدلنے لگے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے سوا باقی سب حضرات نے کہا کہ سوال بہت اہم ہے اور قابل توجہ ہے۔ ہم کو یہاں اقرار کرنا چاہیے کہ اس تحریک کو انتخابات کے جھمیلوں سے الگ رکھا جائے گا۔ فرداً فرداً تقریباً سب نے اقرار کرنا شروع کیا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمانے لگے کہ مجھے اس اقرار میں تامّل ہے میں یہ اعلان نہیں کر سکتا کہ جماعت اسلامی انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ مولانا احتشام الحق صاحب نے ایک خدشے کی مزید وضاحت فرمائی اور معاملے کی اہمیت پر زور دیا مگر جب مولانا مودودی صاحب نہ مانے تو مولانا احتشام الحق صاحب دل برداشتہ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ بیٹھے

Marfat.com

تو رہے مگر کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ فرمایا۔

مودودی صاحب کی جماعتی عصبیت

بحث معقول ہو جس میں اصولی اعتراضات ہوں تو نیتوں کا خلوص معاملہ سلجھانے کی راہیں تلاش کر لیتا ہے اور مشکل مراحل آسانی سے طے ہو جاتے ہیں مگر جہاں جماعتی عصبیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو اور عصبیت کی عینک سے دوسرے انسان کم درجے کے نظر آنے لگیں اور طبیعت یہ فیصلہ ہی کر لے کہ اپنے سوا کسی اور کو خواہ وہ کتنا بلند پایہ کیوں نہ ہو، اپنا بڑا مان کر کسی کے ساتھ یا کسی کو رہنما مان کر چلنا ہی نہیں تو مشکلات ہی مشکلات اور تباہیاں مقدر ہوا کرتیں ہیں۔ اس میٹنگ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اقتدار اور عصبیت کے گرداب میں غوطے کھا رہے تھے جب اجلاس میں تقریباً جمود طاری ہوا تو مولانا محمد علی جالندھری نے مجھے فرمایا کہ اب کیا کریں؟ جماعت اسلامی کے امیر تو ''گل محمد'' بنے بیٹھے ہیں۔ میں خود بھی پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ بالآخر میری طبیعت نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اُن کے سامنے سے ہٹ جانا ہی مناسب ہے چنانچہ میں نے مولانا محمد علی صاحب او رشمسی صاحب سے جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے۔ عرض کیا کہ بھئی مولانا مودودی ضد کرتے ہیں، کریں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اگر اپنی غلط پوزیشن پر اڑ گئے ہیں تو انہیں اَڑنے دیجیے۔ یہ کیا کرتے ہیں ایک جماعت کے امیر ہوتے ہوئے اگر وہ محسوس نہیں کرتے اور سب کمیٹی کی حدودِ اختیار سے باہر قدم رکھتے ہیں تو انہیں من مانی کر لینے دیجیے اور جو تجویز لکھواتے ہیں، لکھوانے دیجیے۔ یہ تو مولانا احتشام الحق صاحب کی بات پر کان نہیں دھرتے ہیں اور نہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں۔ ہم ان سے کب تک الجھیں اور کج بحثی میں وقت ضائع کریں۔ سوئے انسان کو جگایا جا سکتا ہے مگر جو شخص جاگتے میں آنکھیں بند کر لے اس کا کیا علاج ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا محمد علی نے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے کہا لکھوائیے مولانا اپنی تجویز۔ چنانچہ مولانا کی تجویز لکھی جانے لگی مگر نامناسب اور بے اصولے پن نے تجویز کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ کانٹ چھانٹ ہوتی رہی، یہ تجویز لکھی جا چکی تو بغیر کسی حادثے کے یہ میٹنگ برخاست ہو گئی۔

کنونشن کا آخری اجلاس

سب کمیٹی کی تجویز اور مولانا مودودی صاحب۔

18 جنوری 53ء کو کنونشن کا آخری اور فیصلہ کن اجلاس شروع ہونے سے قبل حاضرین مجلس

Marfat.com

نے سب کمیٹی کے ارکان سے دریافت کیا کہ گزشتہ اجلاس میں آپ کے ذمے جو ڈیوٹی لگائی گئی تھی، اس کا کیا بنا؟ لائیے وہ تجویز، بتائیے۔ مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی، سید مظفر علی شاہ صاحب شمسی اور دیگر موجود اراکین سب کمیٹی کو حاضرین نے گھیر لیا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے وہ اس وقت تشریف لایا کرتے تھے جب اور سب آ جائیں۔ سب کمیٹی کے ارکان مولانا موصوف کا انتظار کرتے اور حاضرینِ مجلس کو ٹال رہے تھے۔ حقیقتاً سب کمیٹی کی تجویز کا جس کے مجوز مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے۔ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت سے براہ راست کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس تجویز کا منطقی نتیجہ تحریک تحفظ ختم نبوت کو جماعت اسلامی کی سپرد داری میں دے کر کولڈ سٹوریج (سرد خانہ) میں محفوظ کر دینے کے مترادف تھا، جب کنونشن کے شرکاء سے ہاؤس تقریباً بھر چکا تو صدر محترم مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب نے سب کمیٹی کی تجویز مانگی۔ تجویز ہاؤس کے سامنے آ گئی۔ سب کمیٹی کی تجویز پر غور فرمانے کی اپیل کی گئی۔ اس مرحلے پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ تجویز پر لے دے شروع ہوئی۔ ہاؤس نے بیک آواز اس تجویز کے خلاف رائے کا اظہار کیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا محمد علی نے مولانا احتشام الحق صاحب کی معرفت مولانا سید ابوالاعلیٰ موددی صاحب کو کہلوایا کہ آپ اپنی تجویز پر دلائل دے کر تقریر فرمائیں ہم جو سب کمیٹی کے ارکان ہیں۔ اخلاقاً مجبور ہیں کہ آپ کو ووٹ دیں۔ آپ اٹھ کر کچھ فرمائیں تو سہی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے فرمایا کہ اب اس تجویز کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ میں اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ صاحب صدر جناب مولانا ابوالحسنات صاحب نے تجویز کے متعلق جچے تلے مگر مختصر الفاظ میں اظہار خیال فرمایا۔ سب کمیٹی کی تجویز کو خلاف ضابطہ قرار دے دیا اور فرمایا کہ یہ کنونشن صرف تحفظ ختم نبوت اور اس کے متعلق مطالبات کے لیے بلوائی گئی ہے۔ سب کمیٹی کی تجویز حدودِ کنونشن سے باہر ہے چنانچہ سب کمیٹی کی تجویز ختم ہو گئی۔ اس کے بعد صدر محترم نے اصل مسئلے پر از سر نو تبادلۂ خیال کی اجازت دی۔ سب سے پہلے مولانا عبدالحامد بدایونی نے تحریک تحفظ ختم نبوت اور آئندہ پروگرام کے بارے میں ایک برجستہ تقریر فرمائی۔ یہ تقریر ہاؤس کے جذبات کی صحیح ترجمانی تھی، ان کے بعد صاحب صدر نے مجھے حکم دیا کہ میں وہ تمام واقعات اور مراحل جن سے تحریک گزری ہے مختصراً بیان کروں، دس پندرہ منٹ میں وفود کی ملاقاتوں اور تحریک کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد میں نے اپنی رائے کا اظہار لگی لپٹی رکھے بغیر کر دیا۔

Marfat.com

تجویز کس طرح تیار ہوئی؟

میں تقریر کر کے بیٹھنے لگا تو صدر محترم کی اجازت سے حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی نے مجھے ارشاد فرمایا کہ آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اور ہاؤس کے سامنے جو رائے پیش کی ہے، اس کے مطابق تجویز بھی تو کہیے؟ یہاں میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہاؤس میں بحث ہو رہی تھی تو میں نے کاغذ کی ایک سلپ پر تجویز کے متعلق ایک مسودہ تیار کرنے کی کوشش کی تھی، جب صاحبِ صدر نے مجھے تجویز کہنے اور پیش کرنے کی ہدایت فرمائی تو میں نے اسی وقت مولانا مجاہد الحسینی سے سادہ کاغذ طلب کیا اور وہیں تجویز مکمل کرنے بیٹھ گیا۔ ہاؤس کی کارروائی جاری تھی زبانی تجویزیں یکے بعد دیگرے چلی آ رہی تھیں۔ میں نے اپنے مسودہ میں وہ سب کچھ شامل کر لیا جو مَیں اپنی تجویز لکھتے وقت مختلف حضرات کی زبانی سن رہا تھا۔ میری تجویز دراصل ہاؤس کی اپنی تجویز تھی، چنانچہ مَیں نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے نئے کاغذ پر تجویز کی نوک پلک درست کر کے لکھنا شروع کیا۔ تجویز لکھی گئی تو مجھے ایک بار پھر مختصر سی تقریر کا موقع ملا چنانچہ میں نے تقریر کے بعد یہ تجویز پیش کی جو میری ان گزارشات کی منہ بولتی شہادت ہے:

تجویز

''اس حقیقت کے پیش نظر کہ خواجہ ناظم الدین کی بے بس حکومت قوم کے متفقہ مطالبات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی اور اب موجودہ حکومت سے مرزائیوں کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات منظور ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ آل مسلم پارٹیز کنونشن کا یہ اجلاس اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ بحالات موجودہ قوم کے بنیادی مطالبات کو منوانے کے لیے براہ راست اقدام از بس ناگزیر ہے۔ جسے بروئے کار لانے کے لیے ذیل کی صورتیں اختیار کی جائیں۔

1- چونکہ حکومت اس وقت تک اپنی خصوصی مصلحتوں کی بناء پر مرزائیوں کو سرکاری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوئی۔ اس لیے از خود اس فرقہ مرزائیت کو ملتِ اسلامیہ سے مکمل طور پر علیحدہ کرنے کے تمام وسائل استعمال کرتے ہوئے ان کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے۔

2- اگرچہ ایک عرصے سے مرزائی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کے خلاف قوم متفقہ طور پر برطرفی کا مطالبہ کر کے اپنی قطعی بے اعتمادی اور بیزاری کا اظہار کر چکی ہے مگر موجودہ حکومت بہانوں سے اُسے نظر انداز کرتی رہی ہے لہٰذا یہ کنونشن اپنے اس مطالبے میں حق بجانب ہے کہ خواجہ ناظم الدین کی کابینہ فی

Marfat.com

الفور مستعفی ہو جائے۔ تا کہ اسلامیانِ پاکستان اپنے دینی عقائد اور اسلامی روایات کو مکمل طور پر محفوظ کر سکیں۔ متذکرہ صدر مطالبات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کنونشن کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ:

(ا) آل مسلم پارٹیز کنونشن ملک کی مقتدر اسلامی شخصیتوں اور مختلف دینی جماعتوں کے نمائندگان کو اپنی اپنی جنرل کونسل کا رکن قرار دے۔

(ب) یہ جنرل کونسل اپنے میں سے پندرہ اراکین پر مشتمل کونسل آف ایکشن یعنی مجلسِ عمل منتخب کرے۔ جن میں یہ درج ذیل آٹھ اراکین کو یہ کونسل منتخب کر کے یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ جنرل کونسل کے اراکین میں سے سات مزید ارکان کو مجلسِ عمل کے لیے منتخب کرے۔ منتخب شدہ ارکان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری
مولانا عبدالحامد بدایونی صاحب	مولانا ابوالحسنات صاحب
مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی	علامہ کفایت حسین صاحب
ابوصالح محمد پیر صاحب سرسینہ شریف	مولانا محمد یوسف کلکتوی

(ج) کونسل آف ایکشن کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے پیشتر اپنے میں سے ایک نمائندہ وفد ترتیب دے جو مرکزی کابینہ سے ملاقات کرے اور اسے قوم کے آخری فیصلہ سے مطلع کرے۔ اگر مناسب سمجھے تو دوٹوک جواب حاصل کرنے کے لیے مناسب دنوں کی مہلت بھی دے۔

نیز مجلس عمل کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنے طے کردہ پروگرام کی تکمیل کے سلسلے میں عوام الناس کو بہر حال پرامن رہنے کی تلقین فرمائے۔

محرک

تاج الدین انصاری

مؤیدین

مولانا عبدالحامد بدایونی، علامہ حافظ کفایت حسین صاحب، صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب، مولانا محمد امین امیر جماعت ماجیہ (سرحد)، شیخ حسام الدین، قاضی احسان احمد، مولانا محمد علی جالندھری۔"

یہ تھی وہ تجویز جس کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنے "بیان حقیقت" میں

Marfat.com

فرماتے ہیں کہ ''تاج الدین اُٹھے اور ایک لکھی لکھائی تجویز پڑھنے لگے۔'' مَیں اس مرحلے پر انصاف پسند دنیا سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ میری پیش کردہ تجویز کا غور سے مطالعہ فرمائیں اور پھر خود ہی انصاف فرمائیں کہ یہ طویل تجویز جس میں آٹھ حضرات کو منتخب کیا گیا اور بقایا سات کو نامزد کرنے کی اجازت دی گئی ہو۔ یہ تجویز میں گھر سے لکھ کر لا سکتا تھا؟ مجھ غریب کے دامن سے جماعت اسلامی کے قابل احترام امیر نے کیسی کیسی تہمتیں باندھنے کی زحمت گوارہ فرمائی ہے۔ محولا بالا تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی اپنے بیان میں اقرار کرتے ہیں کہ انہوں نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی (مجلس عمل) کا اجلاس

اس تجویز کے پاس ہو جانے کے بعد اس ہاؤس میں صاحبِ صدر کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ جو آٹھ حضرات منتخب ہوئے ہیں۔ وہ آج رات ساڑھے آٹھ بجے دفتر تحفظ ختم نبوت بند روڈ پر میٹنگ کریں اور بقایا سات ممبران کو بھی نامزد کریں اور وفد مرتب کر کے پاس شدہ تجویز کے مطابق وزیر اعظم سے وقت لے کر ملاقات بھی کر لیں۔ دور دراز سے آئے ہوئے لوگ گھروں کو واپس چلے گئے تو ان کو جمع کرنا مشکل ہو جائے گا چنانچہ اس وقت فرداً فرداً سب کو وہیں اطلاع کی گئی۔

اس مرحلے پر مولانا سید ابولاعلیٰ مودودی صاحب اور حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری نے اعلان کیا کہ مصروفیت کی وجہ سے اگر ہم مجلس عمل (مشتمل بر پندرہ ارکان) کے اجلاس میں شامل نہ ہو سکیں تو ہم اپنی جگہ اپنی جماعت کے جس رکن کو بھیجیں گے وہ ہماری طرح ذمہ دار ہوگا۔ ہاؤس نے یہ بات مان لی چنانچہ اسی فیصلہ کے مطابق آخری اجلاس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی جگہ ان کے نائب امیر جناب مولانا سلطان احمد صاحب شریک ہوئے تھے اور اجلاس کی کارروائی میں حصہ لے کر اپنی قیمتی رائے سے حاضرین کو مستفیض فرمایا۔

اتفاقیہ دعوت

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے معتقدین میں سے ایک سوداگر نے اس رات شرکاء کانفرنس کو ایک عشائیہ دیا۔ مجھے اس وقت اراکینِ مجلسِ عمل کے یہ نام یاد ہیں جو دعوت میں شریک ہوئے۔ مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مولانا محمد علی صاحب جالندھری، شیخ حسام الدین، سید مظفر علی شاہ شمسی، ہو سکتا ہے کوئی اور نام اس وقت میرے حافظے سے اُتر گیا ہو۔

Marfat.com

دعوت سے فارغ ہوکر ہم میں سے کسی نے کہا۔لو بھئی دفتر ختم نبوت کے قریب ہی دعوت ہوئی ہے۔اب میٹنگ کے لیے زیادہ آسانی ہوگی۔مولانا محمد علی صاحب کو کہا گیا کہ وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو ہمراہ لے کر دفتر میں آئیں، میں خود اُٹھ کر مولانا محمد علی کے ہمراہ ہولیا۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہم سے تھوڑے فاصلے پر تشریف فرما تھے۔جب مولانا محمد علی نے ان سے کہا کہ سید صاحب میٹنگ میں تشریف لے چلیے تو سید صاحب فرمانے لگے کہ اس میٹنگ میں اب کیا ہونا ہے۔(یہ سید صاحب کا تجاہل عارفانہ تھا) مولانا محمد علی نے کہا جو کچھ پاس ہوا ہے، وہی سب کچھ ہونا ہے۔سات حضرات کی نامزدگی، وفد کی ترتیب، ملاقات وغیرہ۔سید صاحب فرمانے لگے آپ یہ نامزدگیاں وغیرہ خود ہی کر لیجیے یہ تو کوئی اہم کام نہیں ہے۔میں اس میٹنگ میں ضرور چلتا مگر مجھے مولوی صاحبان نے دستور کے سلسلے میں ترمیمات مکمل کرنے کا کام سونپ دیا ہے۔شاید رات بھر مجھے یہ کام کرنا پڑے۔آپ اس میٹنگ کی کارروائی خود ہی کر لیجیے۔مولانا محمد علی نے اصرار کیا کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے ضرور تشریف لے چلیں۔اب تو زیادہ کام نہیں ہے۔تجویز کے مطابق پروگرام بنا دینا ہے۔سید صاحب نے مجبوری کا اظہار کیا، آخر میں مولانا محمد علی نے سید صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کسی نام کی سفارش تو کریں۔دو چار نام ہی لکھوائیے۔سید صاحب فرمانے لگے۔مولانا آپ یہ کام خود ہی کر لیں بس اتنا خیال رکھیے کہ مشہور مشہور بااثر لوگوں کو نامزد کیجیے گا۔وہاں یہ کچھ فرمانے کے بعد اب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو کچھ یاد نہیں رہا۔اب وہ سرے سے مکر رہے ہیں کہ ہم جو کنونشن سے اٹھے تو اس کے بعد جو کچھ ہوا۔وہ سب بے ضابطہ ہے۔ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے کیا فرمایا

جب دودھ پینے والے مجنوں سے کٹورا بھر خون مانگا گیا۔

قبائے لا الہ خونی قبا است
نہ بر بلائے نامرداں و از است

اس کے برعکس مجلس عمل کے ڈکٹیٹر اور آل پاکستان مجلس عمل کے صدر جناب مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد صاحب قادری مدظلہ نے انکوائری کورٹ میں اعلان کیا کہ ہم تحریک تحفظ ختم نبوت کے ذمہ دار ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

Marfat.com

مجلس عمل (راست اقدام کمیٹی)

18 جنوری کو دفتر ختم نبوت بندر روڈ کراچی میں تقریباً 9 بجے سب ارکان نے باقی سات ارکان کی فہرست مکمل کر لی اور ایک وفد مرتب کر کے اسے اختیار دیا کہ کنونشن کا ریزولیوشن اور 30 یوم کا الٹی میٹم وزیراعظم کے سپرد کرے۔ جن سات ارکان کی نامزدگی کے بعد پندرہ ارکان کی فہرست مکمل کی گئی۔ ان کے ناموں کو روز نامہ ''تسنیم'' ترجمان جماعت اسلامی میں 22 جنوری کو آخری صفحے پر چوکھٹے میں شائع کیا گیا۔ یہ ہے جماعت اسلامی کے آرگن روز نامہ ''تسنیم'' مورخہ 22 جنوری کا چوکھٹہ۔

مولانا ابوالحسنات، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مودودی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا احتشام الحق تھانوی، علامہ کفایت حسین، مولانا اطہر علی (بنگال)، پیر ابوصالح محمد جعفر، مولانا اختر علی ''زمیندار''، پیر غلام مجدد سرہندی، صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ، مولانا محمد یوسف کلکتوی، مولانا نورالحسن بخاری۔

کراچی سے واپسی پر 26 جنوری کو آل پارٹیز مسلم کنونشن کا ایک اہم اجلاس زیر صدارت مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صاحب زمیندار مینشن لاہور میں ڈیڑھ بجے منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔

تاج الدین انصاری۔

مولانا غلام محمد ترنم۔

مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش۔

مولانا نصر اللہ خان عزیز صاحب۔

صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب۔

مولانا اختر علی خان صاحب مالک زمیندار۔

حافظ خادم حسین۔

مولانا خلیل احمد۔

Marfat.com

مولانا عطا اللہ حنیف صاحب۔

مولانا ارشد۔

سید مظفر علی شاہ شمسی۔

مولانا محمد بخش مسلم صاحب۔

اس اجلاس میں جہاں جماعت اسلامی کے نفسِ ناطقہ جناب مولانا نصر اللہ خان صاحب عزیز جن کی مساعی جمیلہ، معاملہ فہمی اور ذاتی تعلقات کی وجہ سے جماعت اسلامی کو عوام سے روشناس ہونے کا موقع ملا جو کوثر و تسنیم اور ایشیا کے مدیر ہیں، موجود تھے۔ مجھے صدر محترم نے حکم دیا کہ میں کنونشن اور کونسل آف ایکشن کی کارروائی بیان کروں۔ بے کم و کاست جو کچھ ہوا تھا۔ میں نے عرض کر دیا، اس اجلاس میں مجلسِ عمل پنجاب نے مندرجہ ذیل تجویز اتفاق رائے سے منظور کی۔ جسے دوسرے دن روزنامہ زمیندار اور پنجاب کے دوسرے اخباروں نے شائع کیا۔ صوبہ پنجاب کے بعض ذمہ دار ارکان کو بھی اس اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔

قرارداد

آل مسلم پارٹیز کی مجلسِ عمل کا یہ اجلاس مرکزی کنونشن کی پاس کردہ قرارداد کی پرزور تائید کرتا ہے اور مرکز کو یقین دلاتا ہے کہ مسلمانانِ پنجاب مرکز کی آواز پر جانی اور مالی قربانی سے ہرگز دریغ نہ کریں گے۔ اس کارروائی کے ہمراہ مرکزی کنونشن کی قرارداد اور جو وفد وزیر اعظم سے ملا اس وفد کے شرکاء کے نام بھی درج ہیں۔ یہ تمام کارروائی تقریباً سب اخبارات نے شائع کی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے

کہ مولانا نصر اللہ خان صاحب عزیز نے جماعت اسلامی کے نمائندے ہونے کے حیثیت سے کنونشن کی کارروائی پر نہ صرف مہر تصدیق ثبت کی بلکہ وہ ایک قرارداد کے ذریعے اعتمادِ کلّی کے اعلان کے بعد ایثار و قربانی کا یقین دلانے میں بھی پیش پیش تھے۔ اس حقیقت کی موجودگی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اس طرح صاف مکر جانے کی جرأت کس طرح ہوئی؟ شاید انہیں یہ خیال گزرا ہو کہ احرار کے دفاتر میں تو پولیس نے جھاڑو پھیر ہی دیا ہے اب جو دل چاہے اقرار کرو اور جہاں جی چاہے، مکر جاؤ۔ کوئی ثبوت تو موجود نہیں ہے۔

مگر میں تو روزنامہ تسنیم اور دوسرے اخبارات سے صحیح مواد فراہم کر رہا ہوں۔ تاکہ حضرت مولانا

Marfat.com

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ''راست گوئی'' سب پر عیاں ہو جائے۔ مولانا موصوف اللہ کے خوف اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ذکر مبارکہ کے ساتھ ساتھ جب دوسروں کی نیت پر ناروا حملے کرتے ہیں تو انہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ ان کے تقدس کے شیش محل پر اگر کسی مظلوم نے حق گوئی کا پتھر مار دیا تو ان کا شیش محل چکنا چور ہو جائے گا۔ بہر حال جہاں انہیں دوسروں کی نیت پر حملہ کرنے کا حق ہے، وہاں ہم ان سے اپنا کم از کم حق مانگتے ہیں کہ وہ ہمیں اصل حقیقت بیان کرنے کی اجازت تو دیں۔

الٹی میٹم

مجلس عمل کی مکمل تکمیل یعنی سات ارکان کے اضافے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے ہی دن مجلسِ عمل کا ایک وفد وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو آل پارٹیز مسلم کنونشن کا ریزولیوشن اور مجلسِ عمل کا ایک ماہ کا نوٹس دینے کے لیے شام کے وقت پیر صاحب سرسینہ شریف کی سرکردگی میں ملا۔ اس دن چونکہ اس بارے میں ملاقات کا آخری موقع تھا۔ مجھے گفتگو کی اجازت دی گئی۔ میرے دل میں خواجہ صاحب کا آج بھی احترام ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت نیک آدمی ہیں، مذہبی ذہن کے انسان ہیں مگر طبیعت کے کمزور اور گردوپیش کے حالات سے مرعوب ہو جانے والے بزرگ ہیں۔ علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ خواجہ صاحب نے ہمارے ہمراہ پیر صاحب سرسینہ شریف کو دیکھا تو وہ گھبرائے۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اب بنگال میں بھی مرزائیت کے خلاف آواز اٹھے گی اور اپنے گھر میں مرزائیت نوازی کا چرچا ہوگا۔ میں نے خواجہ صاحب کو متعدد ملاقاتوں کا حوالہ دے کر بتایا کہ ہم کب کب حاضر ہوئے اور کیا کچھ عرض کیا، مرزائی کس طرح آگے بڑھے اور سر ظفر اللہ خان کی وساطت سے وہ کلیدی آسامیوں پر کس طرح چھا گئے۔ مسلمانوں نے کتنی بار احتجاج کیا۔ آپ کے پاس کس طرح فریاد کی مگر آپ نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ آپ کے لیے لازم تھا کہ آپ پہلے ہی دن صاف طور پر فرما دیتے کہ اس بارے میں آپ بے بس ہیں۔ حالات پر آپ کا قابو نہیں تا کہ ہم بار بار آپ کو زور نہ دیتے خود پریشان ہوتے اور نہ آپ کی باتوں سے تسلی پا کر قوم کو اطمینان دلاتے۔

جب بھی ہم سے بات کی آپ نے مطالبات کو درست تسلیم کیا مگر ان مطالبات میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے تسلی ہوتی اور ہم مسلمانوں سے کہہ سکتے کہ مطالبات کو پورا کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ حکومت کو مہلت ملنی چاہیے۔ اس کے برعکس مرزا محمود اور اس کے حالی

Marfat.com

موالی ربوہ کو زیادہ سے زیادہ محفوظ اور ریشہ دوانیوں کا قلعہ بناتے جا رہے ہیں۔ اخبار ''الفضل'' میں آئے دن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خوفناک پراپیگنڈہ ہوتا ہے۔ حکومت کی مشینری مسلمانوں کے خلاف اور مرزائیوں کے حق میں جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو تبلیغِ حق کے لیے مسجدوں تک میں روکا گیا۔ اسلامی ملک میں جس کے سربراہ آپ ایسے متدین وزیرِاعظم ہوں، مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں ہیں مگر مرزائیوں کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ ہم نے آپ سے ابتداء ہی میں عرض کیا تھا کہ سر ظفر اللہ خان حکومت کے اُسی حد تک وفادار ہیں کہ جس حد تک حکومت کے احکامات مرزا محمود کے احکامات سے نہ ٹکرائیں، آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جب آپ نے سر ظفر اللہ خان صاحب کو جہانگیر پارک کے جلسہ عام میں جانے سے روکا تو سر ظفر اللہ نے آپ کے حکم کی پرواہ نہ کی، روکنے اور منع کرنے کے باوجود وہ جلسۂ عام میں اسلام کا منہ چڑانے اور مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے حاضر ہوئے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو مایوس کر دیا ہے۔ آخر میں ہم نے خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ کے ساتھی بھی آپ کے وفادار ساتھی نہیں ہیں، انہیں بھی اسلام سے زیادہ اپنی کرسیاں عزیز ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ وقت پر یہ بھی آپ کا ساتھ نہ دیں گے اور سر ظفر اللہ خان اور ان کے ہمدرد تو آپ کا تختہ الٹ کر رکھ دیں گے۔ وہ وقت کے منتظر ہیں۔ جب بھی موقع ملا، وہ آپ کے اقتدار کو ختم کر دیں گے۔ کچھ عجب نہ ہوگا، اگر وہ آپ کی ہستی ہی کا خاتمہ کر دیں۔ ان گزارشات کے سننے کے بعد خواجہ صاحب کچھ متفکر نظر آ رہے تھے مگر وہ بُری طرح جکڑے جا چکے تھے۔ ان پر واقعی سر ظفر اللہ خان نے رعب بٹھا رکھا تھا۔

پیر صاحب سرسینہ شریف نے جب خواجہ صاحب کو تیس دن کا الٹی میٹم دیا تو وہ فرمانے لگے کہ الٹی میٹم کیسا؟ پیر صاحب نے فرمایا کہ یہ فیصلہ تو آل مسلم پارٹیز کنونشن کا فیصلہ ہے۔ یہ الٹی میٹم مسلمانوں کی جانب سے کہ آپ کو یہ مطالبات مان لینے چاہئیں۔ خواجہ صاحب نے پیر صاحب سے بنگالی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ میری بات سنیں یہ کہہ کر وہ پیر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ہم سب سے کچھ دور لے گئے۔ گفتگو ہم نہ سن سکے مگر ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ پیر صاحب بات سن کر سر ہلا کر انکار کر رہے تھے۔ چند منٹ بعد پیر صاحب اور ہم سب خواجہ صاحب کے ہاں سے واپس آ گئے یہ ملاقات سیکرٹریٹ میں ہوئی تھی۔

Marfat.com

کراچی سے واپس

کراچی سے واپسی پر لاہور پہنچے۔ میٹنگیں ہوئیں اور مشہور شہروں میں عظیم الشان جلسے ہوتے رہے۔ روزنامہ ''زمیندار'' نے تیس دن کے الٹی میٹم کو دیدہ زیب چوکھٹوں میں شائع کرنا شروع کیا۔ پراپیگنڈے کا یہ طریقہ بہت ہی کامیاب رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ زمیندار اور مولانا اختر علی خان نے رفاقت اور فرض کا حق ادا کر دیا۔ روزنامہ ''آزاد'' تو تحریک کے لیے وقف تھا ہی۔ صوبہ پنجاب کے مسلمان دونوں اخباروں کا کثرت سے مطالعہ کرتے تھے۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے اور ''زمیندار'' میں چوکھٹے کے ذریعے اعلان ہوتا تھا کہ اب الٹی میٹم کی معیاد ختم ہونے میں صرف اتنے دن باقی ہیں، لوگوں کی توجہ اور دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجلس عمل کے رہنما جگہ جگہ جلسہ عام کے ذریعے تحریک کو تیز تر کرتے جا رہے تھے۔ حکومت کی مشینری بھی افسران بالا کے مشوروں سے روک تھام کی تجویزیں سوچ رہی تھیں۔

پرامن رہنے کی تلقین

مجلسِ عمل یہ سمجھ چکی تھی کہ تحریک کی کامیابی کا انحصار پرامن ذرائع سے ہوسکتا ہے چنانچہ ہر جلسے میں ہر ذمہ دار مقرر نے لوگوں سے واضح الفاظ میں کہا کہ ہر قیمت پر پرامن رہو۔ اگر ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو تحریک کو نقصان پہنچے گا۔ لوگوں کو ذہن نشین کرایا گیا کہ جو شخص بھی امن شکنی یا اشتعال انگیزی کی بات کرے سمجھ لو کہ وہ تحریک کا دشمن اور بیگانے کیمپ کا آدمی ہے۔ ہم جانتے تھے کہ مرزائیوں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ مسلمانوں اور حکومت کا تصادم کرا دیں۔ حکومت کی مشینری میں بھی بعض مرزائی کلیدی آسامیوں پر قابض تھے ہمیں اس مشین پر بھی شک تھا کہ امن برقرار رکھنے کی بجائے یہ بھی الٹا چکر چلائے گی۔ تاہم عوام نے مجلس عمل کی ہدایات کو دل کے کانوں سے سنا اور اس پر عمل بھی کیا، انتہائی اشتعال انگیزی کے باوجود لوگ پرامن رہے۔

خواجہ صاحب لاہور تشریف لائے

اچانک معلوم ہوا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب کراچی سے سرگودھا اور لاہور تشریف لا رہے ہیں۔ تحریک پورے شباب پر آ چکی تھی اور مجلس عمل نے اپنے حق میں فضا اس قدر ہموار کر لی تھی کہ مخالف عنصر دب کر رہ گیا اور کسی کو مخالفت کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ مجلس عمل کی میٹنگ ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ خواجہ

Marfat.com

صاحب کی تشریف آوری پر ہڑتال کی جائے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ میری ذاتی رائے ہڑتال کرنے کے خلاف ہے۔ انتہائی مجبوری میں یہ قدم اٹھانا چاہیے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ہڑتال کے ذریعے محترم خواجہ صاحب پر حقیقتِ حال کی وضاحت کر دی جائے وہ سرکاری غلط ملط رپورٹوں کی وجہ سے کسی مغالطے میں نہ رہیں۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ چند مولوی صاحبان تحفظ ختم نبوت کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں بلکہ وہ یہ جان جائیں کہ یہ اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے اور ساری قوم بنیادی مطالبے میں تحریک کی پشت پر موجود ہے۔ فیصلہ ہوا کہ عدیم النظیر ہڑتال کی جائے۔ حضرت مولانا ابوالحسنات، مولانا اختر علی خان صاحب اور مظفر علی شاہ شمسی کے علاوہ میں بھی اس سب کمیٹی کا رکن تھا جو منڈیوں کے چودھریوں سے مل کر تمام منڈیاں بند کرانے کی اپیل کرے چنانچہ مولانا اختر علی خان صاحب کی کار میں ہم سب منڈیوں کے چودھریوں سے ملے۔ سب نے اطمینان دلایا کہ شاندار طریقے پر ہڑتال ہوگی۔ اس پر ہم نے ایک پیامبر سرگودھا بھی بھیج دیا۔ تاکہ وہاں بھی خواجہ صاحب کی تشریف آوری پر ہڑتال ہو جائے۔ ہمیں یقین نہ تھا کہ معمولی پیغام پر بغیر پراپیگنڈے کے سرگودھا میں ہڑتال کامیاب ہو سکے گی مگر جب کوئی تحریک خصوصاً وہ تحریک جو ٹھوس بنیاد پر اُٹھے۔ عوام اور خواص اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ جونہی خواجہ صاحب سرگودھا پہنچے۔ شہر میں اُلو بول گیا۔ کوئی دوکان کھلی نہ رہی۔ اچانک ہڑتال کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف کا سامنا بھی ہوا مگر سب نے خندہ پیشانی سے مکمل ہڑتال کر دکھائی، خواجہ صاحب بہت سٹپٹائے۔ کوئی نوکر بازار سے کوئی شئے خریدنے کے لیے گیا تو دیکھا یہ سارا شہر بند ہے، حکام اس ہڑتال کو چھپانا چاہتے تھے مگر خواجہ صاحب کے اپنے آدمی نے بتا دیا کہ سرگودھا میں احتجاج کے طور پر آپ کی تشریف آوری کی وجہ سے ہڑتال ہے۔

لاہور میں مکمل ہڑتال

خواجہ صاحب لاہور تشریف لائے تو لاہور میں وہ تاریخی ہڑتال ہوئی کہ جس کی نظیر نہیں۔ لاہور پراپیگنڈے کا مرکز ہے جو تحریک لاہور والوں کو متاثر کرے اُسے ملک قبول کر لیتا ہے۔ مجلسِ عمل نے اس تاریخی ہڑتال کے لیے پروگرام بنا لیا تھا۔ باغ بیرونی دہلی دروازہ میں جلسہ عام ہوا۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ باغ کا گوشہ گوشہ پُر ہو گیا۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ بچی۔ لوگوں کو مسئلے کی اہمیت اور حالات بتانے کے بعد انہیں بہر حال پر امن رہنے کی تلقین کی گئی۔

Marfat.com

اس موقع پر حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے خواجہ ناظم الدین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''جاؤ! میری اِس ٹوپی کو خواجہ ناظم الدین کے پاس لے جاؤ۔ میری یہ ٹوپی کسی کے سامنے نہیں جھکی۔ اِسے خواجہ صاحب کے قدموں میں ڈال دو۔ اور اُس سے کہہ دو کہ ہم تجھ سے اقتدار نہیں چھینیں گے۔ ہاں، ہاں، جاؤ، اور میری ٹوپی اس کے قدموں میں ڈال کر یہ بھی کہو کہ عطاء اللہ شاہ بخاری تیرے سؤروں کا ریوڑ بھی چرانے کے لیے تیار ہے، مگر شرط یہ ہے کہ تو حضور فداہ اَبی واُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم رسالت کی حفاظت کا قانون بنا دے کہ کوئی آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین نہ کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دستارِ ختم نبوت پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے۔''

جلسہ ہو رہا تھا مگر مجھے اور شمسی صاحب کو شہر میں گشت کر کے حالات پر قابو رکھنے کی ڈیوٹی پر لگا دیا گیا۔ گھوم پھر کر واپس آئے تو ایس ایس پی مرزا صاحب کا پیغام آیا کہ مرزائیوں کے کالج کے سامنے کچھ گڑبڑ ہے۔ اسے فوراً سنبھالیے اور پولیس سے تعاون کیجیے۔

مرزائیوں کا کالج

D.A.V کالج[1] کی عظیم الشان بلڈنگ پر مرزائیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اسلامیہ کالج کے طلباء مارے مارے پھریں۔ مسلمانوں کے بچوں کو کالج میں جگہ نہ ملے مگر چند مرزائیوں کے لیے ہندوؤں کا سب سے بڑا تاریخی کالج مرزائیوں کی سپردگی میں چلا جائے۔ اندھیر نہیں تو کیا ہے؟ عرض یہ کر رہا تھا کہ اس کالج کے سامنے گڑبڑ تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ جلسے میں شمولیت کے لئے ادھر سے نعرے لگاتا ہوا گزرا تو کسی مرزائی لونڈے نے ان پر پتھر پھینک دیا، ہجوم وہیں رک گیا۔ ادھر سے نعرے لگے۔ ادھر اینٹ پتھر برسے پولیس نے بیچ بچاؤ کر دیا اور درمیان میں کھڑی ہو کر حد فاصل کھینچ دی۔ اتنے میں شمسی صاحب موقع پر جا پہنچے اور مسلمانوں کو صبر کی تلقین کر کے جلسے میں لے آئے۔ وہ شہر میں جہاں کہیں بھی ہجوم دیکھتے۔ انہیں جلسہ گاہ میں پہنچنے کی تاکید کرتے اس طرح یہ ہڑتال کا دن بخیر وخوبی گزر گیا۔ رات کو نسبت روڈ پر جلسہ عام تھا جس میں حضرت مولانا ابوالحسنات، مولانا محمد علی جالندھری، مظفر علی شمسی، علامہ حافظ کفایت حسین اور یہ خادم

---

[1] ڈی۔اے۔وی (D.A.V) کالج کا نام آریہ سماج تحریک کے بانی سوامی دیانند سرسوتی سے منسوب کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں نے دیانند آیورویدک کالج (Dayanand Ayur Vedic College) پر قبضہ کر لیا اور اس کا نام تعلیم الاسلام کالج رکھ دیا۔ مرزا ناصر احمد قادیانی اس کا پرنسپل بن گیا۔ قادیانیوں نے اس ادارے کی آڑ میں مرزائیت کی تبلیغ واشاعت کا سلسلہ سرگرم رکھا تھا۔ 1953ء کی تحریک کے بعد 1954ء میں مرزائیوں سے اس کا قبضہ چھڑوا لیا گیا۔ مرزا ناصر احمد قادیانی تعلیم الاسلام کالج کو ربوہ (چناب نگر) لے گیا۔ ازاں بعد یہ کالج انجمن حمایت اسلام کے زیر انصرام آ گیا اور اس کا نام اِسلامیہ کالج رکھ دیا گیا۔ اب یہ کالج گورنمنٹ اِسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے نام سے معروف ہے۔

Marfat.com

خطاب کرنے والے تھے۔ مجھے حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب نے بلا کر فرمایا کہ جلسے میں میرے ساتھ چلنا۔ میں ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا، نماز عشاء کے بعد جب ہم جلسہ گاہ کے قریب پہنچے تو حاضرینِ جلسہ سڑک میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہمارے لیے پلیٹ فارم تک پہنچنا مشکل ہو گیا۔ جوں توں کر کے لوگوں کو راستہ دینے کے لیے کہا۔ تو کچھ آگے بڑھے۔ ابھی پلیٹ فارم ہم سے دور تھا، پلیٹ فارم کے قریب کچھ ہنگامہ نظر آیا مگر دور کھڑے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا معاملہ ہے۔ ہمت کر کے ہم اور آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ جلسہ گاہ کے قریب ایک مرزائی کا مکان ہے۔ وہاں سے جلسہ گاہ پر خشت باری ہوئی جس سے چند آدمی زخمی ہو گئے اور ایک مسلمان بچی بری طرح زخمی ہو کر خون میں لت پت ہو گئی ہے۔ اس واقعے سے ہم سخت پریشان ہوئے۔ لوگوں میں اشتعال تھا مگر جذبات پر پھر بھی قابو تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر آؤ دیکھا نہ تاؤ، لوگوں کو خطاب کیا اور انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ طائف میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زخمی ہو کر بددعا تک نہ کرنا بیان کرنے کے بعد میں نے زخمی لڑکی کے ورثا کو تسلی دی اور عوام کو صبر کی تلقین کی تو جلسہ قابو میں آ گیا اور باقاعدہ کارروائی شروع ہو گئی۔ حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب نے عالمانہ انداز میں برجستہ تقریر فرمائی۔ مظفر علی شاہ شمسی اور دیگر مقررین کے بعد مولانا محمد علی جالندھری نے پنجابی میں نہایت ہی شاندار اور مدلل اور پُر مغز تقریر کی۔ جلسے پر سکوت طاری تھا، یہ جلسہ رات کے بارہ بجے بخیریت اختتام پذیر ہوا۔

خواجہ صاحب سے ملاقات

خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان گورنمنٹ ہاؤس میں تشریف فرما تھے۔ مولانا ابوالحسنات صاحب نے ملاقات کے لیے وقت مانگا، خواجہ صاحب نے وفد کو ملاقات کی اجازت دے دی، جب ہم رات کے وقت گورنمنٹ ہاؤس پہنچے تو ہمارے ناموں کی پڑتال ہوئی۔ میرے نام پر کھٹک ہوئی مگر جب مولانا ابوالحسنات نے فرمایا کہ مجھے تنہا ملنا مقصود نہیں وفد ملاقات کرے گا۔ خواجہ صاحب گورنر کے کمرے سے نکل کر ہمارے کمرے میں تشریف لائے باتیں شروع ہوئیں۔ مولانا اور خواجہ صاحب کی بات ہو رہی تھی کسی مرحلے پر مولانا نے میری طرف دیکھا اور کسی بات کی تصدیق چاہی، میں نے خواجہ صاحب سے بات کہی تو وہ فرمانے لگے۔ تاج الدین صاحب مجھے آپ سے بات نہیں کرنی ہے۔ میں تو مولانا سے بات کر رہا ہوں میں نے عرض کیا، بہت بہتر خواجہ صاحب، میں خاموشی سے بیٹھ کر آپ کی باتیں سنوں گا۔ مولانا نے اس ملاقات میں خواجہ صاحب سے فرمایا کہ آپ بتا کیوں نہیں دیتے کہ آپ کو ان مطالبات کے قبول کر لینے میں کیا مشکل حائل ہے۔ ہم اس مشکل کا حل تلاش کریں گے۔ ہمیں

Marfat.com

آپ سے ہمدردی ہے۔آپ نیک آدمی ہیں۔فرمائیے تو سہی آخر مشکل کیا ہے؟

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ ہماری مشکلات کو نہیں سمجھ سکتے۔آپ تو مطالبات پیش کر جاتے ہیں، ہم کو معلوم ہے کہ ملک کن مشکلات میں پھنسا ہے اور نجات کی صورت کیا ہے؟ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ ان مطالبات کو آج مان لیں پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کے نام کے کس طرح ڈنکے بجاتے ہیں۔پھر کسی کی طاقت بھی ہے جو آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ساری قوم آپ کی پشت پر ہوگی۔

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ اگر آج میں مطالبات کو مان لوں تو میں پھولوں سے لاد جاؤں گا اور میرے نام کے زندہ باد کے فلک بوس نعرے لگیں گے مگر ملک مشکلات میں پھنس جائے گا۔

مولانا نے دریافت کیا وہ کیسے؟

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ مولانا صاحب آپ تو کہتے ہیں سر ظفر اللہ خان کو نکال دو۔آپ معلوم ہے ملک کی غذائی صورت کیا ہے؟ اگر ہم کو غلہ نہ ملا تو ملک بھوکوں مر جائے گا۔

مولانا نے فرمایا اس بات کا سر ظفر اللہ خان کی علیحدگی سے کیا تعلق ہے؟

خواجہ صاحب نے نہایت سادگی اور صاف دلی سے فرمایا کہ مولانا صاحب! سر ظفر اللہ خان امریکہ سے غلہ دلوا سکتے ہیں۔اگر انہیں علیحدہ کر دیا گیا تو گندم کا ایک دانہ نہیں ملے گا۔مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بیچ میں بول اٹھا اور خواجہ صاحب سے بہ ادب عرض کیا کہ خواجہ صاحب یہ دلیل تو مطالبات کے حق میں جاتی ہے۔اگر بقول آپ کے آج یہ صورت ہے کہ سر ظفر اللہ خان کی وجہ سے ہم کو امریکہ سے گندم ملے گی تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ سر ظفر اللہ خان، پاکستان سے زیادہ طاقتور ہیں۔اس صورت حال کو اگر چند دن اور برداشت کیا گیا تو ہماری زندگی سر ظفر اللہ خان کی مٹھی میں ہوگی۔کیا یہ بہتر نہیں کہ جس قدر جلد اس بلا سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اُسی قدر پاکستان اور ملت پاکستان کے حق میں مفید ہے۔خواجہ صاحب خاموش ہو گئے۔آخر میں فرمایا کہ ہڑتال سنا ہے لاہور میں بھی ہوئی ہے۔پولیس والوں نے زبردستی دوکانیں بند کرائی ہیں۔یہاں کے حکام کا اس میں ہاتھ ہے۔ایسا سادہ مزاج اور نیک انسان جسے بند کمروں میں بٹھا کر یہ تک خبر نہ ہونے دی جائے کہ باہر شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ملکی سیاست کو کیا چلا سکتا تھا۔نیکی اور بات ہے۔پالیٹکس اس سے بالکل مختلف شے ہے۔خواجہ صاحب پریشانی کے عالم میں لاہور سے کراچی تشریف لے گئے۔

Marfat.com

کیا مسلمان فساد کرنا چاہتے تھے؟

نسبت روڈ کا واقعہ آپ نے پڑھا۔ گنجان آبادی میں جہاں بہادر مسلمان مہاجر رہتے ہیں مرزائیوں کا ایک گھر ہو۔ اس گھر سے تھوڑے فاصلے پر ہزارہا مسلمان جلسہ گاہ میں موجود ہوں۔ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت شباب پر ہو۔ مرزائی اپنے گھر سے اینٹیں برسائے مسلمان زخمی ہوں، ایک معصوم بچی کا سر پھٹ جائے، فرمایئے وہاں فساد کیوں نہ ہو؟ فساد ہونا چاہیے تھا مشتعل ہو کر ہزارہا کا ہجوم مرزائیوں کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ لہولہان بچی آنکھوں کے سامنے بلبلا رہی ہو۔ مرزائیوں نے اسے زخمی کیا ہو مگر بہادر اور غیور مسلمان زبان نہ ہلائیں۔ ہاتھ تک نہ اٹھائیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ اے کاش اس وقت کی حکومت کے دل میں ذرہ برابر دیانت ہوتی تو وہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں کے قدم چوم لیتی۔ جن رہنماؤں نے لوگوں کو اس حد تک پُرامن رہنے پر آمادہ کر لیا۔ انہیں فسادی اور امن دشمن کہنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہی ایک واقعہ اس بات کی منہ بولتی شہادت ہے کہ تحریک چلانے والے بہرحال تحریک کو پرامن رکھنا چاہتے تھے اور عوام نے پرامن رہ کر خلوص نیت کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ حکومت اور اس کی مشینری جو چاہے سو کہے اسے کون روک سکتا تھا۔

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تحریک چلانے والوں نے تو لوگوں کو اس حد تک متنبہ کیا کہ اگر کسی مرزائی کی نکسیر بھی پھوٹ گئی تو ہم تحریک کو ملتوی کر دیں گے پھر کیا کسی مرزائی پر ہاتھ اٹھایا گیا؟ ہمارے بعد جو کچھ کرایا گیا۔ وہ سب پر ظاہر ہے کہ کس طرح کرایا گیا۔ اب اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ آج تک جتنی بھی تحریکیں اٹھیں ان میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی مگر اس مقدس تحریک میں اشتعال دلانے کے باوجود لوگ حتیٰ الوسع مشتعل نہ ہوئے۔

الٹی میٹم کی تاریخیں آخری مرحلوں میں جوں جوں دن ختم ہوتے جا رہے تھے مسلمان بیقرار اور ان کی حکومت سوچتی تھی کہ اب کیا ہوگا؟ حکومت فرض کی حدود پھاند کر من مانی کارروائی کرنا چاہتی تھی۔ مرکز اور صوبے ہمارے تو خلاف تھے ہی مگر وہ آپس میں بھی منافقت سے کام لے رہے تھے۔ کاش حکومت مسئلے کی اہمیت اور مسلمانوں کے جائز مطالبات پر ہمدردانہ غور کرتی اور مطالبات تسلیم کر لینے پر آمادہ ہو جاتی۔ اس کے برعکس حکومت کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ ان مطالبات کو پسِ پشت ڈال کر مسلمانوں کو سختی سے دبا دیا جائے، اس کی پوری توجہ قوم کے جذبات کو کچل کر تشدد کے ذریعے تحریک کو دبا دینے پر مبذول ہو گئی۔ آخر میں حکومت کی

Marfat.com

مشینری دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اوپر کے لوگ مسئلے کی اہمیت کو نظر انداز کر کے تحریک سے ٹکرا جانا چاہتے تھے۔ دوسرے درجے کے لوگ مسئلے سے پوری ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ سرکاری دفاتر میں مرزائیوں کی ریشہ دوانیاں بے نقاب ہوگئیں اور مسلمان سرکاری ملازم ان ریشہ دوانیوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہیں تحریک تحفظ ختم نبوت سے گہرا لگاؤ ہوگیا۔ دفاتر میں جہاں کہیں بھی مرزائی افسر کلیدی آسامی پر موجود تھا۔ اس نے مرزائیوں کو حتی الوسع مراعات سے نوازا اور مسلمان غریب منہ دیکھتا رہ گیا۔

شیخ حسام الدین دہلی روانہ ہوگئے

تقسیم ہند کے بعد کوآپریٹو سوسائٹیوں کا حساب کتاب بڑی ٹیڑھی کھیر ہوگیا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے شیخ حسام الدین کی خدمات حاصل کیں۔ یہی ایک شخصیت تھی جو بھارت جا کر مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی رقوم کے بارے میں مل جل کر اپنے اثر و رسوخ سے خاطر خواہ تصفیہ کرا سکتی تھی چنانچہ حکومت نے شیخ صاحب کو چوبیس گھنٹے کے اندر پاسپورٹ مہیا کر دیا اور انہیں پاکستان کی جانب سے تصفیہ کے لیے ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو بھارت بھیج دیا۔ شیخ صاحب موصوف نے حضرت مولانا ابوالحسنات صدر مجلس عمل کی خدمت میں اس صورتحال کو پیش کر کے اجازت چاہی۔ مولانا موصوف نے انہیں دہلی جانے کی اجازت دے دی۔ اس اجازت کا اندراج آج بھی مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صاحب کی ڈائری میں موجود ہے۔

شیخ صاحب نے خود تحریر فرمایا ہے کہ:

''میں. ۲۱ر جنوری ۱۹۵۳ء کی رات کو کراچی سے اس غرض کے لیے لاہور روانہ ہوا کہ مجھے بذریعۂ ٹیلی فون اطلاع ملی تھی محکمہ امداد باہمی پنجاب کا ایک سرکاری وفد ۲۳ر جنوری کو دہلی روانہ ہو رہا ہے جس میں میری شرکت لازمی سمجھی گئی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اس وفد کے پیشِ نظر دونوں صوبہ ہائے پنجاب (مشرقی اور مغربی) کے مسلم اور غیر مسلم کوآپریٹو سوسائٹیوں اور ٹرانسپورٹ کے حصہ داروں کے حقوق اور قرضہ جات وغیرہ کا باہمی تصفیہ کرنا تھا۔ چونکہ میرا تعلق تقسیم ہند سے پیشتر پنجاب موٹر یونین اور آل انڈیا موٹر یونین کے صدر کی حیثیت سے تھا، یہ محکمہ کوآپریٹو کے تعاون سے چلتا تھا۔ پاکستانی سرکاری وفد کے ساتھ میری شرکت مفید ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ مجھے اس وفد میں شرکت کی اطلاع دیر سے ملی تھی اس لیے پاسپورٹ وغیرہ کی تیاری کے باعث ۲۴ر جنوری ۱۹۵۳ء کو روانگی اور دہلی کے سرکٹ ہاؤس میں اپنے وفد سے جا ملا۔ وہاں مجھے اپنے ضروری کاغذات وغیرہ کی تیاری میں وقت لگا کہ یکا یک اخبارات کے ذریعے مجھے اطلاع ملی کہ میرے تمام رفقائے کار اور آل مسلم پارٹیز مجلسِ عمل

Marfat.com

کے رہنما، کارکن، معاونین وغیرہ سب گرفتار کر لیے گئے ہیں اور جو لوگ گرفتاری سے رہ گئے ہیں، ان کے گھروں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ چنانچہ میں. نے بھارت میں اپنی تمام مصروفیات منسوخ کر کے پاکستان واپسی کا پروگرام بنایا اور ۲۸ر فروری کی شب ٹرین میں سوار ہو کر یکم مارچ کی صبح فیروز پور اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں سے میں. نے اپنے معذور لڑکے شیخ ریاض الدین کی معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اپنی واپسی کی بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی جس پر مجھے معلوم ہوا کہ پورے ملک میں وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہے۔ مجلسِ احرار اور مجلسِ عمل کے دفتروں پر پولیس نے قبضہ کر لیا ہے۔ تمام لٹریچر ضبط ہو گیا ہے نیز مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میرے بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ بعد ازاں جب میں بارڈر پر پہنچا تو میرے لڑکے کے ساتھ ایک تھانیدار بھی پہنچ گیا تھا۔ میرے لڑکے نے مجھے بتایا کہ میری سرکاری وفد کے ساتھ بھارت روانگی کے بعد پروپیگنڈہ کیا گیا کہ شیخ حسام الدین بھارت میں تحریک ختمِ نبوت چلانے کی خاطر مالی امداد لینے گئے تھے۔ مجھے قصور سرحد پر گرفتار کر کے وہاں کی جیل میں رکھا گیا۔ ۲۵ر مارچ ۱۹۵۳ء تک وہاں کی قید تنہائی کے بعد ۲۶ر مارچ کی رات بورسٹل جیل میں اور ۲۷ر مارچ کو لاہور سینٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ جیل خانے میں دیوانی احاطہ ایک ایسی جگہ تھی جس میں انگریزی حکومت دیوانی مقدمات کے ملزموں کو اپنے خرچ پر نظر بند رکھتی تھی۔''

کراچی میں تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت

کراچی لشکری شہر ہے۔ دراصل اسے مہاجروں کی بستی سمجھنا چاہیے۔ یوں پنجاب اور بھارت کے دور افتادہ علاقوں سے لاتعداد مہاجر آئے اور کراچی میں آباد ہو گئے۔ جن کی رسائی تھی یا جو ذرا ہوشیار قسم کے لوگ تھے۔ وہ پیر جما کر رئیس بن گئے مگر غریب بے سہارا اور خوددار مہاجروں کو کراچی ایسے مرکزی شہر میں مشکل سے جھونپڑیاں نصیب ہوئیں۔ کراچی کے اصل باشندے تقسیم ملک کے بعد آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے۔ آج بھی کراچی میں یوپی کے مسلمان ناقابل فراموش عنصر کی حیثیت سے آباد ہیں بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ کراچی کی پالیٹکس پر یوپی والوں کا اچھا خاصا اثر ہے۔ مجلسِ عمل کی جانب سے مولانا عبدالحامد بدایونی کراچی میں موجود تھے اور مجلس احرار کے مبلغ مولانا لال حسین اختر کا ہیڈ کوارٹر بھی کراچی ہی میں تھا مگر کراچی کی اہمیت کے پیش نظر جتنا پراپیگنڈہ وہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ہو سکا۔ مجلس عمل نے اس بارے میں غور و فکر کے بعد ہر دو ذمہ دار حضرات یعنی مولانا بدایونی اور مولانا لال حسین اختر صاحبان کو مشورے کے لیے لاہور بلوایا اور صورت حال کا جائزہ لیا۔ مولانا لال حسین اختر باقاعدہ رضا کاروں کی بھرتی کر چکے تھے۔ اندرون شہر اور نئی آبادیوں میں کافی

Marfat.com

رضا کار موجود تھے مگر مرکز میں جلسہ عام نہ ہونے کی وجہ سے تحریک کا خاص چرچا جو ہونا چاہیے تھا۔ وہ نہ ہو سکا۔ مولانا بدایونی صاحب کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ وہ کراچی میں جلسوں کا بندوبست فرمائیں۔ خصوصاً الٹی میٹم کے خاتمے کے قریب تین دن کے لیے آرام باغ میں عام جلسے ہونا ازبس ضروری ہیں۔ مولانا موصوف نے ذمہ داری لے لی اور کراچی تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں مولانا لال حسین اختر صاحب نے کراچی کے بااثر علماء حضرات سے گفتگو کی اور انہیں تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے پراپیگنڈے کے لیے درخواست کی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی اور مفتی محمد شفیع صاحب دونوں حضرات کا ایک خاص حلقۂ اثر ہے۔ جس میں ان حضرات کے سوا کسی اور کا گزر نہیں۔ بدقسمتی سے ان دونوں حضرات کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ بڑے لوگوں کی ناخوشگواری بھی عوام کی خوشگواری سے بہتر ہوتی ہے۔ ان حضرات کے ہاں اختلاف کی حدیں مقرر ہوتی ہیں۔ مولانا لال حسین اختر صاحب کی ڈیوٹی تھی کہ وہ دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہو کر تحریک کے لیے مشورہ اور امداد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

مولانا بدایونی کراچی میں بریلوی حضرات کے صف اوّل کے رہنما مانے جاتے ہیں۔ وہ عوام میں کام کرنا بھی جانتے ہیں اور بہت ہی باہمت بزرگ ہیں اور بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ تحریک ختم نبوت میں مولانا بدایونی پیش پیش تھے۔ اس طرح کراچی میں گو تحریک کی رفتار دھیمی تھی مگر عوام بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور ان کا تقاضا تھا کہ عام جلسے مختلف علاقوں میں ہونے چاہئیں۔ مولانا بدایونی اور مولانا لال حسین اختر نے الٹی میٹم کے اختتام کی تین تاریخوں کے لیے جلسۂ عام کی اجازت حاصل کر لی اور لاہور اطلاع بھیج دی کہ مجلس عمل کے مرکزی رہنما آرام باغ کے جلسوں کو خطاب کرنے کے لیے کراچی تشریف لے آئیں۔

لاہور میں جلسۂ عام

5 فروری 53ء کو بیرون باغ موچی دروازہ لاہور میں زیر صدارت حضرت مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری عظیم الشان جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں مجھے اور مولانا عبدالغفور صاحب ہزاروی، سید مظفر علی شاہ شمسی صاحب، مولانا محمد بخش صاحب، مولانا غلام محمد صاحب ترنم، حافظ خادم حسین صاحب اور مولانا غلام دین صاحب کو عوام سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اس جلسے میں بے پناہ حاضری تھی، باغ بھر گیا تو سڑک کے کنارے لوگوں کے سروں کی دیوار نظر آتی تھی۔ تا حد نگاہ عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود تھا۔ عوام کے جذبات کا یہ عالم تھا وہ مقرر کی زبان سے نرم بات سُن کر ناک بھوں چڑھاتے

Marfat.com

تھے۔اس جلسے میں عوام کو زیادہ سے زیادہ پرامن رہنے کی تلقین کی گئی اور حکوت کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے۔اس جلسے کی مکمل روداد 4 فروری کے ''آزاد'' میں شائع ہوئی تھی جسے آپ کی صحبت میں ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لاہور کے جلسہ عام میں زعمائے ملت کی ارباب حکومت سے آخری باتیں

باغ بیرون موچی دروازہ لاہور کے عظیم الشان جلسۂ عام میں سیال شریف گولڑہ شریف، دیوان شریف' اجمیر شریف، علی پور شریف، سجادہ نشین حضرات اور دیگر مشائخ عظام کی طرف سے تحریری طور پر تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے لیے حلف اٹھایا گیا اور ماسٹر تاج الدین صاحب انصاری نے مرزائیوں کے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کیا۔

ماسٹر تاج الدین صاحب انصاری نے فرمایا کہ مجلس عمل اپنا پروگرام مرتب کر چکی ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اسے آگے قدم بڑھانے سے نہیں روک سکتی اور ہمارا ایمان ہے کہ مرزائیوں کو شکست ہو گی اور جو طاقت بھی ہمارے اس پروگرام میں حائل ہو گی ہم اسے بھی ہٹا دیں گے جب تمام کلمہ گو اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اُمتی ہمارے ساتھ ہیں تو کون کم بخت اور جہنمی ایسا ہے جو غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رستہ روکے گا اور باغیانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے کر جہنم مول لے گا۔

تقریر ختم کرتے ہوئے ماسٹر صاحب نے یہ مصرعہ پڑھا۔

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

اور کہا کہ ہتھکڑیاں پرانی ہو چکی ہیں اور انہیں زنگ لگ چکا ہے۔ہم وہی جھنکار پھر سننا چاہتے ہیں۔تقریر کے آخر میں آپ نے عامتہ المسلمین کے پرامن رہنے کی تلقین فرمائی۔

غازی علم الدین

ماسٹر تاج الدین انصاری کی تقریر سے متاثر ہو کر محترم غازی علم الدین صاحب نے سٹیج پر آ کر اعلان کیا کہ میں اس عظیم الشان اجتماع میں غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر حکومت نے مرزائیوں کے سلسلے میں مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہ کیے تو ارباب حکومت کو اقتدار کی کرسیاں خالی کرنا پڑیں گی اور اگر زعماء ملت کو گرفتار کیا گیا تو میں گرفتار ہونے والوں کی صف اوّل میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کروں گا۔

Marfat.com

مولانا عبدالغفوری ہزاروی

مولانا عبدالغفوری ہزاروی نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وقت تقریروں کا نہیں ہے۔ جیسا کہ صاحب صدر اور ماسٹر تاج الدین صاحب انصاری فرما چکے ہیں۔ میں کسی وزیر کی ذات پر نکتہ چینی نہیں کر رہا۔ میں مجلسِ عمل کے پروگرام پر عمل کروں گا اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں تعاون کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ کو غریبوں کو کھانے کو آٹا نہیں ملتا صرف بڑے بڑے پیٹ رکھنے والے پیٹو آٹا کھا گئے اس لیے کہ صرف بڑے پیٹ والوں کو ہی آٹا میسر آتا ہے۔ اس پر بھی غریب چپ رہے۔ ملک کی کاروباری زندگی میں تعطل پیدا ہوا تو ہم خاموش رہے۔ حتیٰ کہ دستوری سفارشات پیش ہوئیں۔ ہم کچھ نہ بولے اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس سلسلے میں ہم نے اپنی رائے کا اظہار کیوں نہ کیا تو میرے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ جس کا دستور ہے جب اس کی شخصیت ہی محفوظ نہیں تو دستور کیا معنی رکھتا ہے؟ جب نبوت ہی محفوظ نہیں، ناموس ختم رسالت ہی کے تحفظ کا بندوبست جس دستور میں نہیں کیا گیا۔ اسے دستور کہنا خود دستور کی توہین ہے۔ مسلمان اس دستور میں صرف ایک بات مانگتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور ان کے مقام ومنصب کی عزت وناموس کا تحفظ۔ منصب ختم نبوت پر ڈاکے نہ پڑنے دو۔ ہمیں عہدے نہیں چاہئیں۔ یہ عہدے اور وزارتوں کی گدیاں خواجہ ناظم الدین اور ان کے ساتھیوں کو مبارک ہوں۔ وہ اگر اس اسلامی ملک کے اسلامی آئین میں منصبِ ختم نبوت کے تحفظ کا بندوبست کر دیں تو میں اور سارے پاکستانی مسلمان ان کے حامی ومعاون ہیں اور اگر وہ اس تحفظ کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے تو اس کے نتائج کی ذمہ داری کو قبول کریں جو یقیناً خواجہ ناظم الدین پر ہوگی۔

آپ نے کہا ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتوں کے طفیل ہمیں پاکستان ملا ہے۔ اور ایسے پاکستان اور کروڑوں پاکستان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش مبارک کے صدقے میں مل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے نام لیوا اور ان کے اُمتی کہلانے والے ناموس محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کا ہر مال و متاع حتیٰ کہ سلطنتیں تک قربان کرنے کو تیار ہو جائیں۔ کراچی میں طلباء پر پولیس فائرنگ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ جس قوم کے نونہالوں کو فیس میں کمی کا مطالبہ کرنے پر گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا ہو۔ وہاں یہ بات بھی بعید از عقل نہیں کہ ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کا مطالبہ کرنے والوں پر گولیوں کی بارش کی جائے لیکن ہم گولیوں سے ڈرنے والے نہیں۔ کراچی کے طلباء نے تو ہمیں یہ درس دیا ہے کہ اے مولویو اور اے مسلمانو ہم فیس میں کمی کا مطالبہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر

Marfat.com

گئے تو کیا تم ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کی خاطر قربانی دینے سے گھبراتے ہو؟

مولانا نے فرمایا کہ خواجہ ناظم الدین یا ممتاز دولتانہ کا نام طاقت نہیں طاقت عوام کا نام ہے اور عوام کی طاقت کے سامنے حکومت کو جھکنا ہی پڑے گا۔ اگر تحفظ ختم نبوت کے لیے عامتہ المسلمین نے اپنی اس جمہوری طاقت کا مظاہرہ نہ کیا تو وہ قیامت کے روز محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے اور کس منہ سے شفاعت کے امیدوار ہوں گے؟

مولانا عبدالغفور صاحب نے فرمایا کہ ہم ملک میں بدامنی نہیں چاہتے لیکن 22 فروری کے بعد صورت حال کی ذمہ داری ارباب حکومت پر ہوگی۔ سول نافرمانی ہو یا بغاوت پہلے ان نتائج کی ذمہ داری خواجہ ناظم الدین اور ان کی کابینہ پر ہوگی۔

مولانا نے فرمایا کہ یہاں تحریک چلے گی تو گنبد خضرا میں کالی کملی والا (صلی اللہ علیہ وسلم) پوچھے گا کہ کون کون اس مقدس تحریک میں شامل ہیں جو میرے منصب کی عزت و ناموس کے تحفظ کے جذبے سے سرشار ہیں۔ مولانا نے حاضرین سے پوچھا کہ تم میں سے ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کے لیے کون جان دے گا۔ حاضرین نے ہاتھ اٹھا کر عہد کیا کہ ہم ناموس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے۔

سید مظفر علی شمسی

سید مظفر علی صاحب شمسی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ وقت گزر چکا ہے اور باتیں کی جا چکی ہیں۔ مجھے تو آج اس حکومت سے آخری بار یہ کہنا ہے کہ ہم ذلت کی زندگی کے بجائے عزت کی موت مرنے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ خواجہ ناظم الدین اور مسلم لیگ کے باغیوں کو جیل میں بھیجا جا سکتا ہے۔ خان عبدالغفار خان کو ملک کا باغی ہونے کے الزام میں قید کیا جا سکتا ہے لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے باغیوں کو اقتدار کی گدی اور وزارت کی مسند پر بٹھایا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم بتا دیں کہ آج زمانہ بدل رہا ہے اور ایک نئی تاریخ کا باب کھل رہا ہے۔ خواجہ ناظم الدین اور اس کی حکومت پر ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ہم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے باغیوں کو اس اسلامی ملک کی مسند وزارت پر قابض ہوتے برداشت نہیں کریں گے۔ یہ پاکستان کیا اس لیے بنایا گیا تھا کہ یہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن اور ان کی توہین کرنے والے دندناتے پھریں؟

سید مظفر علی شمسی نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت سے اپنے منصب ختم رسالت کا اقرار مانگتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت سے اپنا حق طلب فرما

Marfat.com

رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اسلام دیا۔ قرآن دیا اور ہمارے سینے نور ایمان سے منور کیے۔ آج اس قرآن، اسی اسلام اور خود تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر دشمنان رسول حملہ آور ہیں۔ آج دیکھنا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وناموس کی حفاظت کے لیے کون آگے بڑھتا ہے۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی عظمت برقرار رکھنے کے لیے زندہ ہیں اور اس عظمت کے تحفظ کی خاطر ہم مرنے کو تیار ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ شمع رسالت کے پروانوں کو تحریک تحفظ ختم نبوت میں حصہ لینے کے لیے رضا کارانہ طور پر اپنے ناموں کا اعلان کرنا چاہیے اور ختم نبوت کے محافظوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانا چاہیے۔

دیگر مقررین

جلسہ میں مولانا محمد بخش مسلم، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا حافظ خادم حسین اور مولانا غلام دین صاحب نے بھی تقریریں کیں۔ جلسہ کے آخر میں سیال شریف، گولڑہ شریف، دیوان شریف، اجمیر شریف اور دیگر مشائخ عظام کے عہد نامے پڑھ کر سنائے گئے۔ جن میں تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے عہد کیے گئے تھے۔''

دو بجے بعد دوپہر جلسۂ عام تحفظ ختم نبوت کے نعروں کے درمیان ختم ہوا۔ اس جلسے کے بعد رضا کارانِ احرار کی بھرتی کا کام شروع ہوا۔ ہر ضلع میں رضا کاروں کی بھرتی کے دفتر کھل گئے۔ مسلمان جب بھی سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو پر قربان ہونے کے لیے میدان میں آیا ہے۔ اسے کوئی طاقت انتہائی جبر وتشدد کے باوجود دبا نہیں سکی۔ ایک روز مجھے دفتر میں رضا کاروں کے حلف نامے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میری حیرت کی انتہا باقی نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ان حلف ناموں کو مسلمان نوجوانوں نے اپنے خون سے پُر کیا ہے۔ یہی وہ نوجوان تھے جو ظلم وستم کی آندھی کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے۔

کراچی کا محاذ

مجلس عمل کے لیے آزمائش کی گھڑی قریب آ رہی تھی مولانا بدایونی صاحب سے عرض کیا گیا تھا کہ وہ 17, 18, 19 فروری کے لیے آرام باغ کراچی میں جلسۂ عام کا بندوبست رکھیں۔ انہیں ان تاریخوں میں تو اجازت نہ مل سکی مگر فروری کی 14, 15, 16 کے لیے اجازت مل گئی۔ اس اثناء میں

Marfat.com

مولانا بدایونی نے آخری بار خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کا بندوبست کیا۔ تا کہ انہیں آخری مرحلے پر نیک و بد سمجھا دیا جائے چنانچہ مولانا نے کراچی سے بذریعہ ٹیلی گرام مولانا ابوالحسنات صاحب سے درخواست کی کہ مع احباب کے تشریف لائیے، خواجہ صاحب سے ملاقات ہوگی۔

21 فروری کو حضرت مولانا نے مجھے اور شمسی صاحب کو ہمراہ لیا اور کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم 22 کی شام کو کراچی پہنچے۔ 23 کو خواجہ صاحب نے بلا بھیجا چنانچہ ہم تینوں خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ صاحب نے سردار عبدالرب نشتر کو بھی بلا لیا۔ وہ بھی ملاقات میں شریک ہو گئے۔ خواجہ صاحب لاہوری مرزائیوں کے بارے میں تذبذب میں تھے۔ ہم کہتے تھے دونوں کریلے ہیں، ایک طرف کریلا ہے، دوسرا نیم چڑھا ہے۔ سردار عبدالرب نشتر فرماتے تھے کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانا بڑے خسارے کی بات ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہمیں مرزائیوں کے حقوق تسلیم کرنا ہوں گے اور انہیں ایک دو سیٹیں دینا پڑیں گی۔ جب ہم نے اس کی شرعی پوزیشن بتا کر مطالبہ کیا کہ اب فرمائیے، آپ کو یہ حق بحیثیت مسلمان کہاں پہنچتا ہے کہ آپ مرزائیوں کو اس خانے میں درج کرائیں۔ جہاں صرف مسلمان کا نام درج ہو سکتا ہے۔ جداگانہ انتخاب میں سب سے پہلے مرزائیوں کو الگ کرنا چاہیے۔ تب جداگانہ انتخاب صحیح معنوں میں جداگانہ انتخاب ہوگا۔ سردار صاحب اسلامی نقطہ نگاہ سے قطع نظر صرف سیٹوں کے فائدے کی بات کرتے تھے۔ بہر حال کوئی بات طے نہ ہو سکی اور خواجہ صاحب اپنی بے بسی اور معذوری کا اظہار کرتے رہے بات ختم ہوئی تو خواجہ ناظم الدین جو واقعی علماء حضرات کی عزت کرتے تھے۔ دروازے تک حضرت مولانا کو چھوڑنے آئے اور موٹر کا دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ مولانا کو خود سوار کرایا اور ہم ایک دوسرے سے کافی عرصے کے لیے جدا ہو گئے۔ راستے میں حضرت مولانا ابوالحسنات، خواجہ صاحب کے اعلیٰ اخلاق سے بے حد متاثر ہو کر فرماتے تھے کہ کتنا نیک انسان ہے مگر خدا جانے مطالبے کی مختصر اور سیدھی سی بات اس شریف آدمی کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔ اگر یہ شخص آج بھی کوئی ایک بات مان لے تو سمجھوتے کی صورت پر غور کر سکتے ہیں۔ یہی باتیں کرتے ہوئے ہم دفتر تحفظ ختم نبوت بندر روڈ پر واپس آ گئے۔ مولانا بدایونی اپنی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔

مولانا بدایونی نے دوسرے دن ہمیں پھر فون کیا اور کہا کہ خواجہ صاحب کے پی۔ اے نے پیغام دیا ہے کہ ہم مولانا صاحب اور ان کے ساتھیوں سے دوبارہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پیغام کا انتظار کیجیے۔ مولانا ابوالحسنات نے فرمایا کہ ہم ہر وقت تیار ہیں۔ ہمارا سر تو نہیں پھرا کہ خواہ مخواہ جنگ خریدیں۔ خواجہ صاحب ان مطالبات میں سے کسی ایک کو آج مان لیں تو ہم بقایا کو دوسرے وقت کے

Marfat.com

لیے التوا میں رکھ سکتے ہیں۔ بہر حال ہمیں خواجہ صاحب کے پیغام کا انتظار تھا۔

کراچی میں جلسہ عام

24 فروری کو آرام باغ میں کنونشن کی جانب سے عظیم الشان جلسہ عام کا اہتمام ہوا۔ یہ جلسہ عام حضرت مولانا ابوالحسنات کی صدارت میں بعد نماز عشاء شروع ہوا۔ مقررین میں سید عطاء اللہ شا صاحب بخاری، صاحبزادہ فیض الحسن صاحب، سید مظفر علی شمسی صاحب، مولانا لال حسین اختر صاحب، مولانا محمد علی جالندھری صاحب، مولانا احتشام الحق صاحب اور مولانا بدایونی صاحب کے علاوہ راقم نے بھی کراچی کے مسلمانوں کو خطاب کیا۔

کراچی کس کی ہے؟

اس جلسے میں ہم نے مجلس عمل کی پوزیشن بتائی۔ مطالبات پر روشنی ڈالی اور حکومت کے رویہ کا ذکر کیا اور ہر مقرر نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھے اور ان مطالبات کو جن کی پشت پر ساری قوم کھڑی ہے۔ مطالبات جو اسلام کے بنیادی عقیدے سے متعلق ہیں فوراً تسلیم کر لے اور بلاوجہ مسلمانوں کے جذبات سے نہ کھیلے۔ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا اور اعلان ہو گیا کہ کل پھر جلسہ ہو گا۔

دوسرے دن

چونکہ پراپیگنڈہ ہو چکا تھا۔ اس لیے بے پناہ ہجوم آ گیا۔ اس دن سید مظفر علی شمسی کو خواجہ صاحب کے دربار میں حاضری کا موقع مل گیا۔ معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کو حکومت کی مشینری نے ورغلا لیا ہے اور خواجہ صاحب کے دماغ میں یہ غلط بات بٹھا دی گئی ہے کہ حضور والا یہ کراچی تو آپ کی ہے۔ باہر سے آئے ہوئے چند ملانوں کو کون پوچھتا ہے۔ شمسی نوجوان ہے اس کے خون میں حرارت ہے۔ سیدزادہ تاؤ کھا گیا۔ دوسرے دن کے جلسے میں نہایت پیارے انداز میں اپنی نوجوانی کے مطابق شمسی صاحب نے تقریر کی اور حاضرین جلسہ پر ایسا اثر پیدا کیا کہ سب پر وجد طاری تھا مگر اس جلسے میں شمسی صاحب نے خواجہ صاحب اور ان کے حالیوں موالیوں کے چیلنج کا ذکر تک نہ کیا۔ اس جلسے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ صاحب جلسے میں تقریر کے لیے سٹیج پر تشریف لائے تو ایک رضا کار نے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ صاحبزادہ نے ہار کو توڑا اور سٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف پھینک کر فرمایا۔ میرے عزیز یہ وقت ہار پہنانے کا ہے؟ سرور کونین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کو خطرہ درپیش ہو اور میں ہار پہنوں، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لاؤ ہمیں پابہ زنجیر کر کے دیکھو کہ ہمارے ماتھے پر شکن

Marfat.com

بھی آتی ہے؟ اس کے بعد اپنے مخصوص انداز میں صاحب زادہ صاحب نے موتی بکھیرنے شروع کیے۔ جلسے پر ایک سکوت طاری تھا اور صاحبزادہ صاحب حسبِ عادت ساون بھادوں کی طرح برس رہے تھے۔ صاحبزادہ صاحب کی تقریر نے مسلمانوں کے جذبہ ایمانی کو اس طرح ابھارا کہ بسا اوقات لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس طرح رات کے بارہ بجے تک جلسہ ہوتا رہا اور جب خاتمے کا وقت آیا تو شمسی صاحب نے اعلان کیا کہ کل میری تقریر کے لیے تیار ہو کر آنا۔ جلسہ بخیر و خوبی اختتام پذیر ہو گیا۔

خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے پلٹا کھایا

اِدھر مجلسِ عمل کسی مناسب سمجھوتے کی راہیں تکتی رہی اور اس وہم میں مبتلا ہو گئی کہ خواجہ صاحب اب بلاتے ہیں اور اب مطالبات کے بارے میں کوئی مناسب اور درمیانی راہ پیش کی جاتی ہے۔ اُدھر خواجہ صاحب نے نئے انداز میں سوچنا شروع کیا۔ انتظامی مشین کے وہ کل پرزے جنہیں برطانوی انجینئر مناسب طریقے پر فٹ کر گیا تھا۔ گھومنے لگے۔ مشورہ یہ ہوا کہ کوئی بات نہ کی جائے اور مجلسِ عمل کے لگے بندھوں کو باندھ کر جیل میں بند کر دیا جائے۔ دوسرے دن سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ ہوا کہ کچھ علماء کو ہموار کیا جائے جو اس تحریک کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں مگر اس بارے میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی تاہم اتنا ضرور ہوا کہ دو چار عالم کسی نہ کسی طرح بلوا لیے گئے اور پیار و محبت اور لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر دو چار کو آمادہ کیا کہ ہم مجلس عمل پر ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ عین وقت پر ہماری ہمنوائی کرنا یا ترکیب سے سہارا دینا۔ جس سے تمہاری پوزیشن بھی خراب نہ ہو اور حکومت کا کام بھی بن جائے۔ اس گفتگو کے بعد خواجہ ناظم الدین صاحب نے اعلان کیا کہ بااثر علماء میرے ساتھ ہیں۔ لوگوں نے حیرانی سے خواجہ صاحب کے اس بیان کو پڑھا اور معلوم کرنا چاہا کہ وہ علماء حضرات کون ہیں جو اسلام کے بنیادی مسئلے کی مخالفت کے لیے مسلمانوں کو نظر انداز کر کے حکومت کا ساتھ دینا چاہتے ہیں مگر جستجو کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خواجہ صاحب نے کن علماء کے بارے میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہ بھید بھی بعد میں کھلا۔ جب ان علماء کے سب سے بڑے علمبردار نے اپنے سرکاری گزٹ میں نادانستہ طور پر بڑی ''ہیکڑی'' سے فرمایا کہ یہ اشارہ ان کی جانب تھا۔ بہر حال وقت پر سب کو سانپ سونگھ گیا اور کسی کو مخالفت کی جرأت نہ ہو سکی اور خواجہ صاحب کسی ایک عالم دین کو تحریک کی مخالفت میں اپنے دائیں یا بائیں لا کر کھڑا نہ کر سکے۔

Marfat.com

تیسرا اور آخری فیصلہ کن جلسہ

تلاوتِ کلام کے بعد جناب عبدالرحیم صاحب جوہر جہلمی نے اپنے کلام بلاغت نظام سے حاضرین جلسہ کو محظوظ فرمایا۔ ان کی تاریخی نظم ''میں نہیں کہتا'' نے بہت داد وصول کی اس دن حضرت مولانا ابوالحسنات اس قدر تھک گئے تھے کہ انہوں نے شرکت سے معذوری کا اظہار فرمایا مگر ہم مُصر تھے کہ اس آخری جلسے میں چند منٹ کے لیے شرکت ازبس ضروری ہے۔ مولانا موصوف بہت ہی مہربان انسان ہیں۔ وہ حتیٰ الوسع انکار نہیں کرتے اور اپنی جان پر خندہ پیشانی سے تکلیف برداشت کر لیتے ہیں چنانچہ کچھ عرصہ کے لیے وہ سٹیج پر تشریف لے آئے۔ اس جلسے میں رہنمایانِ مجلسِ عمل نے یکے بعد دیگرے تقریریں کیں۔ یہ جلسہ ذرا دیر سے شروع ہوا۔ اس لیے کہ مجلس عمل کا آخری اجلاس جو دفتر تحفظِ ختمِ نبوت میں منعقد ہو رہا تھا بہت طول کھینچ گیا۔ مولانا احتشام الحق صاحب تذبذب کا اظہار فرما رہے تھے۔ وہ پروگرام کے ہر پہلو پر غور فرمانے کے بعد اعتراضات کرتے تھے۔ اس طرح بحث مباحثہ میں بہت وقت گزر گیا۔ جماعت اسلامی کے نمائندے جناب سلطان احمد صاحب اپنے دلی جذبات کو کچھ دیر چھپاتے رہے مگر بالآخر وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ وہ فرمانے لگے کہ اگر آپ اب بھی پروگرام کو ملتوی کر دیں اور مارچ کو ہمیں پروگرام بنانے کا موقع دیں تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ ہم 9 مارچ کو اسمبلی ہال پر ایسا ہنگامہ کر دکھائیں گے کہ باید و شاید۔ کم از کم پچیس ہزار لوگ اس ہنگامے میں شمولیت کر سکتے ہیں او ر یہ ہنگامہ تاریخی یادگار رہے گا۔ ہم سب نے ان کے خیالات پر تعجب کا اظہار کیا اور مجھے یاد ہے۔ میں نے ان کی خدمت میں صفائی سے عرض کیا کہ ہم ہرگز ہنگامہ نہیں چاہتے۔ ہم تو تحریک کو پُرامن طریقے پر چلانا چاہتے ہیں اور اب تاریخ کا مزید التوا بھی میرے یا آپ کے اختیار سے باہر ہے جب پروگرام بننے لگا اور طے ہوا کہ پانچ پانچ رضا کار غیر آباد راستوں سے وزیراعظم اور گورنر جنرل کی کوٹھیوں پر جائیں تو جماعت اسلامی کے نمائندے مولانا سلطان احمد صاحب نے فرمایا کہ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ میں یہ مشورہ دوں گا کہ رضا کار بارونق سڑکوں پر لے جانا چاہئیں اور ان کا جلوس شہر کے آباد حصوں سے گزرنا چاہیے۔ ہم نے عرض کیا کہ اس طرح ہنگامہ اور بدامنی کا اندیشہ ہے۔ عوام کو کس طرح سنبھالا جائے گا اور اگر پولیس نے خود ہی اپنے آدمیوں کو جلوس میں داخل کرا کے فساد کرا دیا تو تحریک کو دھکا لگے گا۔ مولانا سلطان احمد صاحب تنہا شخص تھے جو اس وقت بھی ہنگامہ پسندی کا اظہار فرماتے تھے مگر وہ کسی کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے اور بالآخر انہیں مجلسِ عمل کے مجوزہ پروگرام کی تائید کرنا پڑی۔ آخر کار جماعت اسلامی کے اپنے ذمہ دار نمائندے نے آخری اجلاس پر مہرِ تصدیق ثبت کر کے گھر کی راہ لی

Marfat.com

اور اپنے چالیس ساتھیوں میں آرام سے جا بیٹھے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انہیں گرفتار کرنے کوئی نہیں آیا حالانکہ پولیس ان کا گھر جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ یہ مجلسِ عمل کے رکن ہیں مگر ہم سب رات ہی کو دھر لیے گئے۔

کراچی تیری ہے کہ میری ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آرام باغ کا آخری اور تاریخی جلسہ جب پیچ پر آ گیا تو لوگوں نے شور مچایا۔ شمسی صاحب تقریر فرمائیں چنانچہ شمسی صاحب سٹیج پر تشریف لائے تو انہوں نے تحریک تحفظ ختم نبوت کے نوٹوں کے بارے میں اپیل کی۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر ''نوٹوں'' کے عوض روپیہ ادا کرنے لگے۔ جلسہ درہم برہم ہونے لگا تو کہا گیا کہ یہ کام جلسے کے بعد سہی۔ اب تقریر سنو۔ تحریک کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے شمسی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں حاضرین کو مسرور کرنا شروع کیا۔ جلسے میں مکمل خاموشی اور سکوت تھا کہ شمسی صاحب نے فرمایا کیوں بھئی کراچی والو، خواجہ ناظم الدین صاحب نے تو ہمیں پرکاہ کے برابر نہیں سمجھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ کراچی سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ یہ ہماری راج دھانی ہے میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں اور میرے بزرگ یہاں واقعی اجنبی ہیں، کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور کراچی میں کوفے کا منظر دوبارہ پیش ہو گا۔ ہم یہاں سوداگری کرنے نہیں آئے ہم تو اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ سرکار مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تاجِ ختمِ نبوت خطرے میں گھرا ہے۔ ہم خواجہ صاحب کی حکومت سے تاج وتختِ ختمِ نبوت کی حفاظت کی یقین دہانی کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہمیں وزارت نہیں چاہیے، دولت نہیں مانگتے۔ ہم اسلام کے بنیادی مسئلے کی خاطر خواجہ صاحب کے دربار سے بھیک مانگنے آئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں یہ کراچی میری راجدھانی ہے۔ اگر آپ خواجہ صاحب کے ساتھ ہیں تو خیر ہم تنہا اس راہ میں صعوبت برداشت کریں گے اور اگر آپ ہمارے ساتھ قربانی دینے کو تیار ہیں تو آپ حضرات میں جو شخص قربانی دینے کے لیے ہمارے رضا کاروں کی فہرست میں نام لکھانا چاہتا ہے وہ سٹیج پر آ کر اپنا نام لکھا دے تا کہ حکومت کے نمائندے جو یہاں جلسے کے چاروں طرف موجود ہیں اور خواجہ صاحب کے خاص ایلچی جو جلسہ گاہ کے ایک کونے میں موجود ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ کراچی کس کی ہے؟ شمسی صاحب کی اس اپیل پر ہزارہا مسلمان اس طرح سٹیج کی طرف بڑھے جیسے باز تیزی سے شکار پر جھپٹتا ہے۔ جلسے میں ایک ہلڑ مچ گیا اور دس پندرہ منٹ شیدایان ختم نبوت کا سٹیج کے گرد اژدہام لگا رہا، بالآخر شمسی صاحب نے بمشکل لوگوں کو سمجھا بجھا کر دوبارہ جلسے میں بٹھایا۔ تقریر دوبارہ شروع ہوئی تو شمسی صاحب نے

Marfat.com

حاضرینِ جلسہ سے جو کم وبیش ایک لاکھ سے کیا کم ہوں گے پھر کہا کہ جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کراچی خواجہ صاحب کی نہیں بلکہ فدایانِ ختمِ نبوت کی ہے وہ ذرا ہاتھ تو کھڑا کریں۔ جلسہ گاہ میں چاروں طرف ہاتھ لہرانے لگے اور ختمِ نبوت زندہ باد کے فلک بوس نعرے لگنے لگے تب شمسی صاحب نے خواجہ صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ:

خواجہ صاحب اب بتاؤ کہ کراچی میری ہے یا آپ کی؟

اس جلسے میں جوش کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسی وقت جیل جانے کو آمادہ و تیار تھے۔ مجھے بھی گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا میں نے بہت ہی مختصر الفاظ میں خواجہ صاحب سے التجا کی کہ وہ مطالبات پر غور فرمائیں۔ ابھی رات باقی ہے۔ صبح ہمیں بلوا لیجیے اور تسلی بخش جواب سے قوم کو سرفراز فرمائیں۔ ہم حکومت سے الجھنے کے لیے نہیں آئے۔ ہماری اب بھی دِلی دعا ہے کہ صبح کو طلوع ہونے والا آفتاب سمجھوتے کی فضا میں نمودار ہو اور خدا آپ کو قوم کے متفقہ مطالبات کو مان لینے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

حضرت امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا خطاب

حضرت شاہ صاحب تو خطابت کے بے تاج بادشاہ ہیں اور تحریک ختم نبوت کے قائد ہیں ۔خلقت ان کے بیان کی منتظر تھی۔

26، فروری کو آرام باغ میں مجلسِ عمل کا عظیم اجتماع ہوا جس میں راست اقدام کمیٹی کے منتخب ارکان کے علاوہ حضرت امیرِ شریعت نے حسبِ ذیل تقریر کی:

خطبہ مسنونہ کے بعد آپ نے فرمایا:

''مرزائی افسروں نے اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامیانِ پاکستان کو کافر اور مرتد بنانے کی ایک ہمہ گیر تحریک کے ساتھ ساتھ اپنے الہامی عقیدے کی بنا پر پاکستان کو ہندوستان سے ملانے کی ناپاک تحریک بھی شروع کر رکھی ہے۔ بھولے اور سادہ لوح مسلمان اقتصادی بدحالی اور معاشی الجھنوں سے تنگ آکر ان کے دامِ تزویر کا شکار ہو رہے ہیں، اور اس طرح مرزائی ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

6، اگست 1952ء کو پاکستان کے وزیراعظم نے اپنے ایک آرڈیننس کے ذریعے سرکاری ملازمین پر پابندی عائد کی تھی کہ وہ کسی مخصوص فرقہ کے عقائد کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔

مرزائی افسران نے اپنے آرڈیننس کا جو مذاق اُڑایا وہ حکومت اور عوام دونوں کے سامنے ہے۔

Marfat.com

سب سے پہلے مرزائی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ نے اس قانون کی مخالفت کرتے ہوئے بیان دیا کہ ہم اپنے مذہبی عقائد اور ضمیر کی تبلیغ سے باز نہیں رہ سکتے، اس کے بعد میاں نصیر احمد فاروقی چیف سیکرٹری حکومت سندھ، خان بہادر ڈاکٹر سید احمد سپرنٹنڈنٹ ڈاڈر سینی ٹوریم، کرنل سید شبیر حسین شاہ انسپکٹر جرنل جیل خانہ جات اور ان کے علاوہ دوسرے مرزائی افسران نے کئی بار کھلے جلسوں کی صدارتیں کر کے کفر وارتداد کی تبلیغ کی، اور سرکاری احکام کا کھلم کھلا منہ چڑایا، لیکن ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دراصل حکومت خود مرزائیت کی تبلیغ کروا رہی ہے۔

ان کے مقابل اگر مسلمان اپنے دینی عقائد اور اسلامی روایات کی تبلیغ کریں تو اسے سرکاری اثر ڈال کر بند کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی قومیں ارباب اقتدار سے اپنے مطالبات کرتی ہیں۔ اور حکومتیں انہیں تسلیم بھی کرتی ہیں۔ مگر ہمارے اربابِ اقتدار عجیب ہیں۔ پوری قوم متفقہ طور پر ان سے مطالبہ کر رہی ہے لیکن ارباب اقتدار کے بہرے کانوں تک کوئی آواز نہیں پہنچ رہی اور وہ ملت اسلامیہ کی آواز کو سُنی اَن سُنی کر رہے ہیں۔ مسلمانانِ پاکستان نے تاج وتخت ختم نبوت کے تحفظ کے سلسلے میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور مرزائی وزیر خارجہ کو وزارت سے برطرف کرنے کے متعلق حکومت سے جو مطالبات کیے تھے اربابِ اقتدار ان مطالبات کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں اور مختلف حیلوں بہانوں سے تحفظ ختم نبوت کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا خواجہ ناظم الدین بھی مرزا بشیر الدین محمود کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ جبھی تو مرزائیوں کے متعلق پوری قوم کے مطالبات کو درخور اعتنا نہیں سمجھ رہے۔ مجھے خصوصی حلقوں سے معلوم ہوا ہے کہ خواجہ ناظم الدین اور مرزائیوں کے درمیان کوئی رشتے ناطے بھی ہو چکے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو مسلمان کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کریں گے، کیونکہ مسلمان قوم کے حکمران وہی ہو سکتے ہیں جو مسلمان ہوں اور محمد عربی کے غلام۔ محمد عربی کے باغی، کافر اور مرتد مسلمان قوم کے حکمران نہیں رہ سکتے۔

تقریر کے آخر میں آپ نے غصے اور جذباتی لہجے میں فرمایا:

''آل مسلم پارٹیز کنونشن نے حکومت کو ایک ماہ کا نوٹس دیا، جس کی میعاد چار دن ہوئے ختم ہو چکی ہے۔ ایک ماہ کے مسلسل صبر آزما اور توجہ کے باوجود حکومت نے جس بے اعتنائی کے ساتھ مسلمانانِ پاکستان کے متفقہ مطالبات کو ٹھکرایا، یہ اس حکومت کے زوال کی نشانی ہے۔''

Marfat.com

عوام سے خطاب کرتے ہوئے:

''آپ حضرات میری زندگی کے گزشتہ تیس' بتیس سالوں کو جانتے ہیں میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، اپنے ضمیر سے مطمئن ہو کر ڈالا۔ پھر چاہے راستے میں جو آئے' میں نے اسے ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ انگریز جیسی جابر سلطنت جب میرے مطالبہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکی تو اس ملک کے حکمران' جنہوں نے یہ ملک اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر حاصل کیا تھا اور آج اسی ملک میں وہ اپنے قوانین اور حکومت کے زور پر پیغمبر ﷺ کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں' کیونکر ٹھہر سکتے ہیں۔

22، فروری کے بعد تا ایں دم ہم حکومت کے فیصلے کے منتظر رہے' مگر وہ خاموش تماشائی کی طرح ہمارے جذبات کا امتحان لیتی رہی۔ اس رات کے بعد قوم جو قدم اٹھائے گی' اس کی ذمہ داری پھر حکومت پر ہوگی۔ مسلمان ناموسِ مصطفےٰ کے تحفظ کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کریں گے۔''

اس اجتماع میں غیر ملکی پریس اور فوٹو گرافرز کے علاوہ امریکن ایمبیسی کے ارکان بھی موجود تھے۔ امیر شریعت کے اندازِ خطابت' طرزِ تکلم کو دیکھ کر انہوں نے بے ساختہ کہا!

آرام باغ کی اسی تقریر سے متاثر ہو کر سندھ کے ایک وڈیرے نے سعودی عرب سے اپنے ایک دوست کو خط کے ذریعے اطلاع دی۔

''اگر 26، تاریخ کو آرام باغ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر نہ سنتا' تو شائد میں گمراہ ہو جاتا۔ الحمدللہ کہ ان کی تقریر نے مجھے گمراہی سے بچا لیا۔ ورنہ قریب تھا کہ میں مرزائی ہو جاتا۔''

رات دو بجے کے قریب یہ اجتماع ختم ہوا۔ تمام رہنما دفتر تحفظ ختم نبوت (بندر روڈ کراچی میں آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ ابھی نیند سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے دفتر کی تمام عمارت کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ کراچی کے ذمہ دار پولیس افسروں نے رہنماؤں کو جو اس وقت دفتر میں موجود تھے گرفتار کر لیا۔ یہ 27، فروری صبح چار بجے کا واقعہ ہے، جس میں حضرت امیر شریعتؒ اور ان کے رفقاء مولانا سید ابوالحسنات قادری' ماسٹر تاج الدین انصاری' صاحبزادہ فیض الحسن مولانا لال حسین اختر' سید مظفر علی شمسی اور مولانا عبدالرحیم جوہر قابل ذکر ہیں۔

گرفتاری

مسلسل دو دن خواجہ صاحب کے بلاوے کا انتظار کرنے کے بعد ہمیں مایوسی تھی۔ علاوہ ازیں خواجہ صاحب نے شمسی صاحب سے جو بات کی تھی، اس سے ظاہر ہو چکا تھا کہ حکومت ہر شیعہ نمائندے

Marfat.com

کو تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت میں شامل ہونے سے روکنا چاہتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ حکومت کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ، پوری قوم اس تحریک سے دلی لگاؤ رکھتی ہیں ان حالات میں ہمارے لیے اب یہ اندازہ لگا لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ زبانی گفتگو کی بجائے حکومت ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار میں گفتگو کو زیادہ پسند کرے گی۔ دو تین راتوں کے تھکے ماندے ہم سب دفتر تحفظِ ختم نبوت میں آ کر چارپائی پر دراز ہو گئے۔ ہم میں سے اکثر سو چکے تھے کہ دفتر کے بند دروازے پر تحکمانہ انداز میں کسی نے دروازے کو زور سے کھٹکھٹا کر فرمایا کہ دروازہ کھولو، ورنہ اسے توڑ دیا جائے گا۔ دروازہ لوہے کی سلاخوں کا بنا ہوا بہت ہی مضبوط تھا۔ دروازے کے قریب عبدالرحیم صاحب جوہر سو رہے تھے۔ وہ اٹھے اور کہا کہ تحمل کرو۔ دروازے میں تالا بھی لگا ہوا ہے۔ چابی لا کر کھولتا ہوں۔ اس قدر بے تابی کیوں ہے۔ یہاں کوئی بھاگنے والی آسامیاں نہیں ہیں۔ ہم تو انتظار میں تھے آپ حضرات تو بڑی دیر میں تشریف لائے ہیں پولیس افسران اس پر بھی جلدی کھولو کی رٹ لگا رہے تھے جوہر صاحب نے مولانا لال حسین اختر کو جگایا کیونکہ چابی ان کے پاس تھی اتنے میں کچھ اور دوستوں نے شور شرابا سن کر کروٹ لی۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب بھی جاگ پڑے مگر وہ ابھی لیٹے ہوئے تھے۔ تالا کھول کر جب دروازہ کھولا گیا تو بہت سے پولیس اور سول افسر اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک افسر نے دفتر میں داخل ہوتے ہی ٹیلی فون کنکشن پر ڈنڈا رسید کر کے کنکشن توڑ دیا۔ ایک پولیس افسر نے پستول تھام لیا۔ غرض یہ کہ اچھا خاصا ڈرامہ کرنے کے بعد انہیں اس وقت خفت محسوس ہوئی جب صاحبزادہ صاحب کو جگایا۔ صاحبزادہ صاحب نے آنکھ کھولی اور نقشہ دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ گرفتاریاں ہوں گی۔ وہ سنبھل کر چارپائی پر بیٹھ گئے اور ازراہِ مذاق فرمانے لگے کہ آپ کو جن کی تلاش ہے۔ وہ بزرگ اس کونے میں استراحت فرما رہے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب نے مولانا ابوالحسنات صاحب کی چارپائی کی جانب اشارہ کیا۔ میں اپنے کمرے سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا چنانچہ میں نے جلدی جلدی اپنا بستر لپیٹا، سامان سنبھالا اور اپنا لوٹا اٹھا کر استنجے کے لیے بیت الخلا کی جانب جانے لگا۔ میں ابھی دو ہی قدم گیا تھا کہ ایک پولیس افسر میری طرف آیا اور کہنے لگا مولوی صاحب آپ کہیں نہیں جا سکتے۔ میں ہنس پڑا اور پاس کھڑے ہوئے افسر سے کہا کہ آپ نے کبھی سیاسی لوگوں کو اس سے قبل گرفتار نہیں کیا؟ ہم گرفتار ہونا نہ چاہتے تو ہم سب یہاں سے بہت آسانی کے ساتھ جا سکتے تھے۔ آپ حضرات باہر دروازہ کھٹکھٹاتے رہتے اور جب اسے توڑ تاڑ کر اندر آتے تو آپ کو مایوسی ہوتی۔ آیئے میں آپ کو دوسرا راستہ بتاؤں جو دوسری سڑک پر نکلتا ہے۔ آپ جس سڑک پر پہرہ لگائے کھڑے ہیں۔ یہ اس بلڈنگ کا ایک حصہ ہے۔ افسران حقیقتِ

Marfat.com

حال آشکارا ہونے پر شرمندہ ہوئے اور فوراً اپنا رویہ بدل لیا۔ ہم نے اپنا اسباب درست کر لیا تو افسران سے کہا کہ نیچے سے کچھ سپاہی منگوایئے جو اسباب اتار لیں۔ ہم سب نیچے اترے تو دیکھا کہ دفتر کی سڑک اور چوک میں مسلح پولیس کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ پولیس نے اچھا خاصا مظاہرہ کر رکھا تھا۔ کاریں، لاریاں تیار کھڑی تھیں۔ ہم سب تیار ہو رہے تھے تو ایک پولیس افسر نے کہا کہ مولوی نیاز صاحب کہاں ہیں۔ ہمارے کسی رفیق نے سادگی سے کہہ دیا کہ آپ آرام باغ میں ہو کر نہیں آئے، وہ تو وہاں جلسہ گاہ میں سامان کی نگرانی کے لیے ٹھہر گئے تھے چنانچہ پولیس انہیں آرام باغ سے گرفتار کر کے لے آئی۔ اب ہم کُل 9 ارکان تھے یعنی حضرت ابوالحسنات، حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن، عبدالرحیم جوہر، نیاز لدھیانوی، مولانا لال حسین اختر، اللہ نواز ایڈیٹر ''حکومت''، شمسی صاحب اور تاج الدین انصاری۔ جب ہم کراچی جیل میں داخل ہوئے تو ڈیوڑھی پر افسرانِ جیل موجود تھے وہ ہمارے ناموں کا اندراج کر ہی رہے تھے کہ مولانا عبدالحامد بدایونی صاحب بھی تشریف لے آئے انہیں مقامی پولیس اُن کے گھر سے گرفتار کر کے لے آئی۔ گویا اب ہماری تعداد 10 ہوگئی۔ صبح اذان ہوئی ہم نے جیل والوں سے کہا کہ ہمیں اندر بھیجئے۔ تاکہ ہم نماز کا بندوبست کر لیں اور آپ اندراجات کرتے رہیے۔ جیل کے افسران نے جلدی جلدی کام ختم کیا اور ہم نے اندر کے پھاٹک پر بسم اللہ کہتے ہوئے قدم رکھا۔ اندر گئے وضو کیا اور نماز باجماعت ادا کی اس کے بعد ہم نے اپنے مستقل مسکن کا تقاضا کیا، افسرانِ جیل نے اے کلاس وارڈ جہاں کبھی مولانا محمد علی، شوکت علی مرحومین تحریک خلافت میں گرفتار کر کے رکھے گئے تھے اس وارڈ میں ہمیں پہنچا دیا۔ تھکے ماندے تو تھے ہی، زمین پر ہی بستر بچھا کر سو گئے۔ دن نکل آیا باہر دروازہ کھلا تو وارڈ میں اچھی خاصی چہل پہل ہوگئی۔ جہاں حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری موجود ہوں، صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب ایسے خوش مزاج سجادہ نشین تشریف فرما ہوں، شمسی صاحب ایسا خوش طبع اور سراپا ہنگامہ نوجوان موجود ہو۔ وہاں جیل چیز ہی کیا ہے؟ کون محسوس کرتا ہے کہ ہم کیا ہیں۔ جیل کے افسران بڑی احتیاط اور نہایت بارعب طریقے سے قیدیوں کی وارڈ میں آیا کرتے ہیں۔ پہلے شور ہوتا ہے صاحب آ گئے ہیں، مشقتی قیدی اور پہرہ دار چوکس ہو کر باادب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر ہی سے کڑک دار آواز میں کسی قیدی یا ملازم کو ڈانٹ ڈپٹ کی آواز آتی ہے۔ تب ہر وارڈ میں ایک سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے خاموش اور سہمے ہوئے ماحول میں جب جیل کا کوئی افسر وارڈ میں داخل ہوتا ہے تو بڑے دل گردے کے قیدی بھی ایک بار سنبھل کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم فقیروں پر چونکہ ایسی وارداتیں زندگی بھر گزرتی رہی ہیں۔ اس

Marfat.com

لیے ہمیں گفتگو کرنا بھی آتی ہے اور ہم جیل کے آداب سے بھی واقف تھے۔ آیئے آیئے، السلام علیکم خیریت ہے دولت خانہ کہاں ہے، غرض یہ کہ بے تکلفی کے مہذب سوالات میں افسران جیل کو بے تکلف دوست بنالیا جاتا ہے۔ تصنع اور منافقانہ گفتگو کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اس صورتحال میں فریقین کو تکلیف کا سامنا نہیں ہوتا۔ نہ قیدی کو شکایت پیدا ہوتی ہے اور نہ افسر بلاوجہ پریشان ہوتا ہے۔ جیل افسران کے نزدیک اب ہم جانے پہچانے قیدی تھے۔ صبح کے ناشتے کے لیے ڈبل روٹیاں آ گئیں، چائے آ گئی۔ لپٹن چائے جو کیکر کی مسواک کا کام بھی دے دیتی ہے اور جسے ''خالص چائے'' کے نام سے عام طور پر پیا جاتا ہے۔ ناشتے کے بعد کھانا آ گیا۔ دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ صاحب تشریف لائے ان کے ہاتھ میں بڑی خوبصورت تسبیح تھی وہ کچھ پڑھتے ہوئے تشریف لا رہے تھے۔ ہم پڑھ کر فارغ ہوئے بیٹھے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ مولانا بدایونی صاحب کے معتقدین میں سے تھے۔ غالباً ان کی بیوی بڑے مولانا سے بیعت تھی۔ بہرحال وہ مولانا سے بہت بے تکلف ہو گئے۔ ہمارا بوجھ بھی ہلکا ہوا۔ ہم نے باورچی خانے کے لیے درخواست کی اور راشن مانگ لیا۔ تاکہ اپنا کھانا خود ہی پکالیا کریں۔ وہ مان گئے۔ معمار آ گیا اینٹیں آ گئیں دو تین دن میں باورچی خانہ بن گیا۔ ہم ابھی جیل میں جم کر بیٹھنے نہ پائے تھے کہ دوسرے ہی دن مولانا مہرالٰہی جو کراچی کے مشہور واعظ ہیں معہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب خطیب اور میاں محمد صاحب سجادہ نشین داتا گنج بخشؒ تشریف لے آئے یہ تینوں حضرات کراچی میں گرفتار ہوئے اور شہر کراچی میں اچھا خاصا کام کرنے کے بعد پکڑے گئے۔

کراچی میں تحریک کا زور

ہماری گرفتاریوں کے بعد کراچی شہر میں ہڑتال ہو گئی۔ تب شاید خواجہ صاحب بھی سٹ پٹائے ہوں گے۔ مسلمانوں میں بے پناہ جوش تھا۔ پہلے ہی دن تقریباً چار ہزار مسلمانوں نے گرفتاریوں کے لیے خود کو میدان میں پیش کر دیا۔ کراچی کے حکام بہت ہوشیار ثابت ہوئے۔ وہ جب لوگوں کو گرفتار کر چکے تو انہیں معلوم تھا کہ ان کے بعد اور بھی آئیں گے۔ شاید دوسرے دن اس سے بھی زیادہ لوگوں کو گرفتار کرنا پڑے۔ کچھ لوگوں کو وہ لاریوں میں بھر کر جیل بھیج چکے تھے۔ کراچی میں اے۔ ٹی نقوی کی حکومت تھی۔ نقوی صاحب بڑے ہوشیار اور معاملہ فہم انسان ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ گرفتار شدگان کو لاریوں میں بھر کر کراچی سے آٹھ دس میل دور غیر آباد علاقے میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ترکیب گو بڑی ظالمانہ تھی مگر بہت کارگر ثابت ہوئی۔ جیل میں اتنے لوگوں کے لیے گنجائش ہی کہاں تھی۔ باہر یہ کچھ ہوا اور اندر بھی یہی داؤ کھیلا گیا۔ جن لوگوں کو پہلے دن گرفتار کیا تھا۔ انہیں کہا۔ تمہارے ملاقاتی آئے ہیں۔ چلو

Marfat.com

دروازے پر چل کر ملاقات کرلو۔ دروازے پر لے جا کر ان لوگوں سے فارم پر دستخط کرائے اور جیل سے باہر نکال دیا۔ پہلے دن قید ہونے والوں میں شیعہ نوجوان کافی تعداد میں پکڑے گئے تھے مگر ان سب کو جیل سے باہر نکال دیا گیا۔ قید ہونے والوں اور گرفتار ہونے والوں میں آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ اس طرح آہستہ آہستہ لوگوں کا جوش ٹھنڈا ہونے لگا جب انہیں گرفتار ہی نہ کیا جائے تو وہ کیا کریں؟ دس پندرہ روز میں نقوی صاحب نے کراچی کو ٹھنڈا کر دیا۔ باہر رہنماؤں میں سے کون تھا؟ جماعت اسلامی جس نے ''شرعی'' دھنیا پی رکھا تھا یا چند وہ بزرگ جنہیں خواجہ ناظم الدین نے گرفتار نہ ہونے دیا بلکہ ترکیب سے باتوں باتوں میں ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ ہمیں اب کچھ معلوم نہ تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ پنجاب پر کیا گزری ہے؟ اچانک آٹھ یا نو مارچ کو خان بہادر محمد عبداللہ صاحب سرکاری طور پر ہمارے پاس اندر بھیجے گئے۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے۔ فرمانے لگے۔ غضب ہو گیا۔ ہم سب ان کے گرد جمع ہو گئے اور دریافت کیا کہ خان صاحب کیا غضب ہو گیا؟ خان بہادر صاحب نے فرمایا کہ لاہور میں گولی چل رہی ہے اور میں وہیں سے سیدھا آ رہا ہوں۔ میں نے لوگوں کو خون میں لت پت ہوتے اور سڑکوں پر دم توڑتے دیکھا ہے۔ میں مسجد وزیر خان میں بھی ہو آیا ہوں۔ خدا کے لیے بتائیے۔ یہ کیا ہوا ہے، کیوں ہوا ہے؟ اسے روکیے، صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب نے بے ساختہ جواب دیا کہ خان بہادر صاحب بیوقوف حکومت نے عقل کو پابہ زنجیر کر کے جیل میں بند کر دیا اور جذبات کو کھلا چھوڑ دیا۔ یہ سب کچھ جو آپ دیکھ کر آئے ہیں۔ اسی حماقت کا نتیجہ ہے۔ ہم یہاں بند ہیں اب ہم اس بے بسی کے عالم میں کیا کر سکتے ہیں۔ تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے کسی کی نکسیر بھی پھوٹی؟ خان بہادر صاحب نے فرمایا کہ آپ کوئی بیان دے کر تحریک کو بند کرائیے۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ ہمارے بیانات جو جیل سے جائیں گے۔ انہیں کون سنے گا اور کون اعتبار کرے گا۔ کیسی زبردستی ہے کہ ہمیں بند بھی کر رکھا ہے اور اپنی منشا کے مطابق حماقت کرنے کے بعد ہمیں سے یہ توقع ہے کہ ہم لوگوں کو اندر بیٹھ کر سمجھائیں۔ حکومت کو چاہیے کہ باہر بے گناہ لوگوں پر گولیاں چلانے کی بجائے یہاں آ کر ہم کو گولیوں سے اڑا دے تا کہ حکومت کا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو جائے۔ سر ظفر اللہ خان بھی خوش ہو جائیں اور ہمیں بھی یہاں بے بسی کے عالم میں اپنے بھائیوں کی دکھ بھری خونی داستان سن کر خون کے آنسو نہ بہانے پڑیں۔ خان بہادر صاحب اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے مگر ہمیں غم واندوہ میں مبتلا کر گئے۔ ہمارے ہاتھ ہر نماز میں بلکہ ہر وقت باہر والوں کے لیے دعا کے لیے اٹھتے تھے۔ ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے باہر بیدردی کا کھیل کھیلا جا رہا تھا اور ہم بے بسی میں بل کھا رہے تھے۔ ہمیں مسلمان حکومت

Marfat.com

سے یہ توقع نہ تھی۔ یہ ظلم تو شاید انگریز بھی نہ کرسکتا۔ اسے بھی خیال آ ہی جاتا کہ بہت بدنامی ہوگی مگر مسلم لیگ کی حکومت اپنے عوام کو لا الہ کا مطلب سمجھا رہی تھی۔ قیامت کے دن تھے۔ راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ وقت گزر گیا مگر اس کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

جیل کی مصیبت

بہت سے ساتھیوں میں ایک ساتھی بھی کردار کی کمزوری کا مظاہرہ کرے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ بہادر کافر سے محبت کرتا ہوں مگر بزدل مسلمان سے سخت نفرت ہے۔ اس لیے کہ اسلام بہادروں کا مذہب ہے مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس جامے کو کبھی بزدل بھی پہن لیتے ہیں تو دنیا کو دھوکہ ہوتا ہے۔ ہمارا ایک ساتھی بزدل بھی اور احمق بھی انتہا درجے کا تھا۔ اس نے پہلے تو عقیدے کا چولا بدلا پھر جب اسے معلوم ہوا کہ دوسری بیرکوں میں لوگ رہا کیے جا رہے ہیں تو اس نے ہمارا ساتھ چھوڑنا چاہا مگر یہ سب سراپا محبت تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کے شریک، ہم پر تہمت لگانا بھی مشکل تھا۔ وہ لڑنے جھگڑنے کا موقع تلاش کرتا رہا مگر جب اسے کوئی موقع میسر نہ آیا تو اسے معافی والے وارڈ میں پہنچنے کی بڑی اچھوتی ترکیب سوجھی۔ کہنے لگا ہم یہاں ایک کلاس میں ہیں اور جو رضا کار باہر سے آ رہے ہیں۔ وہ بیچارے سی کلاس میں ہیں۔ یہ بات مجھے بھلی معلوم نہیں ہوتی اگر آپ اس وارڈ سے سی کلاس وارڈ میں نہیں جا سکتے تو مجھے اجازت دیجیے کہ میں وہاں چلا جاؤں میرا ضمیر بوجھ محسوس کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم اس دلچسپ اور عجیب وغریب ساتھی کے حالات سے واقف نہ ہوتے تو اس ظالم نے ہمارا پٹڑا کر دیا تھا۔ بڑا عجیب داؤ، مارا۔ ہم نے اسے کہا کہ ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ میں جانا قیدیوں کے اختیار کی بات نہیں ہے۔ سی کلاس تو یہاں بیٹھے بیٹھے بھی قبول کی جا سکتی ہے۔ ہمارے اس جواب سے اس بیچارے کا بنا بنایا قلعہ مسمار ہو گیا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا مگر دو دن بعد اس نے ہم سے خواہ مخواہ اُلجھنا شروع کیا اور یہ کوشش کی کہ افسرانِ جیل سے بالا بالا گفتگو کر کے باہر کھسک جائے۔ تحفظِ ختمِ نبوت کی ہوا اور اس کے اثرات پھیل چکے تھے۔ شمسی صاحب بڑے خوبیوں کے نوجوان ہیں وہ بیگانوں کو اپنا بنانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ افسران جیل کو شمسی صاحب نے بہت جلد بے تکلف دوست بنا لیا تھا۔ افسران نے شمسی صاحب سے کہا کہ اپنے ساتھی کو سنبھالو۔ یہ ناک رگڑنے پر آمادہ ہے۔ شمسی صاحب نے افسران جیل کے سامنے حقیقت بیان کر دی کہ یہ شخص ریل پیل میں اندر چلا آیا اور ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ساتھ نتھی ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے اسے جس قدر جلدی ہو سکے، چلتا کرو۔ یہ ایک مستقل لعنت ہے مگر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت بھی اس مرد عجیب وغریب سے دل لگی کر رہی تھی۔ معافی

Marfat.com

نامے پر معافی نامہ چلا آ رہا ہے اور حکومت انہیں قائل کرتی جا رہی ہے۔ ہمیں ابتداء میں جو کوفت تھی وہ بتدریج کم ہوتی گئی اور ہم نے سمجھ لیا کہ خوبصورت مکان پر حکومت کی جانب سے کالی ہنڈیا لٹکا دی گئی ہے۔ تا کہ مکان نظر بد سے بچا رہے۔ تاہم یہ شخص ہم میں بالکل بیگانہ تھا۔

صبر واستقامت کا پہاڑ

حضرت مولانا ابوالحسنات مدظلہ پہلی بار جیل گئے تھے۔ ہمارے لیے تو جیل نئی بات نہ تھی مگر حضرت مولانا ایسا نازک اور نفیس مزاج بزرگ جسے لوگ دیکھنے کو ترستے رہے جن کے معتقدین کا ان کے مکان پر تانتا بندھا رہے۔ جدھر آنکھ اٹھے لوگ عقیدت سے جھک جائیں پہلی بار پکڑے گئے اور سنگ آمد وسخت آمد کے مصداق قید بھی ایسی جس کی معیاد کی کچھ خبر نہیں۔ اس پر ستم یہ کہ مولانا ابوالحسنات کا ایک ہی بیٹا جسے والدہ کی محبت بھری گود بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئی۔ جسے حضرت مولانا نے بڑے لاڈ اور پیار سے خود ہی پالا پوسا، اس جان سے پیارے لخت جگر اور اکلوتے جوان بیٹے کا کچھ پتہ نہیں کہ شہید ہو گیا یا پکڑا گیا تو قید کتنی ہوئی۔ مولانا موصوف کے سوا ہم سب نے سرگوشیوں میں مولانا کے صاحبزادے خلیل احمد قادری صاحب کا تذکرہ کیا اور بار بار آپس میں باتیں کیں کہ اگر خلیل احمد شہید ہو گئے یا لمبی قید میں چلے گئے تو مولانا کا کیا حال ہوگا؟ بیچارے پہلی بار جیل آئے، ان کی آزماش بھی ایسی سخت ہوئی کہ جسے معمولی انسان برداشت نہ کر سکے مگر ہم سب کو حیرت ہوئی کہ مولانا کی پیشانی پر بَل تک نہ آیا۔ مولانا نے کبھی ذکر تک نہ کیا۔ گھر سے کوئی اطلاع بھی نہ آئی۔ کچھ معلوم نہیں کہ خلیل احمد پر کیا گزری، خلیل زندہ بھی ہے یا نہیں مگر مولانا ابوالحسنات نہ گھبراتے ہیں، نہ الگ بیٹھ کر آنسو بہاتے ہیں اور نہ ان کی زبان پر خلیل احمد صاحب کا تذکرہ آتا ہے۔ ہم سب اس صورت حال کو دیکھ کر حیران تھے۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری نے بارہا فرمایا کہ اگر میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا مگر بھئی مولانا ابوالحسنات صاحب تو بڑی کوہ وقار شخصیت ثابت ہوئے۔ مولانا ہم میں بیٹھ کر خوش گپیاں اڑاتے یا الگ بیٹھ کر تسبیح اور وظائف میں مصروف رہتے۔ اللہ جسے حوصلہ اور صبر عطا کرے۔ جیل خانہ فخر وغرور کا مقام نہیں۔ یہاں بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔ مولانا اکثر فرمایا کرتے کہ جس کے نام پر آج تک روٹیاں توڑتے رہے اس کے نام کی لاج رکھنے کا وقت آیا تو اب گھبرانا کیسا۔ نمک حرامی تو نہ ہونی چاہیے اللہ اللہ کس جرأت اور حوصلے کے علماء آج بھی موجود ہیں۔ ہم نے حضرت مولانا کو صبر واستقامت کا پہاڑ اور شرافت وخلق کا بہترین نمونہ پایا۔ مولانا موصوف بڑے ہی صاف دل انسان ہیں۔ قریب ہونے

Marfat.com

سے آدمی کے جوہر کھلتے ہیں۔ ورنہ دوررہ کبرا کثر دھوکا ہوتا ہے۔ ایک روز ہم سب نے مشورہ کیا کہ ہم مولانا کو خلیل صاحب کے بارے میں صاف صاف بتادیں کہ وہ آزمائش میں مبتلا ہیں۔ ابھی تو معتبر اطلاع نہیں ہے۔ خدا کرے کہ وہ زندہ ہوں۔ اس طرح کی گفتگو کر کے حوصلہ دلائیں۔ موت کا وقت تو مقرر ہے۔ جسے مرنا ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا، وغیرہ وغیرہ۔ ان خیالات کو لیے ہوئے ہم مولانا کی کوٹھڑی میں جا دھمکے اور باتوں باتوں میں لاہور کا ذکر کیا۔ پھر خلیل صاحب کا تذکرہ آیا تو سوچی سمجھی سکیم کے مطابق جب ہم سب تسلی بخش الفاظ استعمال کر چکے تو مولانا موصوف نے نہایت آرام سے فرمایا کہ بھئی ٹھیک ہے، خلیل میرا اکلوتا بیٹا ہے اور مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے۔ اس لیے کہ میں اس کا باپ ہوں اور میں نے ماں بن کر اسے پالا ہے۔ یوں بھی اولاد سے کسے محبت نہیں ہوتی مگر اس مقام پر میرے سوا اور ہو بھی کون سکتا ہے۔ پھر اس نیک کام میں اگر خلیل قربان بھی ہوتا ہے تو سعادت دارین ہے۔ وہ بھی تو ماؤں کے لخت جگر تھے جو سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لیے شہید ہوئے۔ اُن میں خلیل بھی ہے تو میرے لیے فخر کی بات ہے۔ اللہ ہماری حقیر قربانی کو قبول فرمائے۔ مولانا کا صبر اور بے نظیر حوصلہ واستقامت دیکھ کر ہمارے حوصلے دگنے ہو گئے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس روز کے بعد ہم مولانا کی بے حد عزت کرنے لگے۔ ہمارے دوسرے بزرگ اور رفیق تو بارہا جیل بھگتے ہوئے تھے۔ انہیں تو اس قید و بند کو خندہ پیشانی سے کاٹ ہی لینا تھا مگر مولانا جن کی پہلی آزمائش تھی اگر گھبراتے یا پریشانی کا اظہار کرتے تو یہ فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ مولانا کے دل میں دوہرا جذبہ تھا۔ وہ عالم دین بھی تھے اور سید زادے بھی تھے۔ آقائے نامدار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک مخلص عالم دین کے فرائض بھی سامنے تھے اور یہ بات بھی تھی کہ ان کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو خطرے میں تھی۔ یہ دوہرا جذبہ کارفرما تھا کہ مولانا ابوالحسنات آخر دم تک صحیح مقام پر ڈٹے رہے اور ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئی۔ اللہ جسے توفیق دے۔

انتقام

لاہور میں گولی چلی، خون خرابہ ہوا، جو نہ ہونا تھا، وہ ہو چکا تو مرکز نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ہم بے بس لوگوں کو نشانۂ ستم بنانے کی ٹھان لی۔ ہمیں جیل میں ٹھونس کر مرکزی وزارت جس پر ظفر اللہ خان چھائے ہوئے تھے۔ دانت پیسنے لگی وہ ہمیں زندہ دیکھنا نہ چاہتی تھی جو گولی لاہور میں چلی، اسے تشنہ سمجھا گیا۔ اس لیے کہ ہم ابھی زندہ تھے اور یہ ظالم محسوس کرتے تھے کہ اگر یہ لوگ کبھی زندہ باہر آ گئے تو عوام کو خونی قاتلوں کی نشاندہی کریں گے۔ اس طرح زندگی اُن کی اجیرن ہو جائے گی۔ اس بارے میں مرکز نے مشورہ کیا کہ مجلسِ

Marfat.com

عمل کے رہنماؤں کو ایسی موت مارا جائے کہ اپنے دامن پر داغ بھی نہ آئے اور قضیہ بھی پاک ہو جائے چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ہمیں ایک ایک کر کے سندھ کی دُور افتادہ دیہاتی حوالاتوں میں بند کر دیا جائے، جب انسان کے دماغ میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو جائے تو عقل وخرد انصاف اور خدا کے خوف کے خانے بند ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نظر بندوں کو جیل ہی میں نظر بند رکھا جا سکتا ہے۔ انہیں پولیس کے تھانوں کی حوالاتوں میں بند کرنا قانون کی منشا کے خلاف تھا مگر شہر لاہور میں جو کچھ ہوا، یہ کیا قانون اور حق وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا یا صریح ظلم تھا؟ خود ہی حاکم، خود ہی باز پرس کرنے والے، تب کسی کا کیا ڈر، باقی تھا کہ قانون کی عظمت کا خیال رکھا جاتا۔ ہم بالکل بے خبر تھے، کراچی جیل میں ہم اکٹھے تھے اور سمجھتے تھے کہ نظر بندی کا ایک ایک سال ہمیں اسی جیل میں گزارنا ہے۔ اس لیے سپرنٹنڈنٹ تشریف لائے تو ہم نے ان سے عرض کیا کہ ایک بیت الخلاء ناکافی ہے اور اس بیت الخلاء کی ساخت بھی نہایت نامعقول ہے۔ اس میں پردہ نہیں ہے۔ ہم مولوی لوگ اس بے پردہ خانے میں تکلیف اور دقت محسوس کرتے ہیں۔ ایک بیت الخلاء اور بنوا دیجیے بات معقول تھی۔ صاحب مان گئے بیت الخلاء بن گیا۔ دوسرے بیت الخلاء کو درست کیا جا رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کچھ پریشانی کے عالم میں تشریف لائے اور مولانا بدایونی کو الگ لے گئے اور سرگوشیوں میں ان سے کچھ فرما کر واپس تشریف لے گئے۔ مولانا بدایونی صاحب نے ہم سب کو بلا کر بتایا کہ لو بھئی ہم سب کا کھیل خراب ہونے والا ہے۔ حکومت بدلہ لینے پر اتر آئی ہے۔ ہمیں سندھ کی دیہاتی حوالاتوں میں بند کیا جائے گا اور قید تنہائی میں رکھا جائے گا۔ ہم سے بدسلوکی بھی ہوگی۔ ہم سب نے اس خبر کو کسی قدر فکرمندی سے سنا، جیل میں اصل تکلیف ساتھیوں سے علیحدگی اور قید تنہائی ہوتی ہے۔ کھانے پینے کی کوئی بات نہیں۔ بہرحال ہم متفکر ضرور ہوئے مگر جیل کی زندگی تو بے بسی کی زندگی ہوتی ہے۔ صبر کے سوا کیا چارہ۔ دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ صاحب پھر تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ میں نے آپ کو اے کلاس دے رکھی تھی۔ اپنے اختیارات سے، میں جانتا تھا کہ آپ حضرات معزز قیدی ہیں اور اے کلاس کے مستحق ہیں مگر اب میرے یہ اختیارات ختم ہو رہے ہیں۔ آپ اپنی کلاس کے لیے درخواست کیجیے۔ ہم سب نے انکار کیا تو وہ واپس چلے گئے۔

شام کو ہم نے میٹنگ کی اور دیہاتی حوالاتوں کے تذکرے کے بعد سوچنا شروع کیا کہ اگر ہم کو الگ الگ کر دیا گیا تو اے کلاس ہی انتقامی کارروائی کے راستے میں رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ اس لیے درخواستیں حکومت کو بھیج دینا ہی مناسب ہوگا۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب نے انکار کر دیا کہ مجھے کوئی درخواست نہیں کرنا ہے۔ اس حکومت نے ہمیں گرفتار ہی اس لیے کیا ہے کہ ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ تب آپ کلاسوں کے بارے میں کیوں درخواست کرتے ہیں۔ اس بات کا

Marfat.com

فیصلہ دوسرے دن پر چھوڑ دیا گیا۔ تیسرے دن سپرنٹنڈنٹ صاحب پھر تشریف لائے جیل افسر قیدیوں کو بتایا نہیں کرتے کہ ان کی تبدیلی ہورہی ہے۔ اس خبر کو راز میں رکھا جاتا ہے۔ آخری دن بھی قیدی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کہاں لے جایا جارہا ہے مگر یہ سپرنٹنڈنٹ پہلا آدمی تھا اس نے ہمیں قبل از وقت خبردار کیا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ حکومت سے مصالحت کی بات کرلو تو اچھا ہے۔ اس گفتگو میں کچھ تیزی بھی ہوگئی۔ حکومت سے مصالحت کا لفظ سننا بھی ہم کو گوارا نہ تھا، جس حکومت کی آستینوں سے بے گناہ مسلمانوں کا خون ٹپک رہا ہو۔ ہم اس سے کس طرح مصالحانہ گفتگو کرسکتے تھے؟

ذلیل قسم کا انتقام

اب کراچی جیل ہمارے لیے ریلوے پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہمارا حال ان مسافروں کا تھا جو گاڑی کے انتظار میں بیٹھے ہوں۔ ہم پر دوطرح کی اداسی تھی۔ سب سے زیادہ لاہور میں گولی چلنے کا غم اور دوسری چند ساتھیوں کا ایک دوسرے سے جدا ہوجانا۔ ہم نے افسران جیل سے کرید کرید کر جاننا چاہا کہ ہمیں کدھر بھیجا جائے گا، مگر کچھ معلوم نہ ہوسکا، کیونکہ جیل والے خود بھی نہیں جانتے تھے کہ بے کس قیدیوں کا ٹھکانہ کہاں بننے والا ہے؟ جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، شمسی صاحب بڑے جوڑتوڑ کے نوجوان ہیں۔ وہ برابر جستجو میں لگے رہے کہ حکومت ہم کو کہاں بھیج کر انتقام کی پیاس بجھانا چاہتی ہے مگر وہ بھی ناکام ہوئے۔ البتہ یہ ہوا کہ شمسی صاحب نے کراچی کے ایک ایسے رہنما سے نامہ و پیام کیا۔ جسے حکومت بہت اچھی نظروں سے دیکھتی تھی۔ شمسی صاحب اور میں ایک کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ وہ مجھ سے بہت مانوس تھے۔ اس لیے شمسی صاحب نے ایک ٹھوکر کھائی اور باہر کہلا بھیجا کہ اگر ہم کو باہر بھیجنا ہے اور دو دو تین تین کی ٹولیوں میں بھیجنا ہے تو مجھے ماسٹر صاحب کے ہمراہ رکھنے کی کوشش کیجیے۔ یہی شمسی صاحب کی غلطی تھی۔ منتقم حاکموں کو خبردار کرنا کہ کون کون کس کے ساتھ رہ کر خوش ہے، آبیل مجھے مار کے مترادف تھا چنانچہ اس خواہش کا اُلٹا اثر ہوا۔

کراچی جیل سے روانگی

ایک دن ہم آپس میں گھل مل کر بیٹھے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ افسران جیل اور وارڈر قطار اندر قطار تشریف لے آئے اور فرمایا بستر باندھ لیجیے، باہر لاریاں آچکی ہیں۔ پولیس گارڈ بھی آگئی ہے۔ اب دیر نہ کیجیے۔ ہم نے دریافت کیا کہ آیا ہم سب جو اِس وارڈ میں موجود ہیں، سب کے سب جارہے ہیں؟ حکم ہوا نہیں وہ آدمی جو کراچی سے بعد میں گرفتار ہو کے آئے ہیں، یعنی مولانا

Marfat.com

مہر الٰہی، سید محمد میاں سجادہ نشین داتا گنج بخشؒ اور مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب یہیں رہیں گے۔ باقی سب بستر باندھ لیں۔ ہم نے جلدی جلدی بستر باندھ لیے۔ کھانے پینے کا سامان اپنے مشقتیوں کی جھولی میں ڈال دیا اور تیار ہو کر نماز ظہر کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم اپنے ان تین ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ جنہیں ہم کراچی جیل میں چھوڑ کر آگے جا رہے تھے۔ تینوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم نے کلیجے پر پتھر رکھا۔ ان سے جُدا ہوئے اور پھاٹک پر پہنچ گئے۔ اس وقت تک کچھ معلوم نہ تھا کہ ہم کو تقدیر کدھر لے جا رہی ہے۔ شمسی کو خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ ہوں گے مگر یہی شمسی کی بھول تھی اور مجھے یقین تھا کہ شمسی صاحب کو اب میرے ہمراہ ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ اس سے اُلٹ ہوگا، چنانچہ ہماری روانگی کے وارنٹ پولیس افسر کے حوالے کر دیئے گئے۔ پھاٹک کھلا تو ہم سب کو ایک ہی لاری میں سوار کرا دیا گیا۔ جیل کے شریف افسر ہمیں پھاٹک تک چھوڑنے آئے۔ لاری نے کراچی سے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اب ہمارے لیے یہ دریافت کر لینا بہت آسان تھا کہ کون کدھر جا رہا ہے۔ خیال تھا کہ ہر دیہاتی تھانے پر سوداگروں کے مال کی طرح ایک ایک یا دو دو نظر بندوں کو اتار دیا جائے گا۔ اس طرح حکومتِ وقت تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے خادموں سے انتقام لے گی مگر پولیس افسر نے بتایا کہ تین کے سوا باقی سب سکھر جیل میں بھیجے جا رہے ہیں۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ میرا نامہ اعمال بھی بڑا زریں ہے۔ شاید مجھے اپنے دیرینہ رفقاء سے الگ کیا جائے گا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میں حیدر آباد سنٹرل جیل میں رکھا جاؤں گا۔ میرے ہمراہ مولانا لال حسین اختر اور نیاز لدھیانوی بھی حیدر آباد ہی میں رکھے جائیں گے۔ باقی حضرات یعنی حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب صدر مجلسِ عمل، حضرت مولانا بدایونی، حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری، سید مظفر علی شاہ صاحب شمسی، صاحبزادہ فیض الحسن شاہ صاحب، عبدالرحیم صاحب جوہر جہلمی اور اللہ نواز صاحب مدیر ''حکومت'' ان سات حضرات کو مجھ سے الگ کر لیا گیا۔ میں لاری میں مولانا ابوالحسنات صاحب سے دور بیٹھا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی ماسٹر جی ادھر آ جاؤ اب ہم اکٹھے ہی رہیں گے میں اٹھ کر مولانا کے قریب جا بیٹھا دو روز پہلے مجھے ہلکا ہلکا بخار ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مولانا غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میں ان کے ہمراہ رکھا جا رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ حضرت مولانا مجھ سے محبت فرماتے ہیں۔ اب اگر میں ان سے یہ عرض کروں کہ میں آپ سے الگ کیا جا رہا ہوں تو مولانا کو صدمہ ہوگا مگر میں اس حقیقت کو کتنی دیر چھپا سکتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں مَیں نے جب ان سے عرض کیا کہ مجھے حیدر آباد سنٹرل جیل میں بھیجا جا رہا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ یہ تو بڑی گڑبڑ ہوئی۔ کم بختوں نے

Marfat.com

جیل میں بھی اکٹھے رہنے نہیں دیا۔ بڑے گھٹیا قسم کے لوگ ہیں۔ بھلا اس سے کیا ہوتا ہے؟ تھوڑا سا ضد مہ اور سہی۔ بہر حال اس کے بعد لاری فراٹے بھرتی ہوئی حیدر آباد کی جانب اڑی چلی جا رہی تھی اور ہم آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے اور حسرت سے ایک دوسرے کو دیکھ بھی رہے تھے۔ عصر کی نماز کے لیے ایک پتھریلے میدان میں لاری کھڑی ہوئی۔ پاس ہی پانی موجود تھا۔ وضو کیا اور نماز ادا کی لاری پھر چل پڑی، ہمیں نماز مغرب بھی راستے ہی میں ادا کرنا پڑی۔ ہالہ میں کچھ دیر کے لیے ٹھہرنے کی مہلت ملی۔ پولیس افسر نے ہالہ کے ایک دوکاندار کو چائے بنانے کا حکم دیا اور چائے وغیرہ کا بل بھی اپنے پاس سے ادا کیا۔ یہ ادائیگی اس سفر خرچ کی رقم میں سے تھی جو پولیس افسر کی تحویل میں تھا۔ تاہم افسر مذکور بہت خلیق اور اچھے مسلمان تھے اور ہم سے محبت کا سلوک کر رہے تھے۔ یہی افسر کراچی میں ان لاریوں پر ڈیوٹی دیتے رہے جو کراچی کے رضا کاروں کو لاری میں بھر بھر کر دور دراز کے علاقوں میں چھوڑ کر آتے تھے۔ پولیس افسر پر تحریک میں شامل ہونے والے دس بارہ سال کی عمر کے ایک بچے کے پاکیزہ جذبات کا بڑا گہرا اثر تھا۔ اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے پولیس افسر نے بتایا کہ جب ہم رضا کاروں کو آٹھ دس میل کے فاصلے پر اُتار رہے تھے تو ان میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ وہ آخر دم تک ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا جب رضا کاروں کو اتار کر لاری واپس ہونے لگی تو افسر مذکور جو خود بھی صاحبِ اولاد تھا۔ بچے کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ آؤ بیٹا تم لاری میں سوار ہو جاؤ۔ بچے نے جواب دیا وہ کیوں؟ افسر نے جواب دیا تم بچے ہو اتنا لمبا سفر بھوک پیاس میں کیسے کر سکو گے۔ تھک جاؤ گے۔ آؤ ہم تمہیں شہر میں اتار دیں گے۔ بچے نے بڑی جرأت سے کہا کہ ہمارے بڑے بھی تو اتنا لمبا سفر کسی طرح طے کریں گے۔ مَیں تو قید ہونے کے لیے آیا تھا۔ میری اماں نے مجھے اجازت دی کہ جاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر مسلمان قربان ہو رہے ہیں۔ تم بھی جاؤ میں تو اماں کی اجازت سے آیا ہوں مگر تم ہمیں قید ہونے نہیں دیتے۔ شہر سے باہر چھوڑ کر جا رہے ہو۔ بچے نے بات ختم ہوتے ہی پھر نعرہ لگایا۔ پولیس افسر نے لاری ڈرائیور کو کہا چلو بھئی یہ بچہ نہیں مانتا۔ ابھی لاری چالیس پچاس گز چلی ہو گی کہ پولیس افسر کو پھر خیال آیا کہ معصوم بچہ اتنا طویل سفر کیسے کر سکے گا؟ انسانی ہمدردی، اسلامی ہمدردی یا پدرانہ شفقت کے جذبات نے پھر مجبور کیا۔ پولیس افسر نے لاری رکوا دی اور پیدل واپس آ کر بچے سے پھر کہا کہ آؤ بیٹا ضد نہیں کیا کرتے۔ ساتھی رضا کاروں نے بھی بچے کو سمجھایا کہ بیٹا تم واپس چلے جاؤ۔ ہم تو تمہیں شہر ہی میں منع کرتے تھے مگر تم اُچھل کر لاری میں سوار ہو گئے تھے اب تم واپس چلے جاؤ۔ بچہ بگڑ کر بولا، واہ صاحب، آپ زیادہ ایماندار ہیں اور مجھے آپ کمزور سمجھتے ہیں؟ بہر حال وہ بچہ

Marfat.com

نہیں مانا اس واقعہ کا پولیس افسر کے دل پر اب تک اثر موجود تھا۔ دن کی روشنی رات کی آغوش میں گم ہو گئی اور ہم عشاء کے وقت حیدر آباد کے قریب پہنچے تو پولیس افسر نے کہا میں بلاوجہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کروں گا رات کے وقت آپ کو جیل میں کون کھانا دے گا۔ میں آپ کو جیل کے باہر محفوظ جگہ میں بٹھا کر کھانا کھلاتا ہوں اور پھر جیل کے حکام سے بات کرتا ہوں۔ راستے میں صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب کی طبیعت خراب ہوئی۔ انہیں لاری ہی میں قے ہوئی۔ باہر نکلے تو ہلکا سا بخار بھی ہو گیا۔ پولیس افسر نے بازار سے کھانا منگوایا۔ پھر جیل افسران سے بات کی۔ ڈاکٹر کو بلایا، تاکہ صاحبزادہ صاحب کے لیے دوائی کا بندوبست کریں۔ ہم جیل کی بیرکوں کے سامنے کھلے میدان میں کھانے اور نماز سے فارغ ہوئے تو ڈاکٹر نے کہا مریض رات کے سفر کے قابل نہیں ہے۔ ان کو ہسپتال میں ٹھہرنا ہو گا یا جیل کی کوٹھڑی میں۔ صبح کو مریض سفر کے قابل ہو جائے گا۔ پولیس افسر نے کہا کہ میں ایک کو چھوڑ کر باقیوں کو نہیں لے جا سکتا۔ باقی نظر بندوں کو بھی جیل ہی میں ٹھہرائیے۔ تاکہ صبح سب کو اپنے ہمراہ لے جا کر سکھر جیل میں چھوڑ آؤں۔ تین نظر بند یعنی میں (تاج الدین انصاری) مولانا لال حسین اختر صاحب اور نیاز لدھیانوی حیدر آباد جیل میں ٹھہریں گے۔ فیصلہ ہوا کہ ہم سب کو حیدر آباد جیل میں رات گزارنا ہو گی۔ میں خوش ہوا کہ ایک رات اور اکٹھے رہ کر گزارنے کا موقع میسر آ گیا چنانچہ رات کے تقریباً دس بجے ہم سب حیدر آباد سنٹرل جیل میں داخل ہو گئے۔

میری صحت تین چار روز پہلے سے خراب تھی۔ سفر نے اور زیادہ مضمحل کر دیا۔ جونہی ہمیں ایک وارڈ میں پہنچایا گیا۔ وارڈر چابیاں لے کر آ گیا اور ہمیں کوٹھڑیوں میں بند کر کے تالے ڈال دیئے گئے۔ سوتے جاگتے رات کٹ گئی۔ صبح ہوئی کوٹھڑیاں کھلیں تو حکم ہوا کہ سکھر جانے والے سات نظر بند اپنے اسباب سنبھال لیں۔ باہر پولیس کی لاری آ گئی ہے۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ نماز ادا کی اور ہماری عارضی جدائی کا تکلیف دہ وقت قریب آ گیا۔ ہم سب بناوٹی مسکراہٹیں تلاش کرنے کی ناکام کوشش میں تھے مگر جب دل پژمردہ ہوں تو بناوٹ سے بھی کام نہیں چلتا۔ ہم ایک دوسرے کی کیفیت کنکھیوں سے بھانپ رہے تھے۔ مولانا ابوالحسنات اور دیگر حضرات ہم سے بغلگیر ہوئے، شمسی صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جسے وہ پی نہ سکے۔ آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے شمسی کے رخساروں پر سے ڈھلکنے لگے۔ بہرحال اسے صدمہ تھا مگر وہ زیادہ ساتھیوں کے ہمراہ جا رہا تھا۔ میں نے شمسی کو تسلی دی۔ وہ مولانا لال حسین صاحب اختر اور نیاز صاحب سے بغلگیر ہوتے رہے کہ ٹھنڈا سانس لے کر حضرت شاہ جی بھی اپنی جگہ سے اٹھے مگر نہایت ہی غمگین۔ حضرت شاہ جی ہمارے بہادر سردار، ہمارے مدتوں کے رفیق اور

Marfat.com

لمگسار جونہی وہ میرے قریب آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ یا تو میرے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں یا حضرت شاہ صاحب کے۔ ایسے مواقع پر شاہ صاحب بڑے حوصلے اور بردباری سے کام لے کر خود کو سنبھال لیا کرتے تھے چنانچہ میرے قریب آنے سے پہلے فرمانے لگے۔ اوہو تمہارے لیے دو ایک پان تو لگا دوں۔ پریشانی میں یہ ضروری کام بھی بھول گیا۔ دیکھا، حضرت شاہ صاحب نے کیسے خود کو سنبھالا اور مجھے کتنا خوبصورت سہارا دیا۔ وہ پان بھی لگا رہے تھے اور کچھ فرماتے بھی جاتے تھے۔ غرض یہ کہ میں نے پان وصول کرتے ہی معانقہ کیا فی امان اللہ، فی امان اللہ کی صدا بلند ہوئی اور ہمارا کارواں دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا جب ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور یہ سب حضرات حیدرآباد سنٹرل جیل سے باہر جانے لگے تو ہمیں ایسے محسوس ہوا جیسے دل پر آرے چل رہے ہوں۔ اسی کا نام تو جیل ہے۔ اسی مجبوری اور بے بسی کو قید کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجھے اس روز بخار تو تھا ہی، اختلاج کا ہلکا سا دورہ بھی پڑا۔ میں نے اپنے دونوں رفیقوں سے کہا کہ آج آپ حضرات میرے ہمراہ ہی کوٹھڑی میں رات کے وقت بند ہونے پر رضامند ہوں تو میں جیل افسران سے ایک جگہ بند ہونے کے لیے کہوں؟ میرے ہمدردی اور شریف ساتھی بخوشی راضی ہو گئے۔ رات کے وقت مجھے تکلیف بڑھ گئی۔ نیاز صاحب میرے ہاتھ پاؤں دباتے رہے مگر مجھے نیند نہ آئی۔ نیاز لدھیانوی میرا ہم وطن ہونے کے علاوہ میرا پیر بھائی بھی ہے۔ وہ میری خدمت کرتا رہا۔ مولانا لال حسین اختر بار بار کہتے تھے کہ میں بھی ہاتھ پیر دباؤں مگر میں نے ہر بار انکار کیا میرے دل میں مولانا لال حسین اختر کا بے حد احترام ہے۔ وہ عالم دین ہونے کے علاوہ زبردست مناظر ہیں۔ میرے ایسے گنہگار انسان کے لیے یہ کس طرح مناسب تھا کہ میں مولانا کو ایسی خدمت کی اجازت دیتا۔ نیاز سو گیا، مَیں جاگتا رہا، جوں توں کر کے رات گزر گئی۔ صبح ہوئی تو اسی احاطے کے بی کلاس قیدیوں نے ہمیں چائے کی دعوت دی۔ دوہاری لیڈر اسی احاطے میں قید کاٹ رہے تھے۔ کچھ دیر چائے کے بعد ان سے گپ شپ ہوتی رہی۔ تیسرے دن اس احاطے کا پہرہ سخت ہو گیا۔ نہ کسی کو باہر جانے کی اجازت تھی اور نہ کوئی بیرکوں میں گھوم پھر سکتا تھا۔ ایک وارڈر اندر تعینات ہو گیا اور دوسرا دروازہ پر پہرہ دینے لگا۔ نمبرداروں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی۔ بی کلاس کے دوسرے قیدی گھبرا گئے اور اس اچانک تبدیلی پر متفکر ہوئے۔ ان کی آزادی میں بھی خلل پڑ گیا۔ ہم سے مل کر وہ جتنا خوش ہوئے تھے۔ اسی قدر پریشان بھی ہوئے۔ انہیں کسی نمبردار نے بتایا کہ یہ جو تین نظر بند مولوی اس احاطے میں آئے ہیں۔ انہیں بہت خطرناک تصور کیا جاتا ہے۔ ان کو سب سے الگ رکھا جائے گا۔ ان پر نمبردار بھی علیحدہ لگا دیا گیا ہے۔ اسے ہدایت ہے کہ یہ کسی سے ملنے نہ پائیں ہم اس صورت حال سے

Marfat.com

واقف ہونے کے بعد خود ہی محتاط ہو گئے۔ اپنی کوٹھڑی سے پرے جانے کی ہمیں ضرورت بھی کیا تھی۔ دو تین دن بعد ہی نمبردار خبر لایا کہ ہمارے لیے ایک خاص احاطے میں بندوبست ہو رہا ہے۔ ہمیں وہاں منتقل کر دیا جائے گا چنانچہ یہی ہوا شام کے وقت وارڈر نے آ کر اطلاع دی کہ اسباب اکٹھا کر لیجیے۔ آپ کو دوسری وارڈ میں جانا ہے چنانچہ ہمیں جیل کی ڈیوڑھی کے متصل زنانہ وارڈ کے ملحقہ احاطے میں لے جایا گیا۔ یہاں بہت بڑا احاطہ تھا جس کے ایک کونے پر دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ان کوٹھڑیوں کی پشت پر ایک غسل خانہ اور ایک بیت الخلاء بنا ہوا تھا۔ یہاں عام طور پر 302 کی ملزم عورتوں کو رکھا جاتا تھا۔ آڑے وقت میں مرد بھی انہی کوٹھڑیوں میں بند کر دیئے جاتے تھے۔ بہر حال ہم اس نئے گھر میں آباد ہو گئے۔ یہاں آنے سے پیشتر ہمیں معلوم ہوا کہ اسلامی ملک کی خالص مسلمان سرکار نے ہمیں اے یا بی کلاس کی بجائے سی کلاس میں رکھنے کا حکم صادر فرما دیا ہے۔ قہر درویش بر جان درویش۔ میں اور نیاز ایک کوٹھڑی میں بند ہو گئے اور مولانا لال حسین اختر صاحب ساتھ والی کوٹھڑی میں ڈیرہ جما کر بیٹھ گئے۔ صوبہ سندھ میں نظر بندوں کو خواہ وہ اعلیٰ کلاس میں ہوں یا ادنیٰ میں پلنگ ضرور ملتا ہے۔ ہمیں بھی تین پلنگ مل گئے۔ گویا ہم عام قیدیوں کا کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹنے کے حقدار تھے، میری صحت گرنا شروع ہوئی۔ ڈاکٹر بیچارہ آتا اور دیکھ کر چلا جاتا۔ ہم تین نظر بندوں پر سات پہرہ دار تھے۔ تین دن کے لیے، تین رات کے وقت اور ان پر ایک جمعدار بھی تھا۔ اس علاقے میں گیہوں کی بجائے سی کلاس کے قیدیوں کو چاول کی روٹی ملتی ہے۔ سالن بھی ماشاء اللہ قابل دید سالن ہوتا ہے۔ چاول کی روٹی کو سیدھا کھڑا کر کے آپ اس پر اگر چھوٹے بچے کو کھڑا کر دیں تو وہ خم نہیں کھاتی۔ مغرور افسر کی گردن معلوم ہوتی ہے۔ میرے دانتوں میں تکلیف ہو گئی۔ مجھ سے یہ روٹی توڑی نہ جاتی تھی۔ تھوڑی بہت زہر مار کر لیتا تھا۔ بھوک کو سہارا دینے کے لیے دال پی لیتا تھا یا سبزی دھو کر کھا لیتا تھا۔ دھوئے بغیر اس سبزی کا کھانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ صحت اور زیادہ گر گئی۔ میرے رفیقوں نے اس صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے میرے لیے دودھ لگا دیا۔ مجھے دودھ پینے کی عادت نہ تھی۔ میں چائے اور پان کا عادی تھا مگر یہاں آ کر مزاج درست ہو گئے اور میں سب کچھ بھول گیا۔ یوں بھی اللہ کا مجھ پر کرم ہے۔ طبیعت پر قابو ہے۔ طبیعت میں محتاجگی نہیں۔ وقت گزرتا گیا۔ حکومت کی بدسلوکی نے ارادے میں اور پختگی پیدا کر دی۔ برطانوی دور میں بارہا قید کاٹی ہے مگر ہم سے یہ سلوک انگریز نے بھی نہیں کیا۔ قانون کے مطابق پکڑا۔ ضابطہ کے مطابق سزا دے کر شریفوں کی طرح برتاؤ کیا مگر صاحب کافر اور آج کے مسلمان میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے چنانچہ یہ فرق ہم نے محسوس کر لیا اور بہت اچھی طرح

Marfat.com

محسوس کرلیا کہ یہ لوگ جو اسلام، اسلام پکارتے ہیں۔ان کا اسلام سے کتنا تعلق ہے؟

بھوپت ڈاکو

ایک روز صبح سویرے جب ہمارے پہرہ دار بدل گئے اور نئے وارڈر آئے تو تھوڑی دیر بعد جب میں بیت الخلاء میں تھا باہر کچھ اجنبی آوازیں سنائی دیں۔ میں فارغ ہوکر باہر آیا تو دیکھا کہ ایک داڑھی والا نوجوان حوالاتی دو سپاہیوں کے ہمراہ میری کوٹھڑی کے باہر کھڑا ہے۔ نیاز اور مولانا کچھ فاصلے پر کھڑے ہیں۔ میں نے اس نوجوان کو دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اسے کہیں ایک آدھ مرتبہ دیکھا ہے مگر حافظے نے کچھ کام نہ دیا۔ جیل کے سپاہی اس نوجوان کو ڈیوڑھی سے لائے تھے۔ ہماری وارڈ میں اسے رفع حاجت اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ فارغ ہوکر واپس جانے لگا تو میں نے اپنے رفیقوں سے دریافت کیا کہ یہ شخص کون ہے؟ ایک نے کہا مولوی صاحب ڈیوڑھی پر لوگ کہتے تھے کہ بہت مشہور ڈاکو ہے۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ بھوپت ہے۔ ابھی وہ ہم سے زیادہ دور نہ گیا تھا۔ میں نے بے تکلفی سے اس کی جانب دیکھ کر کہا ارے بھئی ٹھاکر یہیں آ جاؤ نا۔ وہ مسکرا کر سپاہیوں کے ہمراہ چلا گیا۔ کچھ دن پہلے بھوپت کی فوٹو ڈان میں چھپی تھی اور اس کی گرفتاری کا ذکر بھی تھا۔ بہرحال وہ چلا گیا اور شام کو معلوم ہوا کہ اسے جیل کے درمیانی حصے میں نہایت احتیاط اور زبردست پہرے میں رکھا گیا ہے۔ حیدرآباد سنٹرل جیل ان دنوں خطرناک لوگوں کا سنٹر تھا یعنی اسی جیل میں ہم سے کچھ فاصلے پر ایک بیرک میں فوجی جرنیل بھی بند تھے یعنی راولپنڈی سازش کیس کے تمام ملزم اسی جیل میں تھے۔ ان پر بہت کڑا پہرہ تھا۔

انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کی تشریف آوری۔

جیل میں ڈپٹی کمشنر یا سیشن جج آ جائے تو جیل والے اٹینشن ہو جاتے ہیں مگر جب انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات دورے پر تشریف لائے تو قیدیوں، نمبرداروں، وارڈروں اور افسرانِ جیل میں اچھی خاصی بھاگڑ مچ جاتی ہے۔ قیدی خوش ہوتے ہیں کہ اب قید میں رعایت اور رہائی ملے گی۔ البتہ جیل والوں کو مصیبت کا سامنا ہوتا ہے، باورچی خانے سے لے کر بیت الخلاء تک کی صفائی کا اہتمام ہوتا ہے۔ نمبرداروں اور قیدیوں کو اُجلے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ وارڈر اپنی وردیاں اور پٹیاں چمکا لیتے ہیں۔ افسران سہمے سہمے نظر آتے ہیں۔ البتہ سیاسی قیدی بے نیاز ہوتے ہیں۔ کوئی آئے کوئی جائے، انہیں اپنا وقت گزارنا ہوتا ہے۔ شور ہوا کہ صاحب ''ماڑی'' پر تشریف لے آئے۔ سندھ میں ڈیوڑھی کو

Marfat.com

ماڑی کہا جاتا ہے۔ اندر آ کر وہ وارڈوں میں تشریف لے گئے۔ ہمیں چونکہ الگ تھلگ رکھا ہوا تھا
ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انسپکٹر جنرل صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ اچانک جب وہ ہماری وارڈ
دروازے پر آ گئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ کوئی بڑا افسر گشت کے لیے آیا ہے۔ زنانہ وارڈ اور ہمارے وارڈ
باہر والا دروازہ ایک ہی تھا۔ اندر دو دروازے الگ الگ تھے اور دونوں کا صحن بھی الگ الگ تھا۔ جرنیل
صاحب زنانہ وارڈ میں تشریف لے گئے۔ پھر ہمارے ہاں کا دروازہ کھلا تو ایک سادہ مزاج نہایت
شریف انسان بغیر کسی کروفر کے ہماری طرف بڑھا اور نہایت خندہ پیشانی سے کہا السلام علیکم، مولوی
صاحبان کیسے مزاج ہیں؟ ہم نے ابتداء میں یہ سمجھا کہ کوئی معزز وزیر جیل ہے مگر جب جیل افسران
قطار کوان کے پیچھے کچھ فاصلے پر مؤدب کھڑے دیکھا تو ہم نے سمجھا کہ یہی انسپکٹر جنرل صاحب ہیں
وہ ہم سے بار بار دریافت فرماتے تھے کہ آپ کو کوئی تکلیف ہو تو بتایئے؟ میں نے اور میرے ساتھیو
نے یہی جواب دیا کہ ہم بہت اچھے ہیں۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں مگر وہ اصرار کرتے رہے کہ کوئی تکلیف
ہو تو فرمایئے میں ہر جائز امداد کروں گا۔ ہم نے اس جیل میں پہلے ہی دن یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی
رخواست نہیں کرنا اور نہ کسی چیز کے لیے ہاتھ پھیلانا ہے صبر اور شکر سے اللہ کے بھروسے پر وقت گزارنا
ہے۔ جب ہم نے کوئی درخواست یا آرزو پیش نہ کی تو وہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر احاطے
گھوم پھر کر ہماری کوٹھڑیوں کے گردوپیش کو دیکھتے رہے۔ جب وہ بیت الخلاء کی طرف گئے
سپرنٹنڈنٹ کو آواز دی اللہ بخش یہ بیت الخلاء بے پردہ ہے۔ یہ مولوی صاحبان ہیں۔ تمہیں خود
چاہیے تھا کہ یہ ان لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہے کل اسے درست کراؤ۔ ہم پھر آ کر دیکھیں گے۔
ہماری جانب متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ کھانا وغیرہ ٹھیک ہے۔ کوئی شکایت تو نہیں؟ ہم نے پھر
جواب دیا کہ اللہ کا شکر ہے۔ ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ جرنیل صاحب نے بار بار ہماری طرف
دیکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم کوئی جائز مطالبہ کریں تو وہ اسے فوراً پورا کرا دیں۔ بہرحال وہ واپس ہونے
لگے تو ہم انہیں الوداع کہنے کے لیے آگے بڑھے دو چار قدم چلے تھے کہ وہ نہایت اخلاق سے فرمانے
لگے۔ اچھا مولوی صاحبان آپ تشریف رکھیں میں جا رہا ہوں۔ آپ نے تو خدمت کا کوئی موقع
نہیں دیا۔ ہم نے ان کی بلند اخلاقی کی تعریف کی اور شکریہ ادا کیا اور اپنی کوٹھڑیوں کے سامنے کھڑے
کر جرنیل صاحب کی خوش اخلاقی اور شریفانہ گفتگو کی تعریف کرتے رہے نہ ہم نے ان سے کچھ لیا
وہ ہمیں کچھ دے گئے مگر محض اخلاق اور ہمدردانہ گفتگو سے وہ ہمیں اپنی تعریف کے لیے مجبور کر گئے۔

Marfat.com

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی

صبح نماز کے بعد ہم تینوں نہانے کے عادی تھے۔ جس روز مولانا لال حسین اختر سب سے پہلے غسل خانے میں داخل ہو جاتے تو مجھے اور نیاز کو تقریباً ایک گھنٹہ غسل خانے کے باہر خزانے کے پہرہ دار کی طرح انتظار میں ٹہلنا پڑتا تھا۔ مولانا موصوف انتہا سے زیادہ صفائی پسند ہیں۔ مولانا غسل خانے میں داخل ہو کر چٹخنی لگا لیتے تھے۔ سب سے پہلے وہ نلکے کی ٹوٹی دھوتے تھے۔ پھر فرش دھوتے تھے اس کے بعد لوٹا دھونے کا نمبر آتا تھا پھر صابن کو بھی دھو لیتے تھے۔ تب کہیں مولانا صاحب جسم مبارک کو دھوتے اور خوب دھوتے تھے۔ نہانے کے بعد اگر انہیں شک ہو جائے کہ کوئی غلط چھینٹ پڑ گئی ہے تو غسل از سر نو ہوتا تھا۔ ہم دونوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہم مولانا سے پیشتر ہی دس پندرہ منٹ میں فارغ ہو جائیں۔ اس کے بعد مولانا لال حسین اختر کو کھلی چھٹی دے دیں۔ مولانا کے گلاس کو اگر آپ باوضو ہاتھ لگا دیں تو وہ تب بھی گلاس کو باقاعدہ مانجھیں گے۔ غرض یہ کہ اس بارے میں وہ خطرناک حد تک محتاط ہیں۔

میں غسل خانے میں تھا کہ باہر مولانا نے شور مچا دیا کہ جلدی باہر آؤ۔ ایک تازہ خبر ہے۔ بڑی اہم خبر ہے۔ میں نے جلدی جلدی پانچ لوٹے جسم پر انڈیلے اور غسل خانے سے باہر آ گیا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ خواجہ ناظم الدین تخت وزارت سے لڑھک گئے ہیں۔ اناللہِ وانا الیہ راجعون۔ آخر وہی ہوا جو ہم آخری ملاقات میں خواجہ صاحب سے کہہ آئے تھے۔ گورنر جنرل نے ایک ہی جھٹکے میں خواجہ صاحب کا پتہ کاٹ کر رکھ دیا اور معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کی گدی پر بٹھانے کے لیے امریکہ نے کسی محمد علی کو بلا لیا ہے۔ اب وہ ہمارے وزیر اعظم بن گئے ہیں۔ ہمیں خواجہ صاحب کی علیحدگی سے کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ افسوس ہوا کہ ایک نیک انسان بزدلی کی وجہ سے گمنامی کے گڑھے میں گر گیا اور خواہ مخواہ اپنے دامن پر شہیدوں کے خون کا داغ سمیٹ کر لے گیا۔

جرنیل صاحب کی دوبارہ تشریف آوری

پندرہ بیس روز کے بعد انسپکٹر جنرل جیل خانہ جناب زیڈ۔ زیڈ۔ احمد دوبارہ تشریف لائے۔ اب وہ ہمارے جانے پہچانے تھے اور ہم اُن کے لیے نئے نہ تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ صبر سے کام لینا اور کچھ نہ کہنا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ صرف میں ان سے بات کروں گا۔ علیک سلیک کے بعد وہ فرمانے لگے میں آپ کے کمرے تو دیکھوں۔ ہم تھے تو سی کلاس کے قیدی مگر ہمارے بستر بہت صاف

Marfat.com

ستھرے تھے ان پر پلنگ پوش بھی موجود تھے۔ کمرے میں صفائی رکھنے کا ہم تینوں کو بہت خیال رہتا تھا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئے، فرمانے لگے، ماشاء اللہ خوب صفائی ہے مگر کرسیاں کہاں ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ کرسیاں کیسی؟ انہوں نے مجھے خطاب کرنے کی بجائے دور کھڑے ہوئے سپرنٹنڈنٹ جیل کو آواز دی۔ اللہ بخش اِدھر آ ؤ۔ مولوی صاحبان کے لیے کرسیاں اور میز کہاں ہیں؟ یہ غفلت کیوں؟ ابھی منگواؤ، ہم یہاں کھڑے ہیں۔ یہ فرما کر وہ باہر تشریف لائے۔ بیت الخلاء کی طرف گئے۔ اسے درست دیکھ کر کچھ مطمئن ہوئے ہم نے ایک چارپائی باہر نکال کر کہا جرنیل صاحب کرسیاں آ رہی ہیں۔ آپ سرِ دست چارپائی پر تشریف رکھیں۔ وہ فرمانے لگے کوئی ہرج نہیں آیئے کچھ باتیں کریں۔

''دن بھر آپ کا شغل کیا ہے''؟ ہم نے عرض کیا معمول کے مطابق نماز اور تسبیح کے سوا یہاں اور شغل ہے بھی کیا۔ اللہ اللہ کرتے ہیں گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ ہمیں اب اور کرنا بھی کیا ہے۔ فرمانے لگے صحت قائم رکھنے کے لیے کوئی ورزش چاہیے۔ میں نے کہا یہ آپ کے بس کی بات ہے ہم تو نظر بند ہیں وہ کچھ سوچ کر فرمانے لگے۔ آپ کو شام کے وقت دوسری بیرک میں بھیجنا بھی مناسب نہیں۔ دوسروں کو آپ کے پاس نہیں لایا جا سکتا۔ تب کیا ہونا چاہیے؟ کچھ ہونا تو چاہیے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ احاطے میں باغبانی کی جائے۔ مشقتیوں کو حکم ہوا کہ وہ پتھریلی زمین کو کھود کر اس میں نئی مٹی ڈلوا دیں جس میں چمن بنا لیا جائے اور ضرورت کے مطابق سبزی، ترکاری اُگائی جائے۔ یہ کام میری منشاء کے مطابق تھا اتنے میں ایک میز اور تین کرسیاں تین دولیاں آ گئیں۔ جنرل صاحب اس مغالطے میں تھے کہ ہم بی کلاس کے نظر بند ہیں۔ نہ تو سپرنٹنڈنٹ کو حوصلہ ہوا کہ وہ صاحب سے کہتا کہ حضور یہ تو سی کلاس کے لوگ ہیں۔ انہیں کرسیاں اور میز کیسے دی جائیں؟ اور نہ ہمیں تکلف میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ آپ جن نظر بندوں پر شفقت فرما رہے ہیں وہ حکومت کی نگاہ میں تھرڈ کلاس سمجھ گئے ہیں۔

گفتگو

جرنیل صاحب ہمارے ساتھ ٹہلتے ہوئے فرمانے لگے کیوں مولوی صاحب وزارتوں کی اٹھا پٹخ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا آپ بڑے آدمی ہیں۔ بڑے آدمیوں کے بارے میں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ اندر بیٹھے ہمیں کیا معلوم کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ ''ڈان'' پڑھ کر کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اخباری بات ہوتی ہے۔ اندر خانے خدا جانے کیا ہوتا ہے؟ جرنیل صاحب بار بار ارشاد فرماتے تھے کہ ہمارے ہاں مرکز میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ حضورِ والا میں نے جو سمجھا ہے۔ وہ موٹی سی بات ہے۔ مرکزی سیاست کی باریکیوں کو تو میرے ایسا سی

Marfat.com

کلاس کا قیدی کب سمجھے گا۔ مجھے اس اٹھا پٹخ کا نقشہ اس طرح سمجھ میں آتا ہے۔ جیسے ساون کا جھولا ڈالا ہو اور اسے ہمجولیوں نے گھیرے میں لے رکھا ہو۔ ایک جھولا جھولتی ہے۔ باقی مل کر ملہار گاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب خیال آتا ہے کہ جھولنے والی تو مزے میں رہی ہماری باری کب آئے گی؟ اس خیال کے آتے گانے والیاں آگے بڑھ کر ٹانگ پکڑ لیتی ہیں اور ہمجولی کو کھینچ کر پرے پھینک دیتی ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا جب تک ان سب کی باری ختم نہ ہو جائے یا برسات کا موسم ختم نہ ہو جائے۔ میری بات سن کر جرنیل صاحب بہت دیر تک ہنستے رہے۔ غرض یہ کہ وہ بے تکلف ہو گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو ہم اخلاقاً دو چار قدم ساتھ ہوئے۔ جرنیل صاحب نے پھر فرمایا کہ آپ نہ کچھ کہتے ہیں اور نہ ہمیں خدمت کا موقع دیتے ہیں۔ مولانا لال حسین اختر سے رہا نہ گیا، وہ بول اٹھے اور فرمایا کہ صاحب ہمیں ایک تکلیف ہے؟ مولانا نے جب اتنا کہا تو میرے جسم میں سناٹا ہوا، دماغ چکرا گیا کہ لو بھئی سب سے زیادہ سمجھدار آدمی نے لٹیا ڈبو دی مگر میں اب کیا کر سکتا تھا۔ جرنیل صاحب نے فوراً مولانا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دریافت فرمایا۔ مولانا جلد فرمائیے۔ مولانا لال حسین اختر نے کہا کہ آپ ہم دونوں سے جو دل چاہے سلوک کیجیے مگر ماسٹر صاحب ہمارے بزرگ ہیں۔ ہم انہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتے چاول کی روٹی یہ کھا نہیں سکتے ان کی عمر کا بھی خیال فرمائیے اور انہیں دانتوں میں بھی تکلیف ہے اور اختلاج بھی ہے۔ حکومت نے انتقاماً ہم کو سی کلاس میں رکھا ہے مگر بحیثیت انسان ہمارے کچھ حقوق ہیں۔ ہم سے جائز سلوک ہونا چاہیے۔ غور فرمائیے کہ ہم پنجاب کے رہنے والے چاول کی روٹی کیسے کھائیں؟ کیونکر ہضم کریں۔ ہم تو خیر کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیں گے مگر ان کو ہم اس تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ جرنیل صاحب پر حقیقت حال واضح ہوئی تو ان پر ایک رنگ آئے ایک رنگ جائے میری طرف دیکھ کر جرنیل صاحب نے فرمایا مولوی صاحب آپ کو سی کلاس میں رکھا گیا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں کوئی ہرج نہیں ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے۔ ہمیں منظور ہے اب بات آپ پر ظاہر ہو گئی ہے تو گزارش بھی سن لیجیے۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ کھانے کو جو ملتا ہے وہی غنیمت ہے مگر میرے ایسے اختلاج قلب کے مریض کو کوٹھڑی میں بند کرنا ایسی سزا ہے جو میرے ٹکٹ میں درج نہیں۔

جرنیل صاحب نے اللہ بخش کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ آپ ان کو بند کیوں کرتے ہیں؟ کھلا رکھو۔ بلاوجہ تکلیف دینے کے کیا معنی؟ ڈاکٹر بھی کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ تب جرنیل صاحب ڈاکٹر کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا ڈاکٹر تم نے اپنا فرض ادا کیا۔ جب یہ آئے تو کیا وزن اور اب کیا وزن ہے؟ ان کو

Marfat.com

کوئی تکلیف نہیں ہے؟ ڈاکٹر بیچارہ کانپ گیا۔ میں نے مداخلت کی اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب بدستور ہر روز آتے ہیں۔ میں خود انکار کر دیتا ہوں اور انہیں کہتا ہوں کہ کسی اور مریض کو دیکھ کر دوا دیجیے۔ میرے پاس وقت ضائع نہ کیجیے۔ بہر حال سارا راز کھل گیا اور انسپکٹر جنرل صاحب جان گئے کہ ہمارے ساتھ حکومت نے کیا سلوک کیا ہے مگر اس میں ان کا کوئی دخل نہ تھا۔ ان کا فرض صرف اتنا تھا کہ قیدی کو اسی حفاظت اور اسی طریقے سے رکھنے کی انہیں حکومت نے سفارش کی ہے۔ ہم نظر بند تھے اور باہر سے کھانے پینے کی وہ چیز جن کی ڈاکٹر اجازت دے اپنی گرہ سے منگوا سکتے تھے۔ ہم تینوں کے نام سے جیل کے خزانچی کے پاس رقم جمع تھی۔ جرنیل صاحب تشریف لے گئے تو جیل افسران نے ہماری نگہداشت پر خاص توجہ مبذول فرمائی۔ ڈاکٹر نے مناسب خوراک لگا دی اور ہم چاول کی روٹی کے دیدار سے محروم ہو گئے۔ پنجاب کی روٹی ملنے لگی ڈبل روٹی بھی مل جاتی تھی۔ ڈاکٹری اصول پر لیموں اور مسمی بھی ملنے لگا مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا سب سے بڑی تکلیف بند ہونے کی تھی۔ وہ ختم ہو گئی۔ پہلی رات صحن کی کھلی ہوا میں چارپائی بچھائی تو جنت کی ہوا نے لوریاں دیں۔ خوشی میں آسمان کے تاروں کو دیکھتے رہے۔ نیاز کو ساحر لدھیانوی کا سارا کلام ازبر تھا۔ نظم پر نظم چلی آ رہی تھی۔ مولانا لال حسین اختر صاحب فرمانے لگے: کیوں ماسٹر صاحب میں نے اچھا کیا نا؟ غرض یہ کہ مصیبت کے دن کسی قدر راحت میں بدل گئے۔

بھوپت ہمارے پڑوس میں آ گیا

ایک دن صبح سویرے دو تین قیدی اور ایک جمعدار کچھ سامان اٹھائے ہمارے احاطے میں داخل ہوئے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ بھوپت اور دو مزید قیدی ساتھ والی بیرک میں آ رہے ہیں۔ سامان کے بعد بھوپت بھی آ گیا۔ اس کے ساتھی بھی آ گئے اور ہمارے پڑوس کی بیرک میں جن کے احاطے کا دروازہ ہمارے احاطے میں کھلتا تھا بند کر دیئے گئے۔ بھوپت کو چار روپے دس آنے یومیہ خوراک کے لیے ملتے تھے، کھانا پکانے کے لیے باورچی اور ایک وارڈر باہر سے اُس کے لیے خورد و نوش کا سامان لانے کے لیے مقرر تھا۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا یکجا

افسرانِ جیل سبھی مسلمان تھے۔ اس لیے وہ محسوس کرتے تھے کہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے اسیر جو باحیثیت مسلمان ہیں۔ انہیں تو حکومت نے سی کلاس دے رکھی ہے مگر ایک ڈاکو وہ بھی کافر، اے کلاس سے اوپر اس درجے میں رکھا گیا ہے۔ جن میں فوجی جرنیل رکھے گئے ہیں۔ ہمیں اس ناروا سلوک پر قطعی قلق نہ تھا۔ ہم نے بھوپت کی سہولت کو بہت پسند کیا۔ ہمارا اندازِ فکر بالکل مختلف تھا۔ بھوپت بہادر

Marfat.com

انسان تھا۔ ہم پسند کرتے تھے کہ اس سے بہتر سلوک کیا جائے۔ ہمارے دل میں بھوپت کے لیے از خود ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا چنانچہ اسی جذبے کے تحت ہم نے افسرانِ جیل سے درخواست کی کہ بھوپت کی وارڈ کا دروازہ جو ہمارے احاطے میں کھلتا ہے۔ کھلا رکھا جائے اور بھوپت کو اجازت دی جائے کہ وہ ہمارے پاس آ سکے اور ہم اس کے پاس جا سکیں۔ ہماری درخواست پر ہمدردانہ غور ہوتا رہا۔ کئی دن گزر گئے۔ اس دروازہ پر ایک وارڈر چابی لیے کھڑا رہتا تھا جب بھوپت کا باورچی ڈیوڑھی سے سودا سلف لینے کے لیے کھٹکھٹاتا تو تالا کھول دیا جاتا اور باورچی کو باہر نکال کر دوبارہ تالا لگا دیا جاتا۔ ایک روز تالا کھلا تو بھوپت دروازے پر آ گیا اور وارڈر سے کہنے لگا تالا مت لگاؤ ہم مولوی صاحبان سے ملنے جا رہے ہیں۔ مل کر ابھی آ جائیں گے۔ بھوپت کا رعب تو تھا ہی، بے چارہ وارڈر منہ دیکھتا رہ گیا۔ بھوپت ہم سے مل کر بہت خوش ہوا۔ ہم نے چاہا کہ اس کی خاطر مدارت کریں مگر ہمارے پاس رکھا ہی کیا تھا۔ ہم نے بھوپت سے رسمی طور پر پوچھا کہ ٹھا کر چائے پیو گے یا دودھ۔ ہمارے پاس اس وقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ بھوپت بڑا سیر چشم انسان ہے۔ بغیر کچھ کھائے پیئے وارڈر کے حال پر رحم کر کے اپنی وارڈ میں چلا گیا۔ دوسرے دن شام کو بھوپت نے باہر کھڑے ہوئے وارڈر سے کہا کہ تالا کھولو ہم مولوی صاحبان کے پاس جائیں گے۔ وارڈر نے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم آپ کی خاطر نوکری سے ہاتھ نہیں دھو سکتے۔ ہم تالا نہیں کھولیں گے۔ بھوپت نے اندر کھڑے کھڑے بلند آواز سے وارڈر کو ڈانٹا۔ ہم نے شور سنا تو ہم دروازے کے قریب آ گئے۔ بھوپت نے وہیں سے آواز دی۔ دیکھو مولوی صاحب یہ تالا نہیں کھولتا۔ ہم دیوار کود کر باہر آ سکتے ہیں۔ ایسی دیواریں ہم کو نہیں روک سکتیں۔ مَیں نے بھوپت کو منع کرتے ہوئے کہا کہ ٹھا کر ایسا خیال بھی نہ کرو۔ یہ جیل خانہ ہے۔ یہاں کے قانون ہی ایسے ہیں۔ دیوار کودنا سخت جرم ہے۔ اس غریب وارڈر پر خفا ہونا بھی ناانصافی ہے۔ اس کی تو ڈیوٹی ہے۔ ہم نے افسران جیل سے درخواست کی ہے کہ وہ ہم کو تمہارے ساتھ ملنے کی اجازت دے دیں۔ چاہو تو تم بھی جب وہ تمہارے پاس آئیں، یہی درخواست کرو، وہ مان جائیں تو پھر آسانی ہو گی۔ جیل والوں سے بگاڑ پیدا کر کے تکلیف کا سامنا ہو گا۔ ارے مولوی صاحب ہمارے پیچھے گارڈیں اور پولیس کے بڑے بڑے افسر رائفلیں لے کر گھیرا ڈالتے رہے ہم ان سے تو ڈرے نہیں یہ جیل کے سپاہی جو ٹھیک سے بندوق سنبھالنا بھی نہیں جانتے یہ ہم کو آپ کے پاس آنے سے روکیں گے۔ بھوپت کی ایسی باتیں سن کر ہم کچھ پریشان ہوئے۔ اس لیے کہ بھوپت اگر واقعی دیوار کود کر ہمارے پاس آ جاتا تو ہم بھی برابر کے مجرم گردانے جاتے، ہم اگر کہتے کہ ہم نہ چاہتے تھے کہ بھوپت جیل کے قانون کی خلاف ورزی

Marfat.com

کرے۔ ہم تو اسے منع کرتے تھے مگر ہماری اس بات کو تسلیم کون کرے گا۔ بہر حال ہم نے باہر کھڑے وارڈر کو بھی ہموار کر لیا اور کہا کہ بھوپت بے دریغ طبیعت کا بہادر انسان ہے۔ اس سے الجھنا اچھا نہیں۔ ہم اسے بالکل ہموار کریں گے تم اس تُو تُو مَیں مَیں کا تذکرہ ڈیوڑھی میں نہ کرنا۔ بلاوجہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ وہ بیچارہ مان گیا اور ہم نے بھوپت کو بھی منا لیا۔ ملاقات نہ ہو سکی بھوپت واپسی پر تاؤ کھا کر بڑبڑا رہا تھا اور بار بار کہتا تھا۔ یہ سالا جیل کیا ہے۔ ہم تو خوشی سے چلے آئے ہیں۔ ہم تھک گئے ہیں۔ ورنہ ہم کو کوئی زندہ کیسے پکڑ سکتا تھا؟

سپرنٹنڈنٹ مان گیا

سپرنٹنڈنٹ جیل شیخ اللہ بخش صاحب بہت بھلے آدمی تھے۔ وہ ہم سے زیادہ میل جول تو نہ رکھتے تھے مگر ہماری سہولت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہمارے کچھ روپے جیل کے خزانے میں جمع تھے۔ ڈاکٹر جن چیزوں کی اجازت دے دے۔ ہم اپنے پیسوں سے باہر سے منگوا سکتے تھے سپرنٹنڈنٹ نے وارڈر مقرر کر دیا تھا۔ جو ہمارے پرچے کے مطابق چیزیں منگوا دیتا تھا۔ ڈاکٹر نے اجازت دے دی تو ہم نے چائے کے برتن اور سامان باہر سے منگوا لیا۔ ایک روز ہم نے ان سے کہا کہ آپ بھوپت کو ہمارے پاس آنے دیں۔ بہادر انسان، اسلام بڑی جلد قبول کرتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ وہ اچھا اثر قبول کرے ماہیت قلب خدا کے ہاتھ ہے۔ اسے فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر فرمایا کہ ضابطہ اور ہدایت تو اجازت نہیں دیتی مگر آپ نے بات ایسی کہی ہے کہ میں انکار بھی نہیں کر سکتا۔ میں دیکھوں گا کہ اس بارے میں مَیں کیا کر سکتا ہوں بھوپت کا وارڈر بدل دیا گیا۔ ایک شریف اور سمجھدار وارڈر آ گیا۔ بھوپت نے ایک روز وارڈر سے کہا کہ ہم مولوی صاحبان سے ملاقات کریں گے۔ تالا کھولو۔ وارڈر نے کہا کہ میں تالا تو کھول دیتا ہوں مگر جلدی آ جانا۔ ارے کھولو تو سہی۔ تم کو کوئی کھا تو نہیں جائے گا۔ ہم دروازے کے قریب ہی ٹہل رہے تھے۔ بھوپت کو لیے ہم اپنے کمرے میں آ بیٹھے۔ بھوپت کی گفتگو میں جرأت و مردانگی کا اثر نمایاں تھا وہ خوش طبع انسان تھا۔ اس کا انداز گفتگو بڑا ہی دلچسپ تھا۔ پہلے دن ہم نے مناسب سمجھا کہ بھوپت کو جلدی واپس بھیج دیں چنانچہ ہم نے خود ہی کہا کہ ٹھاکر روزانہ آنے کے لیے ضروری ہے کہ جلدی واپس چلے جاؤ۔ ماڑی کی کھڑکی ہمارے وارڈ کے صحن پر کھلتی ہے۔ ایسا نہ ہو، دفتر والوں میں سے کوئی آپ کو ادھر آتا جاتا دیکھ لے۔ بھوپت اٹھا اور ہم سے ہاتھ ملا کر واپس ہو گیا۔

Marfat.com

بھوپت سے ملاقاتوں کا سلسلہ

اب بھوپت کا معمول تھا کہ وہ دن میں ایک دو مرتبہ ہمارے پاس آئے اور کافی دیر ٹھہر کر جائے۔ ہم نے اس سے معلوم کرنا چاہا کہ وہ ڈاکو کس طرح بن گیا۔ اس نے ہمیں سب کیفیت کہہ سنائی۔ بھوپت ابتداء میں معمولی سپاہی تھا مگر وہ بہادر تھا۔ سپاہی گیری اس کی نگاہ میں جچتی نہ تھی۔ جاگیرداروں نے جب کانگریس کے خلاف محاذ قائم کیا تو انہیں ایسے بہادر انسانوں کی سخت ضرورت تھی۔ بھوپت کو سمجھایا گیا کہ کانگریس بنیا لوگوں کی جماعت ہے۔ یہ لوگ گاندھی ٹوپی اور کھدر پہن کر ٹھاکروں کو شودر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ موٹی سی اُکسا دینے والی بات بھوپت کے دماغ میں اس طرح پیوست ہوئی کہ اسے کانگریسیوں سے ایسا بغض وعناد ہوا کہ وہ سرکاری رائفل اٹھا کر میدان میں نکل آیا۔ پولیس نے پیچھا کیا۔ بھوپت کا نشانہ بہت اچھا ہے۔ اس کا ہاتھ رائفل پر پٹھانوں کی طرح اٹھتا ہے۔ بارہا پولیس کو مخبروں نے اطلاع دی کہ بھوپت فلاں علاقے میں موجود ہے۔ پولیس نے گھیرا ڈال لیا مگر بھوپت نے ہر بار گھیرے کو توڑ ڈالا اور صاف بچ کر نکل گیا۔ اور جاتے ہوئے ایک دو سپاہیوں کو ڈھیر کر گیا۔

ایک بار ایک رئیس نے بھوپت کو اپنے ہاں بلایا۔ مخبر نے پولیس افسران کو اطلاع دی۔ بھاری تعداد میں پولیس نے ریاست کا ہیڈ کوارٹر گھیر لیا۔ بھوپت اس وقت محل میں تھا۔ بھوپت نے رئیس سے کہا کہ میں باہر نکل کر ان سے لڑ مرتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کی بے عزتی ہوگی۔ مجھے یہ منظور نہیں۔ رئیس جہاں اپنی آبرو بچانا چاہتا تھا وہاں سے بھوپت کی جان بھی بہت عزیز تھی۔ اس لیے کہ بھوپت کانگریسیوں کے لیے سخت پریشان اور ہوا خیزی کا باعث تھا۔ بھوپت نے ہمیں بتایا کہ پولیس کا گھیرا موجود رہا اور وہ صاف نکل گیا ہم نے دریافت کیا کہ وہ کیسے؟ بھوپت نے ہمیں اس شرط پر گھیرے سے بچ نکلنے کا قصہ سنایا کہ ہم اسے راز سمجھیں۔ آج بھی وہ راز اسی طرح ہمارے سینے میں محفوظ ہے۔ ہم نے سمجھنا چاہا کہ بھوپت کا چال چلن کیسا ہے۔ اب وہ ہم سے بہت بے تکلف ہو چکا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ میرے تمام ساتھی جو ایک ایک کر کے مارے گئے، تھے تو بڑے بہادر مگر انہیں شراب کی لت تھی اور ایک ساتھی تو محض اس لیے مارا گیا کہ اس کا ایک عورت سے ناجائز تعلق تھا۔ بھوپت نے کہا کہ حکومت کو للکارنے کے بعد پولیس سے مقابلہ بھی کرنا اور شراب پی کر مدہوش ہو جانا یا عورتوں سے تعلق رکھنا یہ دو کام ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ بھوپت کبھی کبھار پیتا تھا۔ وہ بھی بہت کم۔ اسے بدچلنی کی بدعادت نہ تھی۔

Marfat.com

بھوپت کانگریسی رہنماؤں سے کیا سلوک کرتا تھا

بھوپت نے ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگا ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ فلاں گاؤں میں کانگریس کا جلسہ ہے۔ وہاں ضلع کے ایک کانگریسی رہنما نے تقریر کرنا تھی۔ وہ جگہ جگہ بھوپت کے خلاف لوگوں کو اُکساتا تھا اور عوام سے کہا کرتا تھا کہ بھوپت کو پکڑ لو۔ بھوپت جلسے سے کچھ وقت پہلے گاؤں کے قریب کھیتوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ جلسہ شروع ہے تو وہ رائفل کندھے پر ڈال کر گاؤں کے اندر پہنچ گیا۔ جلسے سے باہر کھڑے ہو کر اندازہ لگایا کہ کس طرح سٹیج تک رسائی ہو۔ اس جلسے میں وہی کانگریسی لیڈر تقریر کر رہا تھا۔ لوگوں نے کچھ چندہ بھی جمع کر کے سٹیج پر پہنچا دیا تھا۔ بھوپت سٹیج کے عقب سے آیا اور اسی دم سٹیج پر پہنچ کر کہنے لگا۔ بھوپت آ گیا ہے۔ گاؤں والوں مَیں تمہیں کچھ نہ کہوں گا۔ مجھے صرف اس کانگریسی لیڈر سے نپٹنا ہے۔ اس نے ہوا میں رائفل کے فائر کیے۔ بھوپت کے نام کی بڑی دھوم تھی۔ جان کس کو پیاری نہیں۔ سٹیج درہم برہم ہو گئی۔ بھوپت نے جمع شدہ چندہ بھاگتے ہوئے لوگوں کی جانب پھینکا اور کہا غریبو، یہ روپے لیتے جاؤ۔ بیچارہ کانگریسی لیڈر قابو آ گیا۔ کچھ جی دار لوگ دور فاصلے پر کھڑے تھے۔ بھوپت نے کانگریسی لیڈر کو مارا نہیں، صرف اتنا کہا کہ اب اس علاقے میں قدم نہ رکھنا۔ دوسری دفعہ اگر میں نے سنا کہ تم لوگ اِدھر کا رُخ کرتے ہو تو میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ یہ کوئی بناوٹی کانگریسی لیڈر تھا جو بھوپت کی شکل دیکھ کر اور نام سن کر کانپ گیا۔

کیریکٹر کی بات

ایک روز ہم نے بھوپت سے کہا کہ بھوپت تم ڈاکے ڈالتے تھے تو تمہیں کبھی رحم نہیں آیا۔ وہ ہنس پڑا پھر کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا کہ ایک دفعہ ایک ساہوکار کے گھر پر ڈاکہ ڈالا۔ یہ بڑا سود خور تھا اور مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اردگرد کے گاؤں قلاش بنا رکھے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ اس کے پاس رقم بھی کافی ہو گی۔ میرے ہمراہ میرے دو اور جوڑی دار تھے۔ ان میں سے ایک بہت سخت مزاج اور کسی قدر بے رحم بھی تھا۔ مکان کے دروازے پر پہنچ کر ہم نے اس کے نوکر کو باہر بلایا اور کہا کہ سیٹھ سے ایک ضروری کام کے لیے ملنا ہے۔ نوکر اندر گیا۔ میں اور میرا ایک ساتھی اس کے پیچھے پیچھے مکان کے اندر چلے گئے۔ میرا ایک ساتھی دروازے پر رائفل لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہوا میں فائر کر دیا۔ گاؤں والوں نے سمجھ لیا کہ بھوپت آ گیا ہے۔ میں نے دروازے بند کر لیے میں نے اندر جاتے ہی سیٹھ کے سینے پر رائفل کی نالی رکھ دی۔ اس غریب کی بساط ہی کیا تھی نوکر کو ایک کونے میں کھڑا کر کے کہہ دیا کہ اگر تم ہلو گے تو گولی

Marfat.com

ماردی جائے گی۔نوکر کی کیا مجال تھی؟ کہ ہل بھی جاتا یا اونچا سانس بھی لیتا؟ ہم نے پیٹیاں کھلوالیں۔ مال کا ڈھیر لگالیا۔اس سیٹھ کی ایک نوجوان خوبصورت کنواری لڑکی تھی۔وہ بھی صحن میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ مجھے اس سیٹھ پر غصہ بھی تھا کیونکہ وہ کانگریس کو چندہ بھی دیا کرتا تھا۔میں نے اس سے چندے کی رسیدیں بھی مانگیں۔ میں نے سیٹھ سے کہا سیٹھ تیار ہو جاؤ۔ کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو؟ سیٹھ نے ہاتھ باندھ کر کہا کہ مجھے چاہے ماردو۔ بیٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ کنیا ہے اور میرے سوا اس کا کوئی نہیں ہے۔ بھوپت نے اس لڑکی کی طرف دیکھا تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگی۔ میرے پتا پر رحم کرو۔ بھوپت کہتا ہے کہ انسانی ہمدردی کے جذبات نے مجھ پر قابو پالیا۔ میں نے اس سے کہا تم ہماری بہن ہو۔اب نہ تم کو ماریں گے، نہ تمہارے پتا کو۔ میرے ساتھی نے مال سمیٹنا شروع کیا۔ میں اس لمحے ڈاکو نہیں تھا بلکہ مجھ پر انسانیت کا غلبہ تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ٹھہرو۔ پھر لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا کہ اس سونے کے زیور میں تمہارا بھی کوئی زیور ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا تم اپنا زیور نکال لو۔ میرے لالچی ساتھی نے لڑکی کو گھور کر دیکھا۔ میں نے اسے ڈانٹ پلائی اور کہا میں نے اسے بہن کہا ہے اور تم آنکھیں دکھا رہے۔ یہ سب کچھ یہیں چھوڑ دو۔ چلو واپس چلو، واپس آتے ہوئے ہم نے سیٹھ سے کہا کہ غریبوں کا خون چوسنا چھوڑ دو اور دیکھو خبردار اگر کانگریسیوں کو کبھی چندہ دیا۔

بھوپت زندگی میں صرف ایک بار گھبرایا

ہمیں جیل خانے میں فرصت تھی۔ بھوپت ہمارے لیے ایک ناول تھا۔ جسے ہم ہر روز سنتے تھے۔ بھوپت زیادہ باتونی نہ تھا اور نہ کبھی اپنی دلیری پر فخر کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مولوی صاحب میری شہرت نے مجھے اور میرے نام کی دہشت نے مجھے بڑا کام دیا۔ لوگوں کو صرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بھوپت ہوں، پھر میرے لیے راستہ ہموار ہو جاتا تھا۔ بعض مقامات کے پولیس افسر بھی بھوپت کا ساتھ دیتے تھے۔ عوام کو بھوپت سے ہمدردی تھی۔ دیہاتی لوگ چوپالوں میں بیٹھ کر بھوپت کی داستانیں سنایا کرتے تھے، جس سے عوام میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ بھوپت نے بتایا کہ ایک دن میں اکیلا تھا، گاؤں کے باہر ایک جھونپڑی تھی، مَیں اس میں ذرا ستانے کے لیے ٹھہر گیا، شام ہوئی تو پولیس نے میرا کھوج لگا رکھا تھا مگر اسے جھونپڑی کے قریب آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پولیس کی گارڈ نے گھیرا ڈال لیا، میں نے جھونپڑی میں سے صورت حال کا مطالعہ کیا جب دیکھا کہ بالکل گھر گیا ہوں۔ تب مجھے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ لڑ بھڑ کر جان دے دوں، جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر کانٹوں کی باڑھ تھی۔ میں نے جھونپڑی سے نکلتے ہی رائفل اٹھا کر فائر کرنا چاہا مگر کارتوس مس ہو گیا۔ پھر کوشش کی۔ رائفل کو نہ

Marfat.com

چلنا تھا اور نہ چلی۔ میں اسی طرح رائفل سنبھال کر دوڑا اور باڑ کی اوٹ میں جا بیٹھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب آخری وقت ہے رائفل بھی جواب دے چکی ہے اور میں اکیلا ہوں مگر پولیس کو گھوم کر آگے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ شاید یہ سمجھتی تھی کہ میں ان کو دھوکے سے قریب لا کر مارنا چاہ رہا ہوں۔ اچانک میرے دل میں یہ بات آئی کہ کُٹیا سے باڑ تک لانے میں جس نے امداد دی ہے۔ کیا وہ یہاں سے بچ نکلنے میں امداد نہ دے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں اٹھا اور ایک دم چھلانگیں لگاتا ہوا گھیرے کے کمزور حصے کی طرف لپکا۔ مجھ پر فائر بھی ہوتے رہے مگر سب نشانے خطا ہوئے۔ کچھ فاصلے پر درخت تھے۔ جن کی اوٹ سے ہوتا ہوا میں پولیس کی دسترس سے نکل گیا۔ مولوی صاحب اس روز میں گھبرا گیا تھا۔ اس کے بعد کبھی ایسا موقع نہیں آیا۔

تبلیغ

بھوپت جب بھی ہمارے پاس آیا اتفاق کی بات ہے۔ اس وقت ہم اکثر نماز میں مشغول ہوتے تھے۔ وہ جوتا اتار کر ادب سے بیٹھ جاتا اور ہمیں بڑے غور اور عقیدت سے دیکھتا رہتا۔ کچھ دن بعد کہنے لگا۔ مولوی صاحب میرا دل چاہتا ہے۔ میں بھی آپ کی طرح نماز پڑھوں۔ میں نے کہا، ٹھاکر یہ عقیدہ کی بات ہے۔ عقیدہ پہلے اور نماز کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ بھوپت سے ایک روز پھر اسی سلسلے میں گفتگو کی۔ ہم نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا البتہ گفتگو میں ہمارا انداز ایسا ہوتا تھا۔ جس سے وہ متاثر ہوتا تھا ہم میں کوئی بھی دریدہ دہن نہ تھا۔ بھوپت کے سامنے احتیاط سے گفتگو کرتے تھے اور حتی الوسع اسلامی روایات اور ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ بہر حال بھوپت بہت متاثر ہوا۔ اسلام کے بارے میں اس نے مولانا لال حسین اختر سے کچھ باتیں دریافت کیں۔ میں نے بھوپت سے کہا کہ ٹھاکر اسلام بہادروں کا مذہب ہے۔ اسے بزدلوں کے حلق میں ٹھونسا نہیں جاتا۔ یہ بہادروں کے دل میں خود اُترتا ہے۔ سوچ سمجھ کر قبول کرنا کیونکہ بھلے لوگ بار بار مذہب بدلا نہیں کرتے۔ وہ اسلام کی طرف مائل تھا۔ اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک روز اسے معلوم ہوا کہ پاکستان گورنمنٹ اسے بھارت حکومت کے حوالے کرنے والی ہے۔ بھوپت نے ہمیں صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے فیصلہ قبول نہیں۔ میں یہاں سے یا تو نکل بھاگوں گا یا اس وقت جب مجھے بھارتی پولیس کے حوالے کیا جائے گا، اس پولیس سے لڑ مروں گا۔ ہم نے اسے بہت تسلی دی۔ ایک روز اسے شک ہوا کہ ضرور اسے بھارت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ بھوپت نے داڑھی منڈوا ڈالی ہم نے دریافت کیا کہ تم نے یہ کیوں کیا۔ وہ کہنے لگا: مولوی صاحب دشمن جب بے عزتی کرنے پر آتا ہے تو داڑھی پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

اس لیے میں نے داڑھی کا صفایا کر دیا۔ ارے ٹھاکر تمہیں کیا وہم ہو گیا ہے۔ یقین کرو کہ تمہیں بھارت کے حوالے ہرگز نہ کیا جائے، تم یہاں کے شہری بن جاؤ اور شریفانہ زندگی گزارنے کا عہد کرو پھر کسی کو کیا ضرورت ہے کہ تمہیں ملک بدر کیا جائے یا بھارت کے حوالے کر دیا جائے۔ کچھ دن بعد بھوپت کو پھر ہم سے دور دوسری بیرک میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس نے اسلام کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ وہ جیل ہی میں مسلمان ہو چکا تھا۔ باہر آ کر مولانا محمد یوسف کلکتوی کی صحبت میں رہنے لگا اور باقاعدہ مسلمان ہو گیا۔ اب وہ ایک شریف مسلمان شہری ہے۔ اور کسب حلال سے گزارہ کرتا ہے۔

ہمارا شغل

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ہمیں اجازت تھی کہ اپنی وارڈ کے ایک حصے میں، جسے مشقتیوں نے کھود رکھا تھا، سبزی ترکاری لگائیں۔ کوٹھڑیوں کے دروازے پر رابیل لگی ہوئی تھی مگر وہ نصف سوکھ چکی تھی۔ احاطے کے ایک کونے میں رابیل کا ذخیرہ تھا اور وہ بھی خاتمے کے قریب تھا۔ ہم نے رابیل کو کھود کر اس میں کھاد ڈالی۔ ذخیرے کو روزانہ پانی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ ہرا ہونے لگا۔ جیل افسران نے ہمیں کدو، کریلے، بھنڈی توری اور ٹنڈے کے بیج مہیا کر دیئے۔ ہم نے باقاعدہ نشان لگا کر چمن بنایا۔ بیج بوئے اور وہ اُگ آئے۔ صبح و شام ہم اپنے چمن کی آبیاری کرتے تھے۔ محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ ہم نے اپنی بوئی ہوئی فصل خود کاٹی۔ ہماری اس وارڈ میں نیم کے دو ٹنڈ منڈ درخت تھے۔ اس میں سائے کا کہیں نام نہ تھا۔ برسات کا موسم آیا تو ہم نے پتھریلی زمین کو کھود کر تین بڑے بڑے گڑھے بنائے۔ باہر سے نیم کے تین پودے منگائے۔ انہیں اس نیت سے لگایا کہ ہم نہیں تو جب بھی کوئی اور اس وارڈ میں ٹھہرایا جائے گا، اسے ان درختوں کے نیچے آرام اور سکون ملے گا تو ہمارا یہ کام شاید نیکیوں ہی میں لکھا جائے۔ جب ہم پیڑ لگا رہے تھے تو افسرانِ جیل نے ہمیں مسکراتے ہوئے کہا کہ مولوی صاحبان آپ ان درختوں کے سائے میں نہیں بیٹھ سکیں گے۔ ہم نے انہیں ہارون الرشید کے وقت کا ایک واقعہ سنایا کھجور کا پیڑ بڑی مدت کے بعد پھل لاتا ہے۔ ایک بوڑھا شخص کھجور بو رہا تھا، ہارون رشید نے اسے کہا کہ باوا تم عجیب قسم کے انسان ہو یہ کھجور کا درخت جب پھل لائے گا۔ تب تم مر چکے ہو گے۔ بوڑھے نے جواب دیا: یہ درست ہے آقا، مگر میں نے جو کھجوریں کھائیں ہیں۔ یہ بھی تو کسی نے اُگائی تھیں۔ کسی کی اُگائی ہوئی کھجوریں میں نے کھالیں میری اُگائی ہوئی کھجوریں جو آئندہ دنیا میں آئے گا، وہ کھا لے گا۔ بوڑھے کی بات سن کر خلیفہ بہت خوش ہوئے اور وزیر کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کو ایک ہزار اشرفیوں کا توڑا دے دو۔ بوڑھا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ آقا بے غرض خدمت کو کتنی جلدی پھل آتا

Marfat.com

ہے۔ میری بوئی ہوئی کھجوریں ابھی اُگی بھی نہیں کہ مجھے پھل مل گیا۔ اس پر خلیفہ اور زیادہ خوش ہوئے اور حکم دیا کہ ایک ہزار اشرفی اور بطور انعام دے دو۔ ہمیں جیل والوں یا مسلم لیگ کی حکومت سے کوئی انعام لینا مقصود نہیں تھا۔ ہم جیل خانے میں سایہ دار درخت اس لیے لگا رہے تھے کہ یہاں مجبور لوگ سائے میں آرام کر سکیں۔ جیل کی دنیا کیا ہے۔ انسان نے انسان کو حیوان سمجھ رکھا ہے۔ شدت کی گرمی میں جب جیل کی کوٹھڑیاں تپتی ہوئی بھٹی کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ مجبور انسانوں کو ان کوٹھڑیوں میں رات کے وقت بند کر دیا جاتا ہے۔ قیامت کی ان طویل راتوں میں جیسے ڈھور ڈنگروں کو مکانوں کے صحن یا کھلے میدانوں میں باندھا جاتا ہے۔ مجبور انسانوں کے ساتھ ان حیوانوں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ کوٹھڑی کی لو اور شدت گرمی سے تپی ہوئی دیوار سے ''دور رہو'' کی صدا آتی ہے۔ بے بس قیدی رات گئے اپنی دروازے کی سلاخیں پکڑ کر آسمان پر چمکتے ہوئے ٹھنڈے ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہے مگر دیکھ نہیں سکتا۔ پانی کے برتن پیاس بجھانے کے لیے اُبلا ہوا پانی پیش کرتے ہیں۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ ڈنگر ڈھور بھی گرمی کے موسم میں ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ پیاس کے باوجود گرم پانی کو منہ لگا کر چھوڑ دیتے ہیں مگر قیدی مجبور ہے کہ صبر سے کام لے، ہمارے جیل خانے یورپ کے ٹھنڈے علاقوں کی نقالی میں تعمیر ہوئے ہیں مگر ایک بار جیسے بن گئے ہیں۔ اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ کسی ایسے شخص کو جیل کا وزیر بنا دینا جس نے زندگی میں کبھی جیل کا مزا نہ چکھا ہو، ناانصافی اور غیر دانشمندانہ فعل ہے۔ جیل کی اصلاحی کمیٹیوں میں بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جو قید، قیدی اور جیل خانے کو باہر سے دیکھتے رہے ہیں۔ تب جیلوں کی اصلاح کیسے ممکن ہے؟ جیل خانوں کا اصلاحی کام ان لوگوں کے سپرد ہونا چاہیے، جن ''خوش نصیبوں'' نے سی کلاس کے مزے لُوٹے ہوں۔ یہاں مجھے مسلم لیگیوں کی قید کا زمانہ یاد آ گیا۔ اللہ اللہ دو تین اٹھوارے مزے سے جیل میں گزار کر یہ لوگ جب باہر آئے تو انہیں جیل کے ذکر اذکار سے فرصت نہ ملتی تھی۔ کافی دن میٹنگیں مارتے رہے۔ جس طرح شہرت پسند حاجی بات بات میں کبھی عدن کی بندرگار، کبھی جہاز میں قے کا قصہ، کبھی بازار میں کھجوریں دیکھیں تو احباب کو عرب کی کھجوروں کا قصیدہ کہہ سنایا۔ مطلب کھجوروں کی تعریف سے نہیں بلکہ اپنے حج کا تذکرہ مقصود ہوتا ہے تاکہ لوگ بلاتے وقت حاجی صاحب کہا کریں۔ ان مسلم لیگیوں کا بھی یہی حال تھا حالانکہ ان بیچاروں کو نہ قید کاٹنا پڑی اور نہ جیل کی وہ دال کھانا پڑی جو دس منٹ میں پانچ رنگ بدلتی ہے، نہ ان حضرات کو موسمِ گرما اور لُو کے تھپیڑوں سے پالا پڑا اور نہ ڈھور ڈنگروں کی طرح مدتوں کوٹھڑیوں میں بند ہونا پڑا۔ جیل گئے اور دروازے میں داخل ہوتے ہی پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے کہ کب واپسی کا موقع ملے گا۔ اب آپ غور

Marfat.com

فرمائیں کہ ان حضرات کو جیلوں کی اصلاح کا کیسے خیال آ سکتا تھا۔ خیال آئے بھی تو انہیں کیا معلوم کہ گرفتارانِ بلا پر کیا گزرتی ہے۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہم تینوں ساتھی اپنے صحن کی کیاریوں میں باغبانی اور کاشتکاری میں وقت گزار کر ورزش بھی کر لیا کرتے تھے۔ ہمیں بار ہا راولپنڈی سازش کیس کے جرنیلوں کا خیال آیا۔ ان میں ہمارے جانے پہچانے دوست بھی تھے۔ ہمیں سب سے زیادہ خیال کرنل فیض احمد فیض کا تھا۔ انہیں آپ کمیونسٹ کہیے یا کوئی اور رائے قائم کیجیے۔ وہ بہت اچھے دوست ہیں۔ شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ ہم نے انہیں خلیق، ہمدرد اور ملنسار پایا۔ مجھے وہ ایک بار ایسی جگہ ملے جب میں انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ تقسیم ملک کے بعد میں لدھیانہ کیمپ کا انچارج تھا۔ رات دن کیمپ کی حفاظت اور انتظام میں منہمک رہتا تھا۔ ہزاروں مجبور ہم وطن میرے ہر وقت کے ساتھی تھے باہر سے یعنی پاکستان سے نہ کوئی آتا تھا اور نہ کسی نے ہم سے آ کر کبھی دریافت کیا کہ جی رہے ہو یا مر گئے ہو۔ اچانک ایک دن معلوم ہوا کہ لاہور سے کچھ لوگ آئے ہیں وہ کیمپ کا معائنہ فرمائیں گے میں آٹے کی تقسیم سے فارغ ہوا ہی تھا کہ فیض صاحب بڑی بیتابی کے ساتھ مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ ہم دونوں کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔ ''تم کہاں''، بہرحال اس روز مجھے ان کی اچانک ملاقات نے بے حد متاثر کیا۔ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں فیض ایک مخلص، بہادر اور شریف انسان ہیں۔ فیض اسی جیل میں موجود تھے مگر بڑی سخت قدغن تھی۔ ہمیں ان کی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔ حالانکہ ہماری بیرک اور ان کی بیرک میں زیادہ فاصلہ نہ تھا مگر کسی نے سچ کہا ہے کہ دیوار پیچھے پردیس۔ ہم ایک دوسرے کے لیے واقعی پردیسی تھے۔

اچانک ملاقات

جس رات کراچی میں مجلسِ عمل کا جلسہ عام تھا۔ اس رات بڑا ہجوم تھا۔ ایسے ہجوم میں جیب تراشوں کو ہاتھ کی صفائی سے دہائی مچانے کا اچھا خاصا اطمینان بخش موقع میسر آ جاتا ہے۔ میری جیب میں چشمہ تھا، جس پر چمڑے کا خول تھا۔ جیب تراش نے سمجھا مال ہے۔ اس دھوکے میں مال کی بجائے وہ میری آنکھیں نکال کر لے گیا۔ جلسہ ختم ہوا۔ اونگھتے ٹھیلتے دفتر پہنچے تو دیکھا۔ چشمہ ندارد ہے۔ جیب تراش مال کے خیال میں اندھا ہو گیا اور میں چشمے کی محرومی سے نظر کھو بیٹھا۔ جیل میں چند ماہ گزر چکے تو ایک روز آئی جی صاحب نے جب وہ معائنے کے لیے تشریف لائے۔ مجھے فرمایا کہ مولوی صاحب آپ روزنامہ ''آزاد'' کے ایڈیٹر ہیں۔ قیدیوں کی اصلاح پر کچھ لکھیے۔ ہم اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ تب میں نے چشمے کی چوری اور اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ وہ فرمانے لگے۔ ہم آپ کو چشمے کا

Marfat.com

بندوبست کر دیتے ہیں چنانچہ باہر سے چشموں کے دوکاندار اور ڈاکٹر کو آنکھوں کے معائنے کے لیے بلایا گیا۔ اس عرصے میں جرنیلوں یعنی راولپنڈی سازش کیس کے بعض قیدیوں نے نظر کا نمبر درست کرانے اور نئے چشمے منگوانے کی درخواست کی۔ باہر سے معائنے کے لیے ڈاکٹر آ گیا۔ مجھے اطلاع دی گئی کہ کورٹ روم میں ڈاکٹر صاحب نے سیاہ پردے وغیرہ کا بندوبست کرلیا ہے۔ دوسرے قیدیوں نے بھی آنکھوں کا معائنہ کرانا ہے۔ آپ بھی چلیے، باری باری ڈاکٹر سب کا معائنہ کرے گا۔ میں اپنی وارڈ سے تیار ہوکر وارڈر کے ہمراہ کورٹ روم کے باہر جا کھڑا ہوا۔ کورٹ روم وارڈ کا وہ حصہ تھا۔ جہاں جرنیلوں کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ جیل والوں نے قیدیوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے کے لیے یہ بندوبست کیا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس ہر قیدی دس منٹ ٹھہرتا تھا جب ایک چلا جاتا۔ تب دوسرا آتا تھا مگر جب بعض قیدیوں پر زیادہ وقت لگ گیا تو نظام درہم برہم ہو گیا چنانچہ میری باری آئی۔ مجھے ڈاکٹر موٹے حروف کا بورڈ دکھا رہا تھا کہ ایک وارڈر کرنل فیض اور ان کے ایک اور ساتھی کو لے کر اندر آ گیا۔ جونہی میں نے بورڈ سے نظر ہٹائی۔ فیض میرے سامنے تھا۔ وہ مسکراتے میری طرف بڑھے اور بغل گیر ہوتے ہوئے کہنے لگے: ماسٹر صاحب آج بھی لدھیانہ کیمپ والی بات ہے۔ خوب ملاقات ہوئی، غرض یہ کہ میری آنکھوں کا چند منٹ دونوں طرح معائنہ ہوتا رہا۔ یہ اتفاقیہ ملاقات تھی۔ جسے وارڈر داروغہ اور ہم سب نے مل کر پی لیا۔ نہ وارڈر کہہ سکتا تھا کہ یہ لوگ اچانک ملاقات کرنے میں کامیاب ہوئے اور نہ داروغہ صاحب خبردار ہوئے کہ آنکھوں کے معائنے میں دو دلوں کا ملاپ بھی ہو گیا اور نہ ہم نے کانوں کان خبر ہونے دی کہ کیسا خوشگوار حادثہ پیش آیا۔ بہرحال پابندیوں کے باوجود اچانک ملاقات ہوگئی۔

دوسری ملاقات

خوراک کی خرابی کی وجہ سے ہم تینوں یعنی میرزے، مولانا لال حسین اختر اور نیاز لدھیانوی کے دانت خراب ہو گئے۔ جیل کے ڈاکٹر نے معذوری کا اظہار کیا تو افسرانِ جیل نے باہر سے دانتوں کے ماہر ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔ ہمارے علاوہ ہمارے جرنیلوں میں سے اکثر کو دانتوں کی شکایت تھی۔ اس لیے انہی کی بارک میں ڈاکٹر آ گیا اور ہمیں بھی وہیں بلا کر ڈاکٹری معائنے کے لیے پیش کیا گیا۔ اس میں پہنچے تو ہم سے پہلے جرنیل صاحبان بھی موجود تھے یعنی ہم سب ایک ہی جگہ جمع ہو کر ڈاکٹر کو دانت دکھاتے رہے۔ زبانوں پر تالے تو نہ تھے کہ ہم ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔ وقت کو غنیمت سمجھ کر باتیں بھی ہوتی رہیں۔ ایک فوجی جرنیل نے ہم سے کہا کہ مولوی صاحبان ہم آپ کی تحریک کے سخت مخالف تھے۔ ہم نے یہ رائے قائم کی تھی کہ آپ نے بلاوجہ مذہبی جھگڑا کھڑا کر کے ملک میں انتشار پھیلا رکھا

Marfat.com

ہے مگر اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ مرزائی کیا بلا ہیں۔ میجر جنرل نذیر صاحب قادیانی کے علاوہ اب جو ہم ان گواہوں پر غور کرتے ہیں جو ہمارے خلاف گزرے تو ہمیں مرزائیوں کے بارے میں اپنی رائے بدلنا پڑی۔ ہمیں اب معلوم ہوا کہ یہ گروہ پاکستان میں کس طرح کام کرتا ہے اور اس کے ارادے کیسے خطرناک ہیں۔ ہمیں ان جرنیلوں سے تبادلۂ خیال کرنے میں بے حد مسرت ہوئی ہماری معلومات میں اضافہ ہوا اور اس بارے میں ہمارا یقین اور پختہ ہو گیا کہ اُمتِ مرزائیہ ملک و ملت کے بارے میں نہایت خطرناک ارادے رکھتی ہے اور مرزائیت کے اثرات پاکستان کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر کے انتظار میں تقریباً ایک گھنٹہ اس بارک میں ٹھہرنا پڑا کیونکہ ڈاکٹر باری باری سب کو دیکھ رہا تھا۔ ہم بعد میں پہنچے تھے اس لیے ہماری باری سب سے بعد میں آئی۔

رمضان المبارک

جیل میں روزے رکھنے کا لطف آ جاتا ہے۔ 1920ء میں جب تحریک خلافت میں گرفتار ہو کر میانوالی جیل میں تھا۔ اُن دنوں بھی جیل میں رمضان گزارنے کا موقع ملا تھا۔ ابتداء میں جب سیاسی قیدیوں کے لیے کوئی کلاس نہ تھی۔ عام قیدیوں کا کھانا ملتا تھا۔ شام کو جو روٹی ملتی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد سوکھ جاتی تھی۔ ہم اس روٹی کو توڑ کر مٹی کے پیالے میں ڈال لیتے تھے پیالے میں پانی بھر دیتے تھے۔ سحری کے وقت بھیگے ہوئے ٹکرے نکال کر کھا لیتے تھے اور بچا ہوا پانی پی کر الحمدللہ کا ورد کرتے تھے مگر یقین جانیے کہ روزے رکھنے کا وہ لطف باہر رہ کر عمدہ کھانوں میں کبھی میسر نہیں آیا۔ قلب کو اطمینان حاصل تھا، زندگی میں ایک سکون تھا، دل مسرور تھا۔ صحت بھی اچھی تھی، شاید جوانی بھی سہارا دے رہی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ خیالات میں یکسوئی تھی۔ مقصد کے حصول میں خلوص اور دل کو یقین تھا کہ زندگی کا یہی حصہ قابلِ یاد اور باعثِ اطمینان ہے مگر اب وہ صحت نہیں ہے۔ البتہ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت میں دل بہت مطمئن تھا مگر جسم ساتھ نہیں دیتا تھا۔ شاید عمر کا تقاضا ہو۔ کہاں بیس پچیس برس کی جوانی اور کہاں ساٹھ پینسٹھ سال کا بڑھاپا، تاہم رمضان کا مہینہ بہت خوب گزرا۔ حیدرآباد جیل میں افسرانِ جیل نے رمضان المبارک کا بہت احترام کیا۔ کھانا ہمیں سحری کے وقت تازہ ملتا تھا مگر تھا وہی سی کلاس کا الم غلم۔ تاہم تازہ روٹی بہت غنیمت تھی۔ شام کو تمام قیدیوں کو برف بھی ملتی تھی۔ شربت کے لیے گڑ بھی مل جاتا تھا اور افطاری کے لیے کھجوریں ملتی تھیں یعنی قیدیوں کی عیش تھی۔ اس عیش میں ہم برابر کے شریک تھے۔ مولانا لال حسین اختر نمازِ تراویح پڑھاتے تھے۔ میں اور نیاز دو مقتدی تھے۔ نیاز ہمارا مؤذن تھا۔ نیاز کی آواز میں جوانی کی گھن گرج تھی۔ جیل کی ماڑی پر ایک وارڈر اذان دیا کرتا تھا بعض اوقات ایسا غلط مؤذن

Marfat.com

بھی آ جایا کرتا تھا جو اذان بھی غلط دے دیا کرتا تھا۔ اس غلطی پر مولانا لال حسین اختر صاحب بہت برہم ہوتے تھے اور اپنے وارڈروں کو بلا کر فرمایا کرتے تھے کہ اس بیوقوف کو بلا کر لاؤ۔ یہ اذان غلط کہتا ہے چنانچہ ہم نے جیل افسران سے کہا کہ ہمارا مؤذن حاضر ہے۔ نیاز صاحب کو اجازت دیجیے۔ یہ اذان دے آیا کریں گے۔ اس کی اذان سارے جیل میں سُنی جایا کرے گی شاید قریب کے علاقے والے بھی مستفیض ہو سکیں مگر افسرانِ جیل نے ہماری خدمت کو قبول نہیں کیا۔ بہر حال ماہ رمضان بخریت گزر گیا۔ عید آ گئی عید کے لیے ہم نے بڑے جتن کیے کہ کسی طرح عید کے دن تمام قیدیوں کو ایک احاطے میں نماز کی ادائیگی کا موقع مل جائے مگر مطالبے میں اس لیے جان نہ تھی کہ جیل میں نماز عید ہوتی نہیں۔ عید آزادیوں کی نعمت ہے۔ جیل مجبوریوں کی دنیا ہے۔ یہاں جمعہ اور عید کا گزر نہیں ہوتا۔ بمشکل یہ طے ہوا کہ کچھ اخلاقی قیدی ہماری وارڈ میں بھیج دیئے جائیں گے۔ تمام افسرانِ جیل اور چھوٹے ملازم بھی ہمارے ہاں آ جائیں گے۔ مولانا لال حسین اختر نے عید کا خطبہ دیا۔ نماز پڑھائی عید کے بعد ہم ایک دوسرے کے گلے ملتے رہے۔ ہمیں زیادہ افسوس اس بات کا ہوا کہ جرنیلوں تک کو عید کے دن ہم سے ملنے نہ دیا۔ اس بارے میں ہم نے افسرانِ جیل سے التجائیں بھی کیں مگر انہوں نے مجبوری کا اظہار کیا۔

ہمارا شریف انسپکٹر جنرل

مسٹر زیڈ۔ زیڈ احمد خدا انہیں خوش رکھے، بہت ہی بلند کریکٹر کے مسلمان ہیں۔ عید کے دن جب ہمارے بڑے بڑے افسر اپنے جیسوں سے ملنے کے عادی ہیں، کلبوں میں جاتے ہیں اور کوٹھیوں پر ماتحتوں کے سلام وصول کرتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل صاحب قیدیوں سے عید ملنے تشریف لے آئے۔ وہ دوسرے وارڈوں میں بھی گئے اور مسکراتے ہوئے جب ہمارے وارڈ میں تشریف لائے اور دور سے عید مبارک عید مبارک کہتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ ان کی بلند اخلاقی کا ہم پر بے حد اثر ہوا۔ انہیں ہم مجبور قیدیوں سے کیا لینا تھا؟ ہمارے دل میں اس وقت بھی یہی خیال آیا کہ یہ سب رسول مقبول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کا صدقہ ہے ورنہ کون پوچھتا ہے؟ قیدی تو قیدی ہوتا ہے اور پھر سی کلاس کے تھرڈ کلاس قیدی! عید کے دن شہر کے لوگ جیل کے قریب سے نہیں گزرتے مبادا ان کی خوشی پژمردہ ہو جائے اور مسرتوں پر اداسی چھا جائے۔ آپ شاید یہ خیال کرتے ہوں کہ ہمیں اپنے عزیز و اقارب یا دوست احباب کی یاد نے نہ ستایا ہوگا۔ آہ یہ بے بسی کے لمحے جس پر گزرتے ہیں وہی جانتا ہے۔ ہمیں بارہا خیال آیا کہ ہمارے دوست ہمارے اہل و عیال آج یقیناً اداس ہوں گے مگر ایک تصور اور ایک روح فرسا خیال آیا جس نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم نے شہیدوں کا خیال کیا۔ ان کے ورثا کے

Marfat.com

تصور نے ہمیں تڑپا دیا۔ وہ مائیں جن کے جوان بیٹے شہید ہو کر جنت کو سدھار گئے۔ آج کس حال میں ہوں گی، وہ یتیم بچے جن کے سہارے اُٹھ گئے، وہ جوان بیوائیں جن کے سہاگ لٹ گئے۔ ان خیالات کے ہجوم سے دل بیٹھنے لگا۔ تب قدرت نے ایک سہارا دیا اور وہ یہ خیال تھا کہ یہ سب کچھ تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کی خاطر ہوا اور اسی مبارک اور مقدس ''جرم'' کی پاداش میں آج ہم جیل میں بیٹھے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اپنی خوش نصیبی پر مطمئن ہو گئے۔ اس روز خواجہ ناظم الدین صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بھی عید منائی ہوگی۔ ان کے ضمیر نے انہیں کیا کہا ہوگا؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔ وہ ان بھیدوں اور غیب کے جاننے والا ہے۔ بہر حال قیدیوں اور نظر بندوں کی عید آئی اور گزر گئی۔

ہر چہ آید برسر فرزند آدم بگذرد

قیدیوں کی درجہ بندی

اسلامی مساوات کی روح کو کچلنے اور انسانیت کی تذلیل کی خاطر برطانوی دور میں جیل کے اندر 1920ء میں درجہ بندی کا آغاز ہوا۔ سیاسی رہنماؤں نے ٹھوکر کھائی اور اس خلافِ انسانیت فعل کو بطیبِ خاطر قبول کر لیا۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں کو درجہ بندی قبول کرنے کی بجائے قیدیوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور مساوات قائم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔

بہر حال درجہ بندی قائم ہو گئی اور اب وہ ایک مستقل صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہم سی کلاس میں وقت گزار ہی رہے تھے مگر افسرانِ جیل نے خود ہی محسوس کیا اور ہمیں درخواست لکھنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ ایک بار ہم درخواست کر بھی چکے تھے مگر ہماری درخواستوں کو حکومت وقت کا انتقامی جذبہ چاٹ گیا۔ اب اُن درخواستوں کا کھوج لگانا بھی مشکل تھا۔ بار بار درخواستیں کرنا اور وہ بھی ان لوگوں سے کہ جن سے ہم سخت بیزار تھے ہمیں گوارا نہ تھا۔ زیادہ اصرار ہوا تو ہم نے احتجاج کے طور پر بہتر سلوک کے لیے لکھا، جیل کے افسران نے بڑی ہمت سے کام لیا اور چند روز بعد کراچی سے بہتر کلاس کی منظوری آ گئی۔ اب ہمیں ملاقات اور خط لکھنے کی سہولت مل گئی۔ اخبار بھی صبح جلد مل جاتا تھا۔ جس سے ہم باہر کی دنیا کا اندازہ لگا کر سمجھ لیتے کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اب ہمیں کچھ کچھ معلوم ہونے لگا کہ ہمارے بعد ہمارے بھائیوں پر کیا گزری تھی۔ ایک جیل کے قیدی جب دوسری جیل میں جاتے ہیں، تب قیدیوں کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسری جیل کا کیا حال ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے معزز رفیق یعنی مولانا ابوالحسنات اور حضرت امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری صاحب اور دوسرے ساتھی کوٹری جیل میں ہیں مگر یہ خبر بعد میں غلط ثابت ہوئی پھر معلوم ہوا کہ انہیں سکھر جیل میں رکھا ہوا ہے۔ بھوپت سکھر جیل

Marfat.com

میں بھی رہ آیا تھا۔اس نے بتایا کہ سکھر جیل کی جس بارک میں وہ رہتا تھا۔اس میں سخت گرمی ہوتی ہے۔ کمرہ سیمنٹ شدہ ہے۔لُو سے اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ دیوار کے قریب بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے رفقاء کو اسی بارک میں رکھا گیا تھا۔اس کا صحن بھی بہت چھوٹا تھا۔بہر حال اس مجبوری میں صبر کے سوا چارہ کیا تھا؟ ابھی چند روز گزرے ہوں گے کہ ایک روز ''ڈان'' میں یہ خبر شائع ہوئی۔کہ انکوائری کورٹ کا بندوبست ہو گیا ہے۔چیف جسٹس پنجاب کی سرکردگی میں فسادات پنجاب کی تحقیقات ہوئی۔یہ خبر 2 جون کے ڈان میں شائع ہوئی۔دو دن بعد ''ڈان'' میں ایک اور خبر شائع ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ لاہور جا رہے ہیں۔اس خبر سے ہمارا ماتھا ٹھنکا جیل میں ہم تینوں نظر بند آپس میں مشورہ کر لیتے تھے۔کوئی اور مشیر تو تھا نہیں، ہمیں یہ خیال گزرا کہ سر ظفر اللہ خان کا ٹھیک اس وقت لاہور جانا جبکہ تحقیقاتی کمیٹی کا اعلان ہوا ہے، خطرے کا باعث ہے۔ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ حیثیت سے تحقیقات کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرے۔ہمارے تمام ساتھی جیل میں ہیں۔باہر مرزائی بھی کھلے بندوں دندنا رہے ہیں اور حکومت پنجاب جو ہماری رائے میں خون خرابے کی ذمہ دار تھی وہ بھی بحیثیت حکومت موجود ہے۔ہمارے برخلاف خدا جانے کیا کچھ کیا جائے۔ہمیں اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ مگر اس مجبوری میں ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔بڑی ردوکد کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میں بحیثیت صدر مجلسِ احرار اسلام چیف جسٹس محمد منیر صاحب جو تحقیقاتی کمیشن کے صدر بھی تھے، کے نام ایک عرضداشت بھیجوں چنانچہ میں نے ایک درخواست لکھی اور جیل کی معرفت اسے چیف جسٹس صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیا۔یہ درخواست تحقیقاتی عدالت کے ریکارڈ میں اب بھی موجود ہوگی۔اس درخواست کا مفہوم یہ تھا کہ عین اس وقت جبکہ تحقیقاتی عدالت کا اعلان ہوا ہے۔سر ظفر اللہ خان کا فوراً لاہور پہنچنا ہمارے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ہمیں معلوم نہیں کہ وہ ایسے وقت میں لاہور کیوں جا رہے ہیں؟ ہم کو یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ ہم ان سے یہ کہیں کہ آپ تحقیقات کے دوران لاہور تشریف نہ لے جائیں اور نہ ہم انہیں روکنے کے مجاز ہیں مگر ان کی شخصیت اور حیثیت کے رعب کی وجہ سے خدشہ ضرور لاحق ہے۔عدالت پر ہمیں پورا بھروسہ ہے۔(ہماری درخواست کا تقریباً یہی مفہوم تھا۔)

عدالت کا نوٹس

میرے نام تحقیقاتی عدالت کی جانب سے اُس کا مراسلہ حکام جیل کی معرفت موصول ہوا کہ مجھے بحیثیت صدر مجلس احرار اسلام ایک فریق شمار کیا گیا ہے۔مجھ سے عدالت نے دریافت کیا کہ تمہیں ایک

Marfat.com

فریق بننا منظور ہوتو عدالت کو مطلع کرو۔ میں چیف جسٹس صاحب کے نام خط لکھنے ہی والا تھا کہ ''ڈان'' میں ایک اور خبر شائع ہوئی اور وہ یہ تھی کہ حکومتِ پنجاب نے مجلسِ احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دے کر مجلسِ احرار کے تمام دفاتر کو ضبط کر کے ان پر تالے ڈال دیئے ہیں۔ مجھے اس خبر سے سخت صدمہ ہوا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حکومتِ پنجاب سکھا شاہی کا ریکارڈ مات کر دینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ میں نے حکومتِ پنجاب کے اس اقدام کے خلاف چیف جسٹس صاحب کی خدمت میں دوسری عرضداشت لکھ کر بھیجی۔ جس میں لکھا کہ آپ نے اپنے اطلاع نامہ میں مجھ سے یہ دریافت فرمایا ہے کہ آیا مجھے تحقیقاتی عدالت کے سامنے بحیثیت فریق حاضر ہونا منظور ہے۔ جواباً عرض ہے کہ مجھے اپنے صوبے کی سب سے بڑی عدالت کے سب سے بڑے جج اور ان کے معزز ساتھی پر مکمل اعتماد ہے اور میں بحیثیت فریق حاضری کے لیے آمادہ ہوں مگر میں تو حیدر آباد سنٹرل جیل میں نظر بند ہوں۔ اپنے صوبے سے سینکڑوں میل دور بے بسی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں اس تحقیقات میں کس طرح حصہ لے سکوں گا؟ آپ نے جہاں مجھے ایک فریق قرار دیا ہے۔ وہاں آپ نے قادیانیوں، لاہوری مرزائیوں، مجلسِ عمل اور حکومت پنجاب کو بھی بحیثیت فریق پیش ہونے کا موقع دیا ہے۔ میری دانست میں حکومتِ پنجاب کی حیثیت آپ کی تحقیقاتی عدالت کے روبرو حکومت کی نہیں بلکہ ایک فریق کی ہے اگر میں نے صحیح سمجھا ہے تو میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ جب آپ نے اعلان فرما دیا کہ فساداتِ پنجاب کی تحقیقات ہوگی اور یہ کہ آپ اور آپ کے معزز ساتھی جناب ایم آر کیانی جج ہائی کورٹ بحیثیت تحقیقاتی عدالت کام کریں گے، تب ہم سے کسی کو خواہ وہ احرار سے متعلق ہوں یا قادیانی ہوں یا حکومتِ پنجاب، کسی فریق کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ تحقیقات کے دوران دوسرے فریق کو انصاف حاصل کرنے کی راہ میں مشکلات پیدا کرے۔ حکومتِ پنجاب نے، جو تحقیقات میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجلس احرار پر دوران تحقیقات حملہ کر کے احرار کے خلاف ہراس پیدا کیا ہے۔ اس کے دفاتر پر قبضہ کر کے تالے ڈال دیئے ہیں۔ اس طرح انصاف حاصل کرنے کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنی عرضداشت میں یہ بھی لکھا تھا کہ حکومت پنجاب کے اس نامناسب اقدام سے تحقیقاتی عدالت کی توہین بھی ہوتی ہے مگر میں کوئی قانون دان نہیں اور نہ یہاں میرا کوئی قانونی مشیر موجود ہے۔ تاہم میں فریادی ہوں۔ مجلس احرار کے ساتھ حکومتِ پنجاب نے ناانصافی اور زیادتی کی ہے۔

اس مفہوم کی ایک عرضداشت جناب محمد منیر صاحب چیف جسٹس جج ہائی کورٹ کے نام ارسال کر کے میں اس انتظار میں تھا کہ شاید اسی جیل میں معزز و محترم جج صاحبان کی جانب سے مجھے کوئی تسلی بخش

Marfat.com

جواب موصول ہو گا کیونکہ مجھے تحقیقاتی عدالت نے ایک فریق تصور فرمایا ہے۔ وقت گزرتا گیا اور اچانک ایک روز جیل کے داروغہ صاحب نے اپنا اردلی بھیجا کہ اسباب باندھ کر تیار رہو۔ آپ کو لاہور بھیجا جا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میری دوسری عرضداشت پر جج صاحبان نے حکم صادر فرمایا۔ میری حیدرآباد جیل سے لاہور سنٹرل جیل کی روانگی ان کے حکم کے ماتحت ہو رہی ہے۔ اب میں اپنے عزیز ساتھیوں کو تنہا چھوڑ کر جا رہا تھا، مجھے لاہور آنے اور اپنے بچھڑے ہوئے معزز رفقاء سے ملنے کی خوشی بھی تھی۔ لاہور یوں بھی میرا گھر ہے مگر جب میں اپنی دو عزیز ساتھیوں کی جانب دیکھتا تو میرا دل بیٹھتا تھا۔ میں نے جیل کے افسران سے درخواست کی کہ میرے ان دو ساتھیوں کو دوسرے بی کلاس قیدیوں کے پاس بھیج دیجیے۔ میں ہی خطرناک نظر بند تھا جو اس محفل سے اُٹھ رہا ہوں۔ اب ان دو نظر بندوں پر اس قدر عتاب احتیاط اور پابندی کی کیا ضرورت تھی؟ میری یہ درخواست زیر غور فہرست میں رکھ لی گئی۔ دوسرے دن مجھے حکم ہوا کہ پولیس ڈیوڑھی پر آ گئی ہے۔ ڈیوڑھی پر چلیے۔ میں نے بڑی حسرت سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور خدا حافظ کہتے ہوئے ان سے جُدا ہوا۔ جیل کے دروازے پر ایک تھانیدار اور دو حوالدار اور سپاہی موجود تھے۔ قیدی اگر خود شرافت کا ثبوت پہنچائے تو وارڈر اور پولیس والوں کا دماغ نہیں چل گیا کہ وہ بدسلوکی کریں۔ بعض پولیس والے دماغی طور پر ناکارہ ہوتے ہیں مگر ایسے بہت کم ہوتے ہیں، میری طبیعت میں یوں بھی بہت نرمی ہے۔ میں جگہ جگہ لڑنا بیوقوفی سمجھتا ہوں۔ ایک جگہ دل کھول کر لڑ لینا چاہیے۔ قدم قدم پر ہر شخص سے الجھنے والا بڑا خراب ہوتا ہے۔ مجھے نہایت آرام سے لاہور لایا گیا۔ دوسرے دن لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو بھولی بسری یاد تازہ ہو گئی۔ پولیس والوں کو جیل کا راستہ معلوم نہ تھا۔ میں انہیں دہلی دروازے کی طرف سے لا سکتا تھا۔ وہ مجھ سے دریافت کرتے تھے کہ جیل کس راستے سے جانا ہو گا۔ میں نے انہیں اوپر کا راستہ بتایا اور خود ہی کہا کہ شہر کے اندر لے جاؤ گے تو بڑی مشکل کا سامنا ہو گا۔ مجھے سب لوگ جانتے ہیں بڑا بدنام شخص ہوں۔ سنسان راہوں سے رندوں قبرستان تک لے چلو، جیل کے دروازے پر پہنچے تو پہلے سے اطلاع ہو چکی تھی، ڈیوڑھی ہماری دیکھی بھالی تھی۔ افسر نئے تھے مگر تھے بہت بھلے، دفتر میں مہر صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل موجود تھے۔ وہ اخلاق سے پیش آئے۔ لسی پلائی اور حکم ہوا کہ دیوانی گھر میں ڈیرہ لگائیے۔ میں نے کہا کہ مجھے تو فوجداری میں پکڑا گیا ہے۔ دیوانی گھر کے کیا معنی؟ وہ ہنس کر مسکرانے لگے، وہاں پہنچو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ دیوانی گھر میں کیوں بھیجے جا رہے ہو۔ اچھا بھئی لے چلو اسباب اٹھوا کر اندر پہنچے۔ جونہی دیوانی گھر کا باہر کا دروازہ کھلا۔ میں بلند قہقہوں اور مسرتوں کے ہجوم میں کھو گیا۔ مولانا ابوالحسنات،

Marfat.com

حضرت سید عطا اللہ شاہ بخاری صاحب، صاحبزادہ سید فیض الحسن، شیخ حسام الدین، غرض یہ کہ جدھر نگاہ اٹھتی تھی دوست احباب اور غمگسار نظر آتے تھے۔ دیوانی احاطے میں مکانیت تو بہت کم ہے صرف دو بڑے کمرے مگر صحن بہت کھلا تھا۔ باغیچہ، کیاریاں، درخت، پھول پھلواری، اس پر لطف یہ کہ یہاں جو معزز ہستیاں موجود تھیں، وہ باغ و بہار اور ایمان کو تازہ کرنے والی خوش خلق اور محبوب ہستیاں تھیں۔ ایک بار تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور میں سندھ کی دور اُفتادہ جیل میں موجود ہوں گا۔ آہستہ آہستہ جب باتیں شروع ہوئیں تو مجھے یقین آ گیا کہ واقعی میں لاہور آ گیا ہوں۔ طبیعت میں سکون اور اطمینان پیدا ہو گیا۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے بعد ہمارے بھائیوں پر لاہور میں کیا قیامت برپا ہوئی۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی مولانا ابوالحسنات صاحب کے فرزند ارجمند سید خلیل احمد سے مل کر ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں جونہی دیوانی گھر میں داخل ہوا۔ خلیل صاحب دوڑ کر مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ وہ دیوانی گھر میں نہ رہتے تھے بلکہ انہیں دوسرے وارڈ میں رکھا ہوا تھا۔ اس روز وہ اپنے والد صاحب سے ملاقات کے لیے اجازت لے کر دیوانی گھر آئے ہوئے تھے۔ سیدھے سادھے نیک دل نوجوان، مسکراتے اور ہنستے رہے۔ میں فوراً معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ ان پر کیا گزری مگر ہر قیدی اور ہر نظر بند کے سینے میں طویل اور دردناک داستانیں محفوظ تھیں۔ چند منٹوں میں وہ کیا کچھ بتائیں اور کیا باقی دارد کے لیے اٹھا رکھیں بہرحال ان سے یہ معلوم تو ہوا کہ وہ سات سال کے لیے جیل میں بند کر دیئے گئے ہیں۔ جب خلیل صاحب نے سات سال قید کی خبر سنائی تو میں نے حسبِ عادت اور حسب یقین عرض کیا ارے میاں کیسے سات سال! آج نہیں تو کل رہا ہو جاؤ گے۔ یہ حکومت چار دن کی مہمان ہے۔ یہ ہمیں اندر بند رکھ کر کتنے دن جیئے گی؟ میری اس بات پر بعض دوستوں نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ بڑے خوش فہم ہو۔ بعض نے حسبِ منشاء بات سنی تو کہا انشاء اللہ، ثم انشاء اللہ۔ یہاں میں ایک بات عرض کروں۔ پرانا قیدی ہوں۔ نشیب و فراز سے گزرا ہوں۔ ایسا بہادر بھی نہیں ہوں کہ ڈینگیں مار سکوں اور نہ ایسا بزدل ہوں کہ جیل میں بیٹھ کر رونے لگوں اور کہوں کہ ہائے میں کہاں آ گیا ہوں۔ اب کیا ہوگا؟

مصیبت کے دن کس طرح گزرتے ہیں؟

اعرابی کا اونٹ موسم بہار میں دبلا ہو جایا کرتا تھا اور جب خزاں کا دور شروع ہوتا وہ موٹا ہونے لگتا۔ اعرابی حیران ہوتا تھا کہ میرا اونٹ عجیب الخلقت ہے۔ اس نے سوچا شاید اسی اونٹ کے بارے میں پروردگار نے کَیْفَ خُلِقَتْ فرمایا ہے۔ کہتے ہیں کہ اعرابی نے اونٹ سے دریافت کیا کہ تیرا کیا حال

Marfat.com

ہے تو موسم بہار میں دبلا ہو جاتا ہے حالانکہ تجھے ان دنوں خوب موٹا تازہ ہو جانا چاہیے مگر اس کے برعکس موسم خزاں میں جب پت جھڑ کا موسم ہوتا ہے۔ خوراک نایاب ہو جاتی ہے تیری کیفیت بالکل دگرگوں ہوتی ہے تو موٹا ہونے لگتا ہے۔ بتا تو سہی کہ ماجرا کیا ہے؟ اونٹ کو اللہ نے زبان دے دی وہ گویا ہوا اور کہنے لگا کہ میرے آقا اصل حقیقت یہ ہے کہ موسم بہار میں اس دھڑکے سے دبلا ہو جاتا ہوں کہ بہار کے پیچھے خزاں آ رہی ہے اور موسم خزاں میں اس امید پر موٹا ہو جاتا ہوں کہ خزاں چار دن بعد ختم ہو جائے گی اس کے پیچھے بہار جھومتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔

مجھے جب بھی جیل کی کوٹھڑی میں مایوسیوں نے گھیرا میں نے فوراً اعرابی کے اونٹ سے سبق لیا اور مصیبت کو ہمیشہ اللہ کے بھروسے پر برداشت کر لیا۔ بُرا وقت اسی تصور میں گزارا کہ میں انشاء اللہ ایک روز عزت و آبرو سے باہر آ جاؤں گا مجھ پر کوئی پابندی نہ ہوگی دوست احباب سے ملوں گا۔ ہر چند ایک خواب ہے جو رہائی کے دن ٹوٹ جائے گا صرف یاد باقی رہے گی اور مصیبتیں کٹ جائیں گی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں بڑا خوش فہم ہوں مگر آپ میری خوش فہمی پر غائر نگاہ ڈال کر دیکھیں تو شاید آپ اسے پسند فرمائیں گے اور بہت مفید پائیں گے۔ کم از کم یہ تو آپ ضرور تسلیم کریں گے کہ خوش فہمی میں وقت خوب گزرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ دوسرے انداز میں سوچنا شروع کر دیں کہ بھئی بہت بُرے پھنسے۔ خدا جانے اب ہمارا کیا حشر ہو۔ دیکھیں ہمیں چھوڑتے ہیں یا عمر بھر اندر ہی رکھیں گے۔ ہم مریں گے یا زندہ رہیں گے، الٰہی اب کیا ہوگا!

فرمائیے ان خیالات سے کیا فائدہ؟ خدا کیوں مجبور ہے کہ اپنا بھید آپ کو بتائے۔ مفت کی پریشانی، صحت کی بربادی، دل و دماغ کی کوفت جو دیکھے وہ بھی مرجھا جائے۔ میں نے جیل کے دروازے میں قدم رکھتے ہی ہمیشہ فکرمندی کی کتاب کو تہہ کر کے رکھ دیا۔ جو ہونا ہے، وہ ضرور ہوگا ہو کے رہے گا اور جو نہیں ہونا وہ ہو نہیں سکتا۔ پھر کیا یہ مناسب نہیں کہ طوفان کی آغوش میں آئی ہوئی کشتی کے چپوؤں اور تیوار کو کھول کر کشتی میں رکھ دیا جائے اور کشتی خدا پر چھوڑ دی جائے۔

عرض یہ کر رہا تھا کہ میں احباب کی بھری محفل میں دوبارہ حاضر ہو گیا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ساری جیل تحریک تحفظ ختم نبوت کے پروانوں سے بھری پڑی ہے۔ کہیں کہیں پروانوں میں مکھیاں بھی بھنبھناتی نظر آئیں۔ بہر حال جدھر آنکھ اٹھتی، اپنے ہی اپنے نظر آتے۔ اب مجھے موقع ملا کہ میں دریافت کروں لاہور والوں پر کیا گزری؟

Marfat.com

جیل کے ساتھی

ہمارے سینکڑوں ساتھی لاہور سنٹرل جیل میں موجود تھے۔ دیوانی گھر تحفظ ختم نبوت کے رہنماؤں کا مرکز تھا۔ دوسرے وارڈروں میں ہمارے بہادر رفیق اور جانباز رضا کار محبوس تھے۔ ایک وارڈ میں مولانا عبدالستار خان نیازی کے ہمراہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفیق موجود تھے۔ اسی وارڈ میں سید خلیل احمد خلف الرشید حضرت مولانا ابوالحسنات سات سال کی قید کاٹ رہے تھے۔ مولانا عبدالستار خان نیازی کی بڑی دھوم اور شہرت تھی ہمارے دل میں بھی یہ خواہش موجزن تھی کہ مولانا نیازی سے ملاقات کی جائے مگر انہیں ہم سے بہت دور رکھا ہوا تھا۔ تحریک کے قیدیوں اور نظر بندوں کے علاوہ راولپنڈی سازش کیس کے تین جرنیل بھی سپیشل وارڈ میں بند تھے مگر مرزائی انسپکٹر جنرل کی عقابی نگاہیں ہر وقت تحریک کے اسیروں کی تاک میں تھیں۔ ان کی جانب سے ہر ممکن تنگی کا مظاہرہ تھا۔ ہم نے اپنے رفیقوں کی زبانی سنا کہ ابتداء میں تو جیل میں انتہائی مصیبت کا سامنا ہوا مگر آہستہ آہستہ حالات بدلتے گئے۔

لاہور کے حالات

ہماری نادان حکومت نے جب ہم سب کو بیک وقت کراچی میں گرفتار کر لیا تو لاہور میں جو اس تحریک کا مرکزی مقام تھا۔ جذبات کی آندھی چلی۔ لوگوں کو سخت صدمہ ہوا۔ اب انہیں کوئی سنبھالنے والا موجود نہ تھا۔ مولانا ابوالحسنات صاحب لاہور سے کراچی جانے لگے تو وہ اسی جذبے کے تحت گئے تھے کہ انہیں یا تو حکومت کو منا لینا ہے یا ناکام واپس نہیں لوٹنا ہے۔ اس ارادے سے رخت سفر باندھتے وقت انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے خلیل احمد صاحب کو جو اس وقت طبیہ کالج میں زیر تعلیم تھے فرمایا کہ بیٹا اب تم میرے گھر کو سنبھالنا۔ گھر تو سنبھالنے کا مطلب بہت وسیع تھا اور خلیل صاحب نے وسعتِ قلبی سے کام لیا۔ لوگوں کا ہجوم بڑی مساجد اور بازاروں کا چکر کاٹتا پھرتا تھا۔ شہروں میں عام طور پر اس خبر سے ہڑتالیں ہوئیں۔ حکومت کے خلاف سخت مظاہرے ہوئے، خلیل احمد صاحب نے لفظ گھر سے مراد خانہ خدا سمجھا اور سیدھے مسجد وزیر خان پہنچے۔ وہ کبھی سٹیج پر تشریف نہ لائے تھے اور نہ انہیں کبھی تقریر کرنے کا موقع ملا تھا۔ انہیں خود بھی یہی خیال تھا کہ وہ تقریر نہ کر سکیں گے مگر جب وہ مسجد وزیر خان میں پہنچے تو ہجوم نے تکبیر کے نعروں اور زندہ باد کے نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ مولانا ابوالحسنات سے مسلمانوں کو جو عقیدت تھی وہ سب پر ظاہر ہے۔ ان کی عدم موجودگی اور گرفتاری کے بعد ان کے صاحبزادے سے جس

Marfat.com

عقیدت اور محبت کے جذبات کا اظہار ہوسکتا تھا، اس کا اندازہ اِسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ یہاں اب کوئی معزز نہیں ہے اور نہ انہیں یہ امید تھی کہ جلسہ ہو سکے گا مگر مسجد وزیر خان میں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ صحن کے علاوہ برآمدوں کی چھتیں تک لوگوں سے کھچا کھچ بھر گئیں۔

خلیل صاحب میدان میں اتر آئے

خلیل صاحب ہچکچاتے ہوئے اس منبر میں تشریف لائے، جہاں ان کے والد خطبہ دیتے تھے۔ سیدزادے نے اللہ کا نام لے کر لوگوں کو خطاب کرنا شروع کیا تو لوگ حیران تھے کہ یہ کون بول رہا ہے۔ ان کو تو کبھی تقریر کرتے نہیں سنا۔ یہ تو مسلسل اور بے تکان بول رہے ہیں اور وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو لوگ سننا چاہتے ہیں تقریر کے بعد خلیل صاحب خود بھی حیران تھے کہ یہ کیسے ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ دل کو لگی ہو، دل میں خلوص ہو تو زبان پر جو کچھ آتا ہے وہ لوگوں کے کانوں کی راہ سے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

کام چل نکلا، مسجد وزیر خان میں جلسے پر جلسہ ہونے لگا۔ اب سارے شہر کا رخ مسجد وزیر خان کی جانب تھا۔ باہر سے مجاہدین کے جو قافلے آتے تھے۔ وہ بھی سیدھے مسجد وزیر خان کا رُخ کرتے تھے۔ خلیل احمد صاحب کے ہمراہ احرار کے کارکن، سالار اور رضا کار ہر وقت موجود تھے۔ مسلمانوں میں عام جوش تھا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سمجھدار ہونے کے باوجود خلیل صاحب ناتجربہ کار تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ تحریکات میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اس کی راہیں کتنی پُر پیچ اور خطرناک ہوتی ہیں مگر اس ناتجربہ کاری میں ان کا خلوص اور شخصیت کام کر گئی اور مسجد وزیر خان جو حضرت مولانا ابوالحسنات مدظلہ کا ہیڈ کوارٹر تھا، تحریک ختم نبوت کا ایسا مرکز بن گئی کہ جس کے خلاف حکومت وقت کو خطرناک منصوبہ بندی سے کام لینا پڑا۔

متضاد خواہشات کا تصادم

مجلسِ عمل نے ابتداء ہی سے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ تحریک کی کامیابی کا انحصار پرامن ذرائع اور قیامِ امن پر موقوف ہے چنانچہ مجلسِ عمل کی جس قدر بھی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ اُن میں ہر مقرر نے عوام کو سمجھایا کہ فسادانگیزی اور بدامنی تحریک کی ناکامی کا باعث ہوگی جو شخص بھی بدامنی اور فسادانگیزی کی بات کرتا ہے، وہ ہمارا نہیں بلکہ مرزائیوں کا ممد و معاون ہے اور اس مقدس تحریک کا دشمن ہے۔ اس

Marfat.com

بات کو اس طرح عوام کے ذہن نشین کرایا گیا کہ انہیں ہر خطرے سے کما حقہ، خبردار کر دیا گیا۔ ہم سب دل سے چاہتے تھے کہ عوام بہر حال پر امن رہیں۔ حکومت غلطی کرے یا مرزائی اشتعال انگیزی سے کام لیں۔ عوام کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے اور بردباری کا ثبوت دینا چاہیے، چنانچہ جب پنجاب میں پروگرام زیر غور تھا تو مجلس عمل کے سامنے یہ سوال بھی آیا کہ کراچی جانے کی کیا ضرورت ہے، ہم مرکز سے اپنے جائز مطالبات منوانے کی بجائے ربوہ ہی کے سوال پر فیصلہ کیوں نہ کر لیں۔ اس ریاست کے اندر ریاست بنانے کے کیا معنی؟ ہم یہ بات کیوں نہ کریں کہ یہ ہمارا ملک ہے اسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ اس ملک میں اسلام کے مخالفوں اور ختم نبوت کے منکروں کو علیحدہ ریاست بنانے کا کیا حق ہے۔ ہم ربوہ میں مسلمانوں کو آباد کریں گے اور ہمارے جتھے ربوہ جانے چاہئیں۔ ہزارہا مسلمان جتھوں کی شکل میں ربوہ کی طرف مارچ کریں۔ گولی چلے خواہ کچھ بھی ہو۔ ہم آگے بڑھتے جائیں اور ربوہ پر مسلمانوں کا قبضہ کرا دیں۔ جذباتی قوم کے لیے یہ پروگرام کس قدر دل پسند ہو سکتا تھا اور اس یورش کے لیے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو آمادہ کر لینا کتنا آسان تھا مگر اس تجویز کو مضحکہ خیز، نامعقول اور تباہ کن قرار دیا گیا اور اسے رد کرتے وقت یہی بنیادی بات کہی گئی کہ ایسا کرنا قانوناً، اخلاقاً اور مصلحتاً بالکل غلط ہے۔ فرض کیجیے کہ لاہور سے ایک جتھا اس غرض کے لیے روانہ کیا جائے تو حکومت اس جتھے کو روکنے میں حق بجانب ہوگی وہ کہہ سکتی ہے کہ یہ لوگ دوسرے کے گھر پر یورش کر رہے ہیں۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو کہ گھر کس کا ہے؟ حکومت جتھے روکنے میں حق بجانب ہوگی۔ روکتے وقت حکومت کسی اپنے آدمی کو جتھے میں بھیج کر پولیس پر ایک کنکر پھینکوا، گولی کا جواز نکل آئے گا اور حکومت کہے گی کہ یہ دیکھ لیجیے۔ جتھے والوں نے پتھراؤ کیا۔ یہ دیکھیے کانسٹیبل کا ماتھا لہولہان ہو چکا ہے۔ اسے ہسپتال بھیجا جا رہا ہے۔ ایسے امن شکن گروہ پر گولی نہ چلاتے تو کیا کرتے؟ گولی چلنے کے بعد مسلمان مشتعل ہو جاتے، شہیدوں کی لاشیں مانگنے کے لیے ہجوم ہو جاتا، اسی ہجوم میں حکومت ہی کے آدمی لوگوں کو اُکساتے اور کہتے کہ بزدلو دیکھ رہے ہو، ان ظالموں نے بے گناہوں کو خون میں تڑپا دیا۔ آگے بڑھو اور کوتوالی پر دھاوا بول دو۔ اس صورت حال میں نیا شاخسانہ کھڑا ہو جاتا۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس قسم کی وضاحت کے بعد ربوہ والی تجویز ختم ہو گئی۔ مطلب یہ کہ مجلسِ عمل کو بدامنی ہرگز منظور نہ تھی۔ اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ امن بحال رہے اور تحریک پر امن طریقے سے چلائی جائے۔ جس میں بدامنی کا قطعی اندیشہ نہ ہو۔ قارئین کرام بھولے نہ ہوں گے۔ جب جماعت اسلامی کے نمائندے نے پانچ رضا کاروں کے جتھے کو بارونق بازاروں سے گزارنے کا مشورہ دیا تو مجلس عمل کے

Marfat.com

ذمہ دارلوگوں نے جن کا دل و دماغ اس بارے میں بالکل صاف تھا، فوراً کہا کہ اس طریقِ کار سے بدامنی کا اندیشہ ہے لہٰذا یہ تجویز اسی وقت رد ہوگئی تھی۔

مگر مرزائیوں اور حکومتِ وقت کا اندازِ فکر ہم سے بالکل مختلف تھا۔ جب تک بدامنی اور اشتعال انگیزی نہ ہو جائے اُن کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ مگر اس کے باوجود کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ مجلسِ عمل کے رہنماؤں کی ہدایت پر اہل لاہور نے انتہائی بردباری اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا یا نہیں کیا؟

لاہور میں حالات کی رفتار

26 فروری 1953ء کو چودھری معراج دین سالار اعلیٰ مجلس احرار اسلام کی نگرانی میں رضا کاروں کی بھرتی کے لیے باغ بیرون دہلی دروازہ میں کیمپ کھول دیا گیا۔ بھرتی کا اطلاق ہوتے ہی پنجاب کے گوشے گوشے سے لوگ بکثرت آنے لگے۔ کیمپ کے دروازے پر فدایانِ ختمِ نبوت کا ہجوم رہتا تھا۔ لوگ آتے تھے اور نام درج کرا کے واپس ہو جاتے تھے۔ 27 فروری بروز جمعہ بیرون جات سے شمع رسالت کے پروانوں کا بے پناہ ہجوم رضا کاروں میں بھرتی ہونے اور نام لکھانے کے لیے آ موجود رہا۔ چودھری معراج الدین اور ان کے نائبین نے بڑی مستعدی سے انہیں سنبھالا اور کارکنوں کو ہدایت کی کہ آج جمعہ ہے، اندراج کا کام جلدی جلدی ختم کرو، ابھی یہ کام تیزی سے جاری تھا کہ مجلسِ عمل کے تمام رہنماؤں کی کراچی میں گرفتاری کی اطلاع کی خبر آئی۔ گرفتاری کی خبر نے جذبات کی بھڑکی ہوئی آگ پر تیل کا کام دیا اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح منٹوں میں شہر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ اسی وقت رضا کارانِ احرار نے شہر کی تقریباً تمام مساجد میں یہ اطلاع پہنچا دی اور خطیب حضرات اور ائمۂ مساجد سے مجلسِ عمل کی جانب سے یہ درخواست کی کہ وہ لوگوں کو پرامن رہنے اور صبر و تحمل سے کام لینے کی سخت تاکید فرمائیں۔ حکومت کے اس نامناسب اور غیر دانشمندانہ فعل سے مسلمان بھڑک اٹھے ہیں اور وہ سخت ناراضی اور برہمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ حضرات عوام کو پرامن رہنے کی تلقین کریں۔ لاہور ایسا شہر ہے کہ جس کا فیصلہ سارے ملک کو متاثر کرتا ہے۔ اگر لاہور کسی تحریک کو قبول نہیں کرتا تو سیاستدانوں کی یہ رائے ہے اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ وہ تحریک کبھی پروان نہیں چڑھتی اور اگر لاہور کسی تحریک کو اپنا لے تو اس کی کامیابی میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لاہور کے عوام جب کچھ کرنے پر آ جائیں تو بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی لاہور والوں کو آگے چلنے سے روک نہیں سکتی۔ لاہور نے تحریک کو دل میں جگہ دی۔ یہ تحریک خود اپنے اندر اتنی کشش رکھتی تھی کہ

Marfat.com

مخالف بھی یا تو دم بخود تھا یا رائے بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ میرا یہ یقین ہے کہ حبیب کبریا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور حضور کے نام کی برکت سے فضا اس قدر سازگار تھی کہ اس مقدس تحریک کو چلانے کے لیے محنت یا زیادہ پراپیگنڈہ کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ تحریک کو سنبھالنا اور پرامن رکھنا بے حد ضروری تھا۔ جونہی ہمیں کراچی میں گرفتار کیا گیا اور یہ اطلاع لاہور پہنچی۔ لاہور آتش زیر پا ہو گیا۔ سارے شہر میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ دوسرے شہروں نے لاہور ہی کی طرح صدمہ محسوس کیا اور حکومت کی اس نادانی کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا۔ گوجرنوالہ اور سیالکوٹ چونکہ ملحقہ اضلاع ہیں اس لیے ان دونوں شہروں میں جذبات زیادہ برانگیختہ تھے۔ بہرحال حکومت وقت کے نامناسب اور غیر دانشمندانہ اقدام سے تحریک پورے شباب پر آ گئی۔ حد یہ ہے کہ بغیر کسی اعلان کے باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں جسے احرار پارک کے نام سے پکارا جاتا ہے لوگوں کا بے پناہ ہجوم آ گیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ جلسۂ عام منعقد کر کے عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔ اس اجتماع سے سید خلیل احمد قادری، حافظ خادم حسین اور چودھری معراج دین صاحب نے خطاب کیا اور انہیں پرامن رہنے کی تلقین کی۔ لوگوں سے درخواست کی گئی کہ وہ پرامن طریقے پر منتشر ہو کر گھروں کو واپس چلے جائیں۔ چونکہ جذبات کو ٹھیس لگی تھی عوام یہ چاہتے تھے کہ حکومت کے اس جابرانہ اور غیر منصفانہ فعل کی پرزور مذمت کی جائے اور مؤثر قدم اٹھایا جائے مگر مجلس عمل کے کارکنوں نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔

مجلسِ مشاورت

لوگ منتشر ہو کر گھروں کو چلے گئے تو مجلسِ احرار کے دفتر میں مجلسِ مشاورت ہوئی۔ جس میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب، مولانا سید خلیل احمد صاحب قادری، مولانا حاجی محمد امین ترنگزئی نے شرکت فرمائی۔ ان حضرات کی مجلسِ مشاورت میں بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ ہوا کہ ایکشن کمیٹی کے تین ذمہ دار ارکان یعنی مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا اختر علی خان اور مولانا مودودی لاہور میں موجود ہیں۔ اس لیے ہمیں ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان ذمہ دار حضرات سے مشورہ کے بعد مناسب اقدام کرنا چاہیے۔ باہم مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھانا نامناسب سمجھا گیا چنانچہ وفد کی صورت میں الحاج خادم حسین صاحب اور سید خلیل احمد صاحب قادری، مولانا محمد داؤد غزنوی صاحب کے دولت کدہ پر پہنچے مگر وہ لائل پور (فیصل آباد) گئے ہوئے تھے۔ اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر یہ دونوں حضرات مولانا مودودی صاحب کے ہاں اچھرہ تشریف لے گئے مولانا سے بعد نماز مغرب ان کی ملاقات ہوئی۔ مولانا مودودی نے تبادلہ خیال کے بعد فرمایا

Marfat.com

کہ مجھے کراچی سے مولانا احتشام الحق کا فون آنے والا ہے یہ فون آ جائے تو کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ جب مولانا مودودی نے فیصلے کو مولانا احتشام الحق کے فون پر باندھ دیا تو ان حضرات نے آخری فیصلہ دوسرے دن پر ملتوی کر دیا اور شہر واپس تشریف لے آئے چنانچہ اچھرے سے لوٹ کر یہ حضرات مولوی اختر علی خان کے ہاں دفتر زمیندار میں حاضر ہوئے اور مطلع کیا کہ مولانا مودودی کی وجہ سے فیصلہ کل پر اُٹھا رکھا ہے اب ہم آپ تینوں حضرات کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔

عظیم الشان جلسہ

بعد نماز جمعہ جب عوام کا ہجوم کراچی میں گرفتاریوں کی اطلاع پا کر باغ دہلی دروازہ لاہور میں جمع ہوا تھا۔ اسے منتشر کرتے وقت چودھری معراج الدین سالار اعلیٰ مجلس احرار اسلام نے اعلان کر دیا تھا کہ شام کے چھ بجے اسی جگہ جلسۂ عام ہوگا چنانچہ شام کے چھ بجے احرار پارک کے تمام حصے کھچا کھچ بھر گئے۔ اس حد تک کہ ہجوم سڑک کے کنارے تک آ گیا۔ اتنا بڑا اجتماع اس سے قبل دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اس جلسے میں حضرت مولانا احمد علی صاحب نے زبردست تقریر فرماتے ہوئے لوگوں سے پُرامن رہنے کی اپیل بھی کی اور ہر ممکن قربانی پر وعدہ بھی لیا۔

میٹنگ کے فیصلے کے مطابق پچیس رضا کاروں کا ایک جتھا زیر قیادت غازی علم الدین رات کی گاڑی سے کراچی کے لیے روانہ کر دیا۔ اس جتھے کو کراچی کے راستے ہی میں گرفتار کر لیا گیا۔ 27 اور 28 فروری کی درمیانی شب حافظ خادم حسین، مولانا غلام محمد ترنم اور مولانا اختر علی خان کو گرفتار کر لیا گیا مگر مولانا اختر علی خان کو چند گھنٹے بعد رہا کر دیا گیا۔ غالباً انہیں صرف زیر حراست لیا گیا تھا۔ 28 فروری کو رضا کارانِ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے کیمپ پر پولیس نے چھاپہ مارا تمام کاغذات اور سامان ضبط کر لیا چنانچہ مولانا خلیل احمد اور مولانا ابراہیم صاحب نے مولانا مودودی کے مکان پر اچھرے میں میٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور فرداً فرداً ذمہ دار علماء حضرات کو مطلع کیا گیا۔ بعض ذمہ دار علماء کے پاس یہ دونوں حضرات خود بھی گئے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی صاحب لائل پور واپس تشریف لے آئے تھے۔ ان سے ملاقات کی، مولانا محمد اسماعیل صاحب (گوجرانوالہ شہر) کو دعوت دی۔ مولانا اختر علی خاں صاحب کو مطلع کیا اور مفتی محمد حسین صاحب کو خود حاضر ہو کر دعوت دی۔ اس میٹنگ کی اطلاع جب حضرت مولانا احمد علی صاحب کو دی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ دیکھو بھئی مجھے مولانا مودودی سے اختلاف ہے۔ میں ان کے مکان پر تو نہیں جاؤں گا مگر میں آپ حضرات کے سامنے ابھی اعلان کرتا ہوں کہ آپ جو فیصلہ کریں گے، مجھے منظور ہوگا۔ آپ اگر گرفتار ہونے کا فیصلہ کریں تو مجھے جب اور جس وقت حکم کرو

Marfat.com

گے۔ میں حاضر ہوں گا مگر مولانا مودودی کے مکان پر نہیں جاؤں گا۔

مولانا مودودی کے مکان پر میٹنگ

پروگرام کے مطابق دن کے گیارہ بجے مولانا مودودی کے مکان پر مندرجہ ذیل حضرات جمع ہوئے۔ مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی، مولانا محمد اسماعیل صاحب (گوجرانوالہ)، سید خلیل احمد قادری، مولانا مودودی صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالستار خان نیازی، ثناء اللہ صاحب بھٹہ، مجلس مشاورت کی کارروائی شروع ہوئی تو مولانا مودودی نے تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ میں سردست تحریک سے اس لیے معذرت چاہتا ہوں کہ عوام میں تا حال تحریک کے لیے پوری ہمدردی کے جذبات نہیں ہیں۔ اس لیے میں تحریک میں حصہ لینا نہیں چاہتا۔ لمبی چوڑی تقریر جو عمدہ الفاظ سے مرصع تھی۔ اس کا مفہوم تقریباً یہی تھا۔ اس تقریر کے جواب میں مولانا خلیل احمد صاحب نے فرمایا کہ مولانا ذرا باہر تشریف لے چلیے اور عوام کے جذبات کا اندازہ لگا لیجیے۔ تا کہ آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ عوام دل و جان سے تحریک کے ہمدرد اور ہر ممکن قربانی کے لیے تیار ہیں۔ مولانا مودودی نے پھر فرمایا کہ مجھے تحریک سے ہمدردی ہے مگر میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔ اس پر مولانا خلیل احمد نے ان پر اعتراضات کرتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ تو آپ کو ایکشن کمیٹی میں شامل ہونے سے قبل کرنا چاہیے تھا۔ اب آپ بہت نازک وقت میں کنارہ کشی کر رہے ہیں۔ بڑی ردوکد کے بعد جب مولانا مودودی زچ ہو گئے تو فرمایا کہ اچھا یوں کیجیے کہ جمعیت علماء اسلام، جمعیت اہل حدیث اور جماعت اسلامی پیچھے رہ کر کام کرے، لٹریچر وغیرہ شائع کرے اور جمعیت علماء پاکستان، مجلس احرار اور ادارہ تحفظ حقوق شیعہ چونکہ اقدام کر چکے ہیں اس لیے وہ محاذ پر لڑتے رہیں۔ ہم ان کے لیے پراپیگنڈہ کریں گے۔ اس پر مولانا محمد اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ جمعیت اہل حدیث تو اقدام کر چکی ہے اور اس کے علماء لائل پور وغیرہ میں گرفتاری بھی دے چکے ہیں اور جمعیت علماء اسلام کے صدر مولانا احمد علی صاحب لاہوری جلسہ عام میں تقریر کر کے فرنٹ کھول چکے ہیں۔ جمعیت علماء اسلام تو اب پیچھے نہیں رہ سکتی۔ اس پر مولانا مودودی نے کھسیانے ہو کر فرمایا کہ بہت اچھا جناب یہ سب کچھ درست ہے مگر جماعت اسلامی تو آگے آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسے تو پیچھے رہ کر اپنے ڈھب سے کام کرنا ہے۔ جماعت اسلامی لٹریچر وغیرہ چھاپے گی۔ غرض یہ کہ مولانا مودودی صاحب نے جب جماعت اسلامی کو منشی گلاب سنگھ کا چھاپہ خانہ ثابت کر دکھایا۔ تب دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے حاضرین نے ایک دوسری تجویز رکھی اور وہ یہ تھی کہ مرکز کے ارکان کی موجودگی میں ایک کمیٹی بنا دی جائے جس کو اختیار دیا جائے کہ وہ مناسب اقدام کرے چنانچہ

Marfat.com

اس پر سب کا اتفاق ہو گیا اور مندرجہ ذیل حضرات کی ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا محمد طفیل صاحب، مولانا بہاء الحق قاسمی، مولانا احمد علی صاحب اور مولانا خلیل احمد صاحب قادری، سید خلیل احمد صاحب قادری کو اس کمیٹی کا کنوینر بنا دیا گیا۔

ایکشن

منتخبہ کمیٹی نے احرار پارک (بیرون دہلی دروازہ باغ لاہور) میں عظیم الشان جلسۂ عام کا فیصلہ کیا اور یہ بھی طے کیا کہ لاہور شہر میں گرفتاری کے لیے مجلس عمل کی جانب سے پہلا جتھا جو پچیس آدمیوں پر مشتمل ہو، مولانا غلام دین کی قیادت میں روانہ کیا جائے۔ یہ جتھا جلوس کی شکل میں کھلے بازاروں سے ہوتا ہوا چیئرنگ کراس کے تھانے تک جائے اور خود کو پرامن طریقے سے گرفتاری کے لیے پیش کر دے چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق بعد نماز ظہر تقریباً تین بجے تلاوت قرآن پاک کے بعد جلسہ باقاعدہ شروع ہو گیا۔ تقریباً ساڑھے تین بجے مولانا غلام دین صاحب بمعہ اپنے ساتھیوں کے جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو تکبیر کے نعروں اور تاجدار ختم نبوت زندہ باد کے فلک بوس نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ مولانا غلام دین نے اس عظیم الشان اجتماع کو خطاب فرمایا۔ آپ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو سخت تاکید فرمائی کہ آپ سب حضرات بہر حال پرامن رہیں اور کسی بھی صورت امن میں خلل نہ آنے دیں۔ ورنہ تحریک کو سخت دھکا لگے گا۔ بدامنی پھیلانے والا اس تحریک کا، اسلام کا اور سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا باغی قرار دیا جائے گا۔ ہماری اس مقدس تحریک کی کامیابی کا دارومدار امن برقرار رکھنے پر ہے۔ لوگوں نے ہاتھ کھڑے کر کے پرامن رہنے اور ہر ممکن قربانی دینے کا اعلان کیا۔ مولانا غلام دین یوں بھی بہت مؤثر تقریر فرمایا کرتے ہیں مگر اس روز چونکہ وہ قربانی کے پاکیزہ جذبے سے میدانِ عمل میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس لیے ان کی تقریر میں بڑا ابھار تھا۔ ان کا ہر جملہ دلوں میں اُتر رہا تھا۔ یہ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا تو مولانا کی قیادت میں جتھا چیئرنگ کراس کی جانب روانہ ہو گیا۔ کم و بیش ایک لاکھ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو احرار پارک (دہلی دروازہ) سے روانہ ہوا اور چیئرنگ کراس پر جا کر رُک گیا۔ جلوس کا نظم و ضبط حیرت انگیز تھا۔ عوام کے جذبات پر پورا کنٹرول تھا۔ اس پُرامن جلوس نے مخالفین کو دم بخود کر دیا اور حکومت پریشان ہو گئی کہ یہ کون سی طاقت ہے جو انسانوں کے اس متحرک جنگل کو سنبھالے ہوئے ہے۔ نماز عصر کا وقت آ گیا۔ میدان میں جس قدر لوگ سما سکتے تھے۔ صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ مولانا غلام دین صاحب نے نماز پڑھائی اور خود کو مع جتھے کے گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

Marfat.com

مولانا غلام دین صاحب کو گرفتار کر کے سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ اندر سالار معراج الدین، مولانا ترنم اور حافظ خادم حسین صاحب پہلے سے استقبال کے لیے موجود تھے۔ مولانا کے ہمراہ جو رضا کار گرفتار ہوئے تھے، انہیں حکومت نے لاری میں بٹھایا اور جیل میں بند کرنے کی بجائے چھانگا مانگا اور ادھر ادھر لاہور سے دور چھوڑتے ہوئے کہا کہ لاہور کی بجائے اور جدھر جانا چاہتے ہو جاؤ۔ اب تم آزاد ہو۔

سالار معراج دین کی گرفتاری

مجلس احرار کے رضا کارانہ نظام کو بحیثیت سالار اعلیٰ چودھری معراج دین نے سنبھال رکھا تھا۔ چودھری معراج الدین بڑے ہی باہمت، سمجھدار اور بہادر نوجوان ہیں۔ ایسے موقعوں پر جب جذبات کی آندھی چل رہی ہو۔ مسلمانوں کا جوش و خروش پورے شباب پر ہو۔ حالات کو قابو میں رکھنا کس قدر محال ہوتا ہے مگر چودھری معراج الدین اور ان کے نائبین نے جس طرح جانفشانی اور سمجھداری سے کام کیا، اس پر دیکھنے والوں کو سخت حیرت تھی۔ حکومت بھی بے خبر نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ احرار کے رضا کاروں نے عوام پر کس طرح قابو پا رکھا ہے۔ اس نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ سالارِ اعلیٰ کو گرفتار کر لیا جائے چنانچہ چودھری معراج الدین صاحب کو گرفتار کر کے سنٹرل جیل لاہور میں بند کر دیا گیا۔

سالار محمد حسین بٹ

چودھری معراج دین کی گرفتاری کے بعد ذمہ داری کا بوجھ سالار محمد حسین، لاہور کے سالار سعید اقبال اور ان کے دوسرے ساتھیوں کے کندھوں پر آن پڑا مگر نہ تو وہ گھبرائے اور نہ نظام کو درہم برہم ہونے دیا اور نہ کسی قسم کی گڑبڑ ہونے دی۔ سالار محمد حسین ماشاءاللہ بڑے مضبوط ورزشی جسم کے بہادر نوجوان ہیں۔ اس تحریک میں کام کرنے کا انہیں اچھا خاصا موقع مل گیا تھا۔ ہوا یہ کہ سید خلیل احمد کی گرفتاری کی افواہ ہوئی۔ خلیل صاحب نے بستر بغل میں دبایا اور مسجد وزیر خان میں تشریف لے آئے تا کہ گرفتار ہونا ہے تو والد بزرگوار کی مسند کا حق ادا کرتے ہوئے گرفتار ہوں۔ احرار کے سالار اور رضا کار بھی مسجد وزیر خان میں پہنچ گئے۔ اس طرح مسجد وزیر خان تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کا مرکزی مقام بن گیا۔ خیال یہ تھا کہ سید خلیل احمد صاحب کو رات کے وقت اچانک گرفتار کر لیا جائے گا مگر کسی کو سید خلیل احمد کو گرفتار کرنے کے لیے مسجد وزیر خان میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسی اثناء میں بیرون جات سے فدایانِ ختمِ نبوت کے جتھے آنا شروع ہوئے۔ چودھری معراج دین کی گرفتاری کے

Marfat.com

بعداور پولیس کے چھاپہ مارنے کے بعد باہر رضا کاروں کے لیے کوئی کیمپ نہ تھا۔اس لیے بیرون جات کے رضا کار بھی مسجد وزیر خان میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ریل گاڑی کے علاوہ لاریوں اور بسوں میں دھڑا دھڑ رضا کاروں کے جتھے چلے آرہے تھے۔سب کو معلوم ہو گیا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔احرار رضا کار لاریوں کے اڈوں اور ریلوے سٹیشن پر سفید کپڑوں میں موجود ہوتے تھے اور وہ آنے والوں کو مسجد وزیر خان میں پہنچا رہے تھے۔اس طرح آہستہ آہستہ مسجد وزیر خان شمع رسالت کے پروانوں کی چھاؤنی بن گئی۔

مولانا عبدالستار خان نیازی

رائے قائم کرتے وقت عجلت نہ ہونا چاہیے بسا اوقات عجلت سے قائم کی ہوئی رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔تب غلط رائے قائم کرنے والے کو ندامت محسوس ہوتی ہے۔کسی شخص کو دیکھے بھالے بغیر اگر آپ نے اچھی رائے قائم کر لی ہو اور بعد میں وہ شخص اچھا ثابت نہ ہو اور رائے کے مطابق تول میں پورا نہ اترے تو دلی کوفت محسوس ہوتی ہے یا آپ کسی شخص کو اچھا نہ سمجھیں اور حقیقتاً وہ بہت اچھا ہو تو پردہ اٹھ جانے کے بعد بے حد ندامت محسوس ہوتی ہے۔نیازی صاحب کا ہمارے بارے میں اور ہمارا نیازی صاحب کے بارے میں یہی حال تھا۔ہمیں لوگوں نے کہا کہ نیازی صاحب احرار سے بڑی کدر رکھتے ہیں اور بخاری صاحب کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہیں کرتے۔جلسوں میں مخالفت کی جاتی ہے۔وغیرہ وغیرہ۔ان باتوں کا احرار پر بہت بُرا اثر تھا۔میری رائے اگر نیازی صاحب کے بارے میں بُری نہ تھی تو اچھی بھی نہ تھی۔تاہم مستقل رائے قائم کر لینے میں مجھے کچھ تامّل تھا۔اتفاق کی بات ہے کہ جب تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے سلسلے میں پہلی بار 1951ء میں قید ہوا تو آب و دانے کی کشش مجھے میانوالی جیل میں لے گئی۔میانوالی نیازی صاحب کا وطن مالوف ہے۔جیل میں نیازی صاحب کے اپنے گاؤں کے لوگ موجود تھے ان کے علاوہ ضلع میانوالی کے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد اس جیل میں محبوس تھی۔مجھے ان لوگوں سے ملنے اور نیازی صاحب کے بارے میں حالات معلوم کرنے کا موقع ملا میں نے کرید کرید کر ان کے گاؤں کے لوگوں سے دریافت کیا کہ وہ نیازی صاحب کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔مجھے ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ نیازی صاحب کے کیریکٹر پر کبھی کسی کو شبہ تک نہ ہوا۔عرض یہ کر رہا تھا کہ جب چھاپہ مار کر پولیس کے رضا کاروں کے کیمپ کا خاتمہ کر دیا تو تحریک کا مرکز مسجد وزیر خان میں چلا گیا۔نیازی صاحب بھی مسجد وزیر خان میں تشریف لے آئے اور تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔اب یہ تقریریں مجاہدین کے سامنے ہونے لگیں۔عوام کو خطاب کرنے کی بجائے

Marfat.com

روئے سخن یا تو مجاہدین کی جانب تھا یا پھر حکومت کو للکارا گیا اور متنبہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو تسلیم کرے اور بلاوجہ اسلام کے بنیادی عقیدے سے ٹکر لینے کی حماقت نہ کرے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یکم مارچ 1953ء کو جب مولانا عبدالستار خان نیازی مسجد وزیر خان میں داخل ہوئے اس روز مولانا محمد یوسف سیالکوٹی بھی لاہور تشریف لے آئے اور مسجد وزیر خان میں پہنچ گئے۔ ان دونوں حضرات نے تقریریں شروع کر دیں۔ باہر سے رضا کاروں کے قافلے آتے رہے اور مسجد ہی میں قیام کرتے رہے۔ اس طرح مسجد وزیر خان تحریک تحفظ ختم نبوت کا زبردست مرکز بن چکی تھی۔

مولانا احمد علی صاحب کی گرفتاری

28 فروری 1953ء کو مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے صبح نو بجے باغ احرار پارک (دہلی دروازہ) کے جلسۂ عام میں بہت بڑے اجتماع کو خطاب فرمایا ور جتھا لے کر پروگرام کے مطابق جلوس کی شکل میں چوک سٹی کوتوالی سے ہو کر لنڈا بازار کی جانب جانے لگے تو پولیس نے چوک ہی میں جلوس کو روک لیا۔ یہ جلوس بہت بڑا جلوس تھا اور حاضرین مولانا کے ہمراہ جیل جانا چاہتے تھے مگر جب پولیس نے آگے جانے سے روکا تو لوگوں میں جوش پھیل گیا۔ مولانا احمد علی صاحب نے تدبر سے کام لیا اور لنڈا بازار کی جانب جانے کی بجائے سیدھے کوتوالی ہی میں تشریف لے گئے اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ مولانا کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ جلوس امن سے منتشر ہو گیا۔

اہل لاہور کی مہمان نوازی

کسی گھر میں دو چار مہمان اچانک آ جائیں تو گھر والے گھبرا جاتے ہیں۔ مسجد وزیر خان میں تقریباً دو ہزار رضا کار بیرون جات سے تحفظ ختم نبوت کے لیے قربانی دینے کے لیے آ گئے زندہ باد اور تکبیر کے نعروں سے استقبال ہو گیا مگر اس سے آگے؟ جب کھانے کا وقت ہوا تو سخت پریشانی کا سامنا ہوا۔ ہمارے احرار کارکن ماشاء اللہ گھبرانے والے نہیں ہیں۔ وہ ناسازگار حالات میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کے عادی ہیں۔ سب سے پہلے کارکنوں نے اپنے ہی ساتھیوں سے چندہ جمع کیا۔ بے شمار کارکن میدان میں آ چکے تھے۔ جو کچھ جمع ہوا۔ اس سے نان کلچے روٹیاں جو کچھ میسر آ سکا، لے آئے۔ تب شہر لاہور کے شریف اور غیور مسلمانوں نے اس جانب توجہ دی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ لاہور جب کچھ کرنے پر آ جائے تو وہ کچھ کر دکھاتا ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے چنانچہ دوسرے وقت سے کھانے کے لیے لاہور کے مسلمانوں نے خاطر خواہ بندوبست کر دیا یعنی پلاؤ کی دیگیں، روٹیوں سے

Marfat.com

لدے ہوئے چھکڑے، سالن کی دیگیں، بھنے ہوئے چنوں کی بوریاں، تیل کے ڈرم، نہانے کے صابن کی پیٹیاں، غرض یہ کہ مہمانداری کا کل سامان آناً فاناً حاضر کر دیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک مارشل لاء کے ذریعے ناکہ بندی کر کے مسجد وزیر خان کے تمام راستے بند نہ کر دیئے گئے۔

مہمانداری کے انتظامات اتنے مناسب اور منظّم تھے کہ کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہونے پائی۔ شیخ لال دین مرحوم جو احرار کے دیرینہ خادم تھے، گودام کے انچارج تھے۔ ان کے ہمراہ چند رضا کار تھے جس سے مرحوم نے اس اہم کام کو بڑی خوبصورتی سے سنبھالا ہوا تھا۔ آہ ہمارا یہ قیمتی اور وفادار ساتھی، احرار کا جانباز سپاہی اللہ کو پیارا ہو گیا اور ایسا خلا پیدا کر گیا ہے کہ جسے پُر کرنا محال ہے کسی تحریک میں لال مرحوم کبھی پیچھے نہیں رہے بڑی بہادری اور جوانمردی سے قید کاٹتے رہے۔ خدا اُنہیں جنت میں جگہ دے کیسے اچھے لوگ تھے جو دنیا سے اٹھ گئے؟

مسجد کے اندر اور باہر جلسے

باہر الگ جلسے ہوتے تھے اور جلوس کی شکل میں رہنما اور رضا کار قربانیاں پیش کرتے تھے۔ مسجد وزیر خان کے اندر مولانا عبدالستار خان نیازی کلمہ حق بلند کر رہے تھے۔

یکم مارچ

یکم مارچ 1953ء کو مولانا محمد یوسف سیالکوٹی نے باغ بیرون دہلی دروازہ میں عظیم الشان جلسے میں مسلمانوں کو خطاب کیا اور پچاس رضا کاروں کا جتھا لے کر گرفتاری کے لیے جلوس کی شکل میں نکلے مگر مولانا کو گرفتار نہ کیا گیا۔ البتہ پچاس رضا کار جو مولانا کے ہمراہ تھے، انہیں پولیس نے گرفتار کر لیا۔ مسجد وزیر خان میں ہزار ہا رضا کار موجود تھے چنانچہ مولانا محمد یوسف شام کو دوبارہ پچاس رضا کاروں کا جتھا لے کر نکلے مگر اس مرتبہ بھی یہی ہوا کہ رضا کاروں کو گرفتار کر لیا اور مولانا پر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ یعنی گرفتاریوں کی گنگا الٹی بہنے لگی۔ گرفتاریوں میں کمی ہوئی تو یہ ترکیب گرفتار کرنے والوں کو راس آئی۔ مسجد وزیر خان میں اس قدر رضا کار موجود تھے کہ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہتا تو گرفتار کرنے والے تھک جاتے۔ جیلوں میں جگہ نہ رہتی اور پرامن تحریک سے حکومت زچ ہو کر ہتھیار ڈال دیتی۔ مسجد وزیر خان کے رہنماؤں نے فیصلہ کیا، پچاس کی بجائے اب سو سو رضا کاروں کے جتھے روانہ کیے جائیں اور یہ سلسلہ صبح و شام جاری رہے۔ گرفتار کرنے والوں نے بحالت مجبوری رضا کاروں کو گرفتار کر کے لاہور سے دور لے جا کر رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ وہ رضا کاروں کو گرفتار کرتے اور باہر لے جا کر کھلا چھوڑ

Marfat.com

دیتے۔صبح وشام یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

2 مارچ

دو مارچ کو حافظ آباد سے مولانا ابوالحسن یحییٰ مع رضا کاروں کے تشریف لے آئے۔ مولانا موصوف اسی روز گرفتار ہونا چاہتے تھے چنانچہ انہیں موقع دیا گیا۔ جب وہ جلوس کی شکل میں جیل کی جانب جا رہے تھے۔انہیں راستے ہی میں مع رضا کاروں کے گرفتار کیا، لاریوں میں بٹھایا اور باہر لے جا کر چھوڑ دیا گیا چنانچہ مولانا ابوالحسن یحییٰ حافظ آباد واپس جا کر وہیں گرفتار ہو گئے۔

3 مارچ

صبح وشام سینکڑوں رضا کاروں کے جتھے گرفتاری کے لیے نکلنے لگے۔دن بھر سارا شہر تحریک سے وابستہ رہتا۔شہر میں تمام کاروبار بند ہو گیا۔سیکرٹریٹ، لاکو شاپ اور حکومت کی دوسرے ادارے بھی تقریباً معطل ہو گئے۔

دفتر زمیندار پر پولیس کا چھاپہ

مولانا ظفر علی خان مرحوم ومغفوران دنوں کرم آباد میں مقیم تھے۔ان کی طبیعت ناساز تھی۔علم و ادب کا یہ چراغ ٹمٹا رہا تھا۔مولانا اختر علی خان تقریباً ہر ہفتے کرم آباد ان کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوتے تھے چنانچہ مولانا 3 مارچ کو کرم آباد میں تھے کہ رات گئے پولیس نے دفتر زمیندار پر چھاپہ مارا۔ مولانا تو وہاں موجود نہ تھے اس لیے پولیس رعب داب جما کر ناکام واپس ہوئی۔ اسی شام جب رضا کاروں کے عام جلوس سڑکوں پر گشت کرتے پھرتے تھے، مولانا اختر علی خان کے کسی ''مہربان'' نے جلوس والوں کو اُکسایا اور کہا کہ کدھر گھوم پھر رہے ہو ارے تم مولانا اختر علی خان سے تو پوچھو کہ وہ اب جیل کیوں نہیں جاتے؟ جاؤ ان کے دفتر سے انہیں باہر لاؤ اور کہو کہ وہ جلوس کی رہنمائی کریں۔

جلوس زمیندار کے دفتر کی جانب چل پڑا۔ یہ جلوس بہت بڑا تھا۔ جب جلوس دفتر زمیندار کے سامنے پہنچا تو پھر کسی نے سوچی سمجھی سکیم کے مطابق مختصر سی تقریر میں جلوس والوں کو اُکسایا۔ کچھ لوگ دفتر زمیندار کے اندر جانا چاہتے تھے۔اندر والے یعنی ایڈیٹر اور نائب سہم گئے۔ دروازے بند ہو گئے۔ باہر جس نے جو چاہا کیا اور جس نے جو سمجھایا سمجھا۔ بہر حال جب موقع مل جائے تو مخالف لوگ کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ اس طرح روزنامہ زمیندار اور مولانا اختر علی خان کی ہوا خیزی کا بندوبست ہو گیا۔

Marfat.com

اطلاع کے لیے

یہاں میں قارئین کرام کی اطلاع کے لیے ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب ہم کراچی میں مجلسِ عمل کی جانب سے 26 فروری کو آخری جلسے کا بندوبست کر رہے تھے اس روز مولانا اختر علی خان نے فون پر مجھ سے بات کی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ مولانا تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت پورے شباب پر ہے، ہماری توقع سے کہیں زیادہ کام ہو چکا ہے، زمیندار نے جو خدمت کی ہے اس کے لیے ہم سب شکر گزار ہیں۔ اب آپ پیچھے رہ کر کام کریں۔ گرفتار ہونے کی ضرورت نہیں۔ مَیں بحیثیت سیکرٹری مجلس عمل پوری ذمہ داری سے آپ کو ایک تحریر بھیج چکا ہوں۔ میرا خط آپ کو کل صبح انشاءاللہ مل جائے گا۔ میں نے اس خط میں آپ سے استدعا کی ہے کہ آپ باہر رہیں اور جیل نہ جائیں۔ اگر کوئی گروہ یا جماعت یا کوئی فرد آپ کو مجبور کرے تو آپ میرا خط دکھا دیجیے گا۔ اس بارے میں میری معلومات یہ ہیں کہ میرا وہ خط مولانا اختر علی خان صاحب کو مل گیا تھا مگر مولانا نے میرا وہ خط جیب میں رکھ لیا۔ غالباً کسی سے اس کا ذکر بھی مناسب نہ سمجھا۔

میں نے یہ خط کیوں لکھا؟

کراچی کے لیل ونہار سے میں نے جب یہ اندازہ لگا لیا کہ مرکزی حکومت کے گھوڑے گمراہی کی راہ پر سرپٹ دوڑے جا رہے ہیں اور انہیں روکنا اور سیدھی راہ پر ڈالنا ہمارے بس کی بات نہیں تو یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ اب خواجہ ناظم الدین کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ ہم پر ہاتھ ڈالے۔ تاکہ اپنی قبر اپنے ہی ہاتھ سے کھود کر پیچھے آنے والوں کا راستہ خود ہی صاف کر دے۔ ہماری گرفتاری جب یقینی امر ہو گئی تو مجھے اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کا خیال کہ اب پیچھے کون کون رہ گیا ہے؟ پیچھے رہنے والوں میں سب سے پہلے مولانا اختر علی خان کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے سامنے روزنامہ زمیندار اور مولانا اختر علی خان کی بے لوث خدمات تھیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس تحریک کو پروان چڑھانے اور چار چاند لگانے میں زمیندار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا! پھر کیا یہ احسان ناشناسی نہ ہو گی کہ زمیندار کی ان بے بہا خدمات کو نظر انداز کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا اختر علی خان نے اس مقدس تحریک کا دل و جان سے ساتھ دیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ مارے مارے پھرے اور ہمارا ہاتھ بٹاتے رہے۔ مولانا اختر علی خان 1920ء میں میرے جیل کے ساتھی بنے۔ وہ میانوالی جیل میں میرے ساتھ تھے۔ جیل کا تعلق بڑے گہرے اثرات رکھتا ہے۔ جیل سے نکلے۔ کچھ عرصہ اکٹھے چلتے رہے، پھر راہیں جدا جدا ہو گئیں مگر تعلقات نہیں

Marfat.com

ٹوٹے۔ حضرت مولانا ظفر علی خان مرحوم ومغفور اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری میں بھی یہی رشتہ موجود تھا۔ رائے کا اختلاف دو مختلف راہوں پر لے گیا اور وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے مگر جب تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کا دور آیا اور مولانا ظفر علی خان مرحوم کا زمیندار میں پیغام شائع ہوا تو بھولی بسری یادوں نے بُعد کو بیچ میں سے ہٹا دیا۔ لاہور کے لوگوں نے دیکھا ہے کہ دہلی دروازے (احرار پارک) کے ایک عظیم الشان جلسے میں جہاں حضرت امیر شریعت عوام کو تحفظِ ختمِ نبوت کے بارے میں خطاب کرنے والے تھے۔ حضرت مولانا ظفر علی خان مرحوم جلسہ گاہ میں تشریف لے آئے تو شاہ صاحب کی آنکھوں میں محبت کے آنسو تھے وہ آگے بڑھے اور مولانا ظفر علی خان مرحوم کا ہاتھ تھام کر اپنا سر جھکایا اور ان کا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔ دیکھنے والے آنسوؤں کو روک نہ سکے وہ رقت انگیز منظر آج بھی تصور کی دنیا میں موجود ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مولانا اختر علی خان کو میں نے ایسا خط کیوں لکھا۔ اس کی چند وجوہات تھیں۔ وہ بھی سن لیجیے، تحریک پورے شباب پر آ گئی۔ اس تحریک کو تائید ایزدی حاصل تھی مگر دنیاوی سہاروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زمیندار بھی ایک سہارا تھا اور زمیندار کے ذریعے مولانا اختر علی خان بھی ایک مخلص اور رفیق ساتھی تھے۔ مولانا اختر علی خان روزنامہ زمیندار کے مالک ونگران تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ انہیں ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے کہ جس سے وہ زیادہ عرصہ کے لیے دفتر زمیندار سے غیر حاضر ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ مولانا اختر علی خان بہت ہی آرام اور آسائش کی زندگی گزار رہے تھے۔ آزمائشی زندگی کے شام وسحر شاید انہیں راس آئیں یا نہ آئیں۔

مولانا موصوف کی صحت گر چکی تھی۔ پیرانہ سالی کا بوجھ اس کے علاوہ تھا۔ مایوس کن خیالات کے اس ہجوم نے مجھے یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کیا۔ میرا وہ خط جو میں نے کراچی سے مولانا کے نام لکھا۔ اسی رائے کا مظہر تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے غلط سمجھا ہو اور میری رائے بھی درست نہ ہو مگر میں نے ایمانداری سے مولانا کو وہی مشورہ دیا جو میرے نزدیک صحیح تھا۔ میں نے اپنے متذکرہ بالا خط کے نیچے ایک نوٹ لکھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر مناسب خیال فرمائیں تو مولانا میرے خط کو روزنامہ زمیندار میں شائع کر دیں تاکہ مخالف عنصر یا جذباتی لوگ بلاوجہ ایک ایسی ہستی کو جو باہر رہ کر تحریک کی بہت بہتر خدمت کر سکتی ہے۔ جیل جانے کے لیے مجبور نہ کریں۔ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ میرا وہ خط بروقت شائع ہو جاتا تو تحریک کے لیے اور خود مولانا اختر علی خان کے لیے مفید ثابت ہوتا۔ بہر حال ہونے والی بات تو ہو کر رہتی ہے۔

Marfat.com

مولانا اختر علی خان کی گرفتاری

مولانا اختر علی خان کو کرم آباد ہی میں معلوم ہو گیا کہ ان کے دفتر پر لاہور میں پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔ اس اطلاع کے بعد مولانا اختر علی خان سیدھے لاہور پہنچے اور جلسۂ عام کو خطاب کرنے کے بعد عظیم الشان جلوس کی شکل میں چیئرنگ کراس کی جانب روانہ ہو گئے۔ شہر کی سڑکوں پر اس روز بے پناہ ہجوم تھا۔ چیئرنگ کراس تھانے کے باہر مولانا اختر علی خان نے عوام کو پرامن رہنے کی تلقین کی اور خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ گرفتار ہونے سے قبل مولانا نے اپنے ایک ملازم کو جیب سے کچھ کاغذات نکال کر سپرد کیے۔ میری معلومات یہ ہیں کہ انہی کاغذات میں میرا وہ خط بھی تھا۔ جونہی مولانا عوام سے علیحدہ ہوئے۔ مولانا کے ملازم کو سی آئی ڈی کے ذمہ داروں نے بڑی ترکیب سے روک لیا اور جو کاغذات مولانا نے سپرد کیے تھے۔ اس میں سے میرا خط وصول کر کے محفوظ کر لیا۔

مولانا بہاء الحق قاسمی [1]

مولانا بہاء الحق قاسمی خوش بیان مقرر، جید عالم، اخلاق و محبت کا مجسمہ اور سیاسیات کے پیچ و خم سمجھنے والے بزرگ ہیں۔ مولانا موصوف حتی الوسع شہرت سے دور بھاگتے ہیں اور خواہ مخواہ آگے آنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس پیچھے رہ کر بے لوث خدمت کرنے کے عادی ہیں جب مجلس عمل کے اکثر رہنما گرفتار ہو چکے اور جو باہر تھے، وہ کسی باعث آگے نہ آ سکے تو مولانا بہاء الحق قاسمی میدان میں اتر گئے۔ آپ نے مجلس احرار اسلام کے دفتر میں مجلس مشاورت میں حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ گھر واپس نہیں گئے بلکہ مسجد وزیر خان میں ڈیرہ ڈال دیا۔ مولانا صلاح و مشوروں میں شریک ہوئے اور مسجد وزیر خان کے مجمع عام میں تقریر فرماتے رہے۔ حالات مخدوش ہوتے گئے۔ پولیس تیزی سے سارے نظام کو درہم برہم کرنے کے درپے تھی۔ حتیٰ کہ پانچ مارچ کو ایک اہم اور خطرناک واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

[1] والد محترم معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی)

مستی دروازے کا تھانیدار گھر گیا

مستی دروازے کا باوردی تھانے دار مشتعل لوگوں کے ہجوم میں گھر گیا۔ یہ اطلاع جب مجلس احرار اسلام لاہور کے سالار مسٹر سعید اقبال کو ملی تو وہ چند رضا کاروں کو لے کر موقع پر پہنچ گئے۔ ابھی صرف گفتگو ہو رہی تھی اور لوگ یہی دریافت کر رہے تھے کہ ادھر کیا لینے آئے ہو۔ باہر ہمارے بھائیوں کو مارتے ہو۔ یہاں ہمارے ساتھ کیا انصاف کرو گے؟ تھانیدار بے بس سا نظر آ رہا تھا کہ سعید اقبال وہاں پہنچ گئے اور لوگوں کو منتشر ہو جانے کا مشورہ دیا۔ تھانیدار کو سعید اقبال نے بڑی سمجھداری سے زینے کے

[1] والد محترم معروف کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی)

Marfat.com

ذریعے چٹے دروازے کی چھت پر پہنچا دیا اور بڑی چابکدستی سے کپڑے بدلوا کر سفید کپڑوں میں واپس تھانے پہنچا دیا۔ کوتوالی میں یہ اطلاع اس صورت میں پہنچی کہ ایک تھانیدار کو مسلمانوں نے گھیر رکھا ہے۔

فردوس شاہ کا قتل

اس خبر کے پاتے ہی ڈی ایس پی فردوس شاہ مع چند سپاہیوں کے جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عام چرچا یہ تھا کہ فردوس شاہ ڈی ایس پی نے قرآن پاک کو چوک دالگراں میں ٹھوکر ماری تھی اور بے حرمتی کی تھی یہ افواہ تھی جو فردوس شاہ ڈی ایس پی کے افسوسناک قتل کا باعث ہوئی۔ کاش یہ واقعہ ظہور پذیر نہ ہوتا تا کہ پولیس کو تشدد کرنے اور مسلمانوں پر بے تحاشا گولیاں چلانے کا بہانہ میسر نہ آتا دوسری جانب سے اندھیر کہ قوم کو شہید ہونے والوں کو صحیح تعداد بتانے میں بھی تامل رہا حالانکہ یہ شہید جذبہ خلوص سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو پر قربان ہو گئے۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

کرفیو آرڈر

3 مارچ سے شہر میں کرفیو لگ چکا تھا مگر صورت حال یہ تھی کہ باہر کی سڑکوں پر عوام کرفیو کی حکم برداری میں تھے مگر شہر کے اندر یہی کرفیو پولیس پر لاگو تھا۔ تمام کاروبار بند تھا اور لوگ شہر میں آزاد گھوم رہے تھے۔ جونہی 6 مارچ کو قتل کا واقعہ ہوا تلخی اور زیادہ بڑھ گئی۔ پولیس کا رویہ بہت سخت ہو گیا۔ شہر کے اندر اور باہر ہراس پھیل گیا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ افسران پولیس پر اِس ہراس کے آثار نمایاں تھے۔ مسجد وزیر خان میں جو تقریریں ہو رہی تھیں اگر ان تقریروں میں مسلمان لاہور کو ذرا سی اُکساہٹ مل جاتی تو بلوہ ہو سکتا تھا اور لاہور کے گنے چنے مٹھی بھر مرزائیوں کو ختم کر دینا اُن کے لیے کون سی بڑی بات تھی مگر اس سارے خطرناک دور میں جبکہ جگہ جگہ تحفظ ختم نبوت کے پروانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ مسلمان آتشِ زیر پا تھے، مگر کسی ایک مسلمان نے بھی لاہور شہر کے محلوں میں قابو آئے ہوئے مرزائیوں کو ہاتھ تک نہ لگایا بلکہ مجلسِ عمل کی ہدایت کے مطابق مرزائیوں کی حفاظت کی۔ کسی مرزائی کی نکسیر نہ پھوٹی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اب بھی اگر کوئی مرزائی یہ کہے کہ تحفظ ختم نبوت کی تحریک مرزائیوں کے قتل اور فساد انگیز کی تحریک تھی تو اس سے بڑی ناانصافی اور کیا ہو سکتی ہے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کا لاہور میں جو مرکزی مقام تھا۔ جہاں جلسہ عام میں ہزارہا مسلمانوں کا صبح و شام اجتماع ہوتا تھا۔ وہ تھا باغ (احرار پارک) دہلی دروازہ جلسہ گاہ کے بالکل متصل مرزائیوں کی گلی تھی اس گلی میں مرزائیوں کے چار

Marfat.com

پانچ گھر ہیں۔اس میں مسلمانوں کی ایک پرانی مسجد پر مرزائیوں نے قبضہ بھی جما رکھا ہے مگر ان مرزائیوں کی جانب کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مجھے جب کبھی بھی دوران تقریر ان دو چار مرزائی گھروں کا خیال آیا میں نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ہمیشہ یہی کہا کہ یہ لوگ ہمارے ہمسایہ میں بطور امانت ہیں ہم پر ان کی حفاظت فرض ہے۔ ہماری تحریک جسموں کے خلاف نہیں بلکہ باطل عقیدے کے خلاف ہے۔اس لیے مسلمانانِ لاہور کو یہ بات بھلانا نہ چاہیے کہ ان چند مرزائیوں کی جانیں بڑی قیمتی ہیں۔ان کی جانب اگر کسی بے سمجھ انسان نے بُری نگاہ سے دیکھا یا کسی بُرے ارادے کا اظہار کیا تو ہم اسے تحریک تحفظ ختم نبوت کا بدترین دشمن سمجھیں گے۔دہلی دروازہ کی بیسیوں دکانوں کے درمیان ایک مرزائی کی دکان ہے۔اس دکان پر کبھی مسلمانوں نے مظاہرہ نہیں کیا۔حالانکہ اس مرزائی کی دکان اور جلسہ گاہ میں چند گز کا فاصلہ ہے مگر ان حقائق کے باوجود زیر دست لوگ اگر ہم زیر دستوں پر زبان طعن دراز کریں یا بلاوجہ جھوٹے الزامات اٹھائیں تو انہیں کیا کہا جائے۔بہر حال سخت ہنگامے میں بھی لاہور کے مرزائی محفوظ رہے جو مجلسِ عمل کی سب سے بڑی کارگزاری اور کامیابی تھی اور یہی حقیقت مجلسِ عمل کی امن پسندی کی بین دلیل ہے۔

چھ تاریخ کو لاہور میں بعض اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے، مثلاً خلیفہ شجاع الدین کی معیت میں بعض لوگ مسجد وزیر خان میں تشریف لائے اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ حالات خطرناک ہو چکے ہیں۔آپ اس تحریک کو بند کریں تا کہ فضا سازگار ہو جائے۔اس ارشاد کے بعد فرمایا کہ ہمیں تحریک سے ہمدردی ہے۔

جب یہ حضرات مسجد وزیر خان میں آئے۔عوام انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ دروازے پر ہی بعض نے فقرے چست کیے اور کہا کہ اب آپ کی آنکھ کھلی ہے۔اتنے دنوں سے تحریک جاری ہے۔آپ حضرات کیا ہمارا تماشہ دیکھتے رہے؟ خلیفہ شجاع الدین مرحوم کے لیے عوام کے دل میں احترام تھا۔اس لیے ان حضرات کو مسجد کے اندر آنے میں زیادہ مشکل کا سامنا نہیں ہوا۔ مسجد کے جس حجرے میں حضرت مولانا ابوالحسنات نماز جمعہ کے بعد استراحت فرمایا کرتے ہیں۔یہ سب حضرات یعنی شجاع الدین خلیفہ، شیخ سردار محمد، احمد سعید کرمانی، خورشید صاحب اور بیگم سلمٰی تصدق جب اس حجرے میں پہنچے تو انہیں مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب، مولانا بہاء الحق قاسمی صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب قادری اور دیگر کارکنانِ مجلس عمل سے گفتگو کا موقع ملا۔یہ گفتگو اچھے ماحول میں نہیں ہوئی جب شک وشبہات پیدا ہو جائیں تو کچھ اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا چنانچہ اس وفد پر پہلا

Marfat.com

اعتراض یہ ہوا کہ آپ حضرات جو ہمیں نصیحت فرمانے کے لیے گھر سے نکلے ہیں، راہ میں آپ نے حکومت سے بھی کچھ فرمایا ہوتا کہ اپنی رعایا سے یہ سلوک اور اپنوں پر گولیوں کی یہ بارش نہایت نامناسب ہے۔ آپ ہمیں کیا فرمانے آئے ہیں۔ کیا ہمارا مطالبہ اسلام کا بنیادی مطالبہ نہیں ہے؟ ان سوالات کے بعد کچھ مایوسی سی چھا گئی۔ مولانا بہاء الحق قاسمی نے بیگم سلمٰی تصدق سے فرمایا کہ بیگم صاحبہ یہ مسلم لیگ کا جلسہ تو نہیں کہ آپ کھلے منہ بے پردہ مسجد میں تشریف لے آئی ہیں۔ آپ نے آنا تھا تو برقعہ اوڑھ کر آئی ہوتیں۔ باہر صحن میں عوام اس بے پردگی پر سخت معترض تھے چنانچہ جب اس قصے نے طول پکڑا تو مجلسِ عمل کے رہنماؤں کو یہ فکر ہوا کہ ان حضرات کو واپس کیسے بھیجا جائے؟ چنانچہ اسی وقت ایک رضا کار کہیں سے برقعہ لے آیا۔ جو بیگم سلمٰی تصدق کو اوڑھایا گیا۔ پھر یہ خیال ہوا کہ ان حضرات کو کس طرح مسجد سے باہر پہنچایا جائے۔ برآمدے میں ایک چور دروازہ تھا۔ اس دروازے سے اس وفد کو بڑی احتیاط سے باہر پہنچایا گیا۔

مارشل لاء

چھ تاریخ کو شام کے بعد مارشل لاء کا اعلان ہو گیا۔ فوج نے شہر کے بیرونی حصے پر پہرے لگا دیئے۔ مارشل لاء کے اعلان سے ایک بار تو شہر پر سناٹا چھا گیا مگر بہاء الحق قاسمی، مولانا خلیل احمد قادری اور مولانا عبدالستار خان نیازی کی جرأت مندانہ اور ایمان افروز تقریروں سے یہ سناٹا بھی جرأت و حوصلہ مندی کے جذبات میں گم ہو گیا۔ شہر کے اندرونی حصے پر تحفظ ختم نبوت کے نعرے لگتے تھے اور باہر فوج پہرہ دے رہی تھی۔ مارشل لاء کا نفاذ خطرناک حالات میں ازبس ناگزیر ہوتا ہے مگر مجھے آج بھی جبکہ حالات یکسر بدل چکے ہیں، مارشل لاء کا مشورہ دینے والوں سے سخت اختلاف ہے۔ مجھے تو حکومت کی ابتدائی پالیسی ہی سے اختلاف ہے۔ میں مارشل لاء کے نفاذ کو کس طرح جائز مان سکتا ہوں؟ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت اگر بنیادی طور پر غلط تھی تو مسلم لیگ اور اس کی حکومت کا فرض تھا کہ وہ کھلے بندوں اس مطالبے سے انکار کرتی۔ مطالبہ کرنے والے سمجھ لیتے کہ اب انہیں کیا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ باہر مسلم لیگ تائید کرتی تھی اندر صدر مسلم لیگ یعنی خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان مطالبے کو جائز قرار دیتے ہوئے فرماتے تھے کہ اس راہ میں مشکلات حائل ہیں۔ انکار کی جرأت نہیں، تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ ہے۔ اس صورت حال کی موجودگی میں کیا یہ درست نہیں کہ تحریک چلانے والے مطمئن تھے اور ان کا یہ خیال کرنا کہ جونہی مطالبے کی پشت پر قوم کی متفقہ آواز ہوئی اس مطالبے کے منظور کیے جانے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہوگی تب مجلسِ عمل یا مجلسِ احرار کو کس طرح مجرم گردانا جا سکتا ہے اور جو

Marfat.com

بدسلوکی اور بہیمیت کا سلوک تحریک میں حصہ لینے والوں پر روا رکھا گیا۔ اس کے جواز کے لیے حکومت کے پاس کیا دلیل ہے؟ میں یہ کہتا ہوں کہ حکومت نے اس بارے میں جو روش اختیار کی ہے، وہ قطعی نامناسب تھی۔ دریں حالات لاٹھی چارج گرفتاریاں اور پولیس کی مار دھاڑ خلاف حق وانصاف تھی، چہ جائیکہ حکومت لاہور پر مارشل لاء نافذ کر دیتی۔ مارشل لاء کے نفاذ سے تو مجھے اس لیے بھی سخت اختلاف ہے کہ پاکستانی فوج سے عوام کو بے پناہ محبت ہے۔ پاکستان کا بچہ بچہ اپنی فوج پر فخر محسوس کرتا ہے۔ فوج کے تصور ہی سے ہر پاکستانی مطمئن ہو جاتا ہے جب کبھی یوم استقلال کے موقعے پر عوام کو اپنی فوج کا مارچ پاسٹ دیکھنے کا موقع ملا، آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح عوام فلک بوس نعرے لگاتے ہیں اور خوشی سے جھوم جھوم جاتے ہیں۔ پھر کیا اس وقت کی حکومت کا یہ فعل دانشمندانہ تھا کہ اس نے اس فوج کو اپنوں ہی کے سامنے لا کھڑا کر دیا اور بہادر قوم کی اپنی محبوب اور بہادر فوج سے مڈبھیڑ کرا دی؟ فوج کا کیا قصور ہے۔ اسے جو حکم ملا اس کی بجا آوری کی گئی۔ میں اب اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا حکومتِ وقت نے دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ سخت حماقت کی اور بالآخر اس کا خمیازہ اب بھی بھگت رہی ہے اس حکومت کے ذمہ دار اب کہاں ہیں نہ وہ مرکز رہا نہ وہ صوبائی حکومت رہی۔ مسلمان اب بھی موجود ہیں اسلام کا بنیادی مسئلہ جب تک دنیا قائم ہے موجود رہے گا۔ کیا بات تھی، اگر ایک صحیح بات کو مان لیا جاتا۔ یہ بات بندوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات نہ تھی بلکہ خدا اور اس کے رسول کی بات تھی۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تو فرمایا تھا لا نبی بعدی۔ غلام احمد قادیانی آنجہانی نے کہا کہ نہیں یہ بات درست نہیں ہے۔ میں بھی نبی ہوں۔ اس تحریک اور اسلام کے اس بنیادی مطالبے کو نہ ماننے کے معنی کیا ہوئے؟ آج کے مسلمان حاکم بھی سوچیں۔ ضد اور ہٹ سے کام نہ لیں۔ اب کوئی تحریک نہیں اور نہ کسی تحریک کی ضرورت ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اٹل ہیں انہیں دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ جو کچھ نظر آ رہا ہے۔ اس پر خدا کی حکومت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ سب کچھ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ انسان کو سرتابی کی گنجائش نہیں ہے۔ جائز بات کو تسلیم کر لینا انسان کی فضیلت اور بلندی کا نشان ہے۔ کیا ہرج ہے؟ اگر مسلمان اور مرزائی دونوں کی بات مان لی جائے۔ مرزائی سمجھتے ہیں یہ مسلمان ہم میں سے نہیں ہیں اور یہ اس لیے کافر ہیں کہ غلام احمد کو نبی نہیں مانتے۔ ان میں اور غیر مسلموں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ ان مرزائیوں کا اسلام سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا، ان لوگوں نے غلام احمد کو پیغمبر مان کر

Marfat.com

اسلام سے قطع تعلق کرلیا ہے۔ دونوں اقراری ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں مگر اس کو کیا کہیے کہ حکومت خواہ مخواہ مفتی کا درجہ اختیار کر کے فرمارہی ہے کہ نہیں تم دونوں ایک ہو۔ اگر مرزائیوں کا عقیدہ درست ہے تو ہم کافر ہیں اور اگر ہمارا عقیدہ درست ہے تو مرزائی کافر ہیں۔ بہرحال کسی کو درست مانیے مگر اس حقیقت سے کیوں انکار کیا جارہا ہے کہ دونوں میں سے ایک تو یقیناً کافر ہے۔ تب یہ مطالبہ مان لینے میں کیا ہرج تھا کہ مرزائی اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کی بنیادیں الگ الگ ہیں۔ آج بھی اس حقیقت کو مان لیا جائے تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ اس سے ایک زبردست الجھن دور ہو جاتی ہے [1]۔ میں یہ عرض کررہا تھا مارشل لاء کا نفاذ غیر دانشمندانہ فعل تھا۔ بہتر یہ تھا کہ اسلام کے بنیادی مطالبے کو تسلیم کر کے مستقل خلفشار کو ختم کردیا جاتا۔ اور بلاوجہ مسلمان قوم کو فوج سے نہ الجھایا جاتا۔ بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہو کر رہا۔ مسجد وزیر خان میں صبح وشام تقریریں ہوتی تھیں۔ ہزارہا مسلمان مسجد میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ مولانا بہاؤ الحق صاحب قاسمی، مولانا عبدالستار خان نیازی اور سید خلیل احمد صاحب قادری رات کے جلسے کے بعد مسجد سے چلے جایا کرتے تھے اور ملحقہ محلّہ میں رات بسر کرتے تھے۔ مسجد کی ایک جانب الگ چھوٹا سا دروازہ تھا جہاں سے یہ حضرات چلے جایا کرتے تھے۔ شہر کے دروازے اندر سے عوام بلاک کردیتے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ شہر والوں کے مورچے ہیں۔ بہرحال بیرون شہر پر فوج کا قبضہ تھا اور اندرون شہر پر مجلس عمل اور شہر والے قابض تھے۔ جب شہر کے کسی گوشے پر گولی چلتی تو شہر کے ہر گوشے سے نعرہ تکبیر کی صدا بلند ہوتی۔ راتیں دن بن گئیں اور مسلمان خود موت کی تلاش میں نکل آیا۔ دو دن بعد فوج کو یا ایڈمنسٹری کو خدا جانے کس نے مشورہ دیا کہ مسجد وزیر خان پر قبضہ کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ پانی کے نل کاٹ کر کنکشن ختم کردیا جائے۔ تاکہ اندر کے لوگ تنگ آ کر شہر کے دروازے کھول دیں۔ یہ بھی ہو گیا جلسے پھر بھی ہوتے رہے پھر بجلی کا کنکشن کاٹ دیا گیا۔ تب گیس کے ریلف سے مسجد جگمگانے لگی اور یہ انتظام منٹوں میں ہو گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ لاہور والے جب کچھ کرنے پر آ جائیں تو دنیا کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

---

[1] یاد رہے کہ ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے خلاف ایک بھرپور تحریک چلی اس تحریک میں ۱۹۵۳ء کی تحریک کے شہداء کا خون بھی رنگ لایا اور ایک طویل تحریک کے بعد پارلیمنٹ میں ۱۳ دن کی بحث ہوئی۔ فریقین نے کھل کر اپنا مؤقف پیش کیا۔ بالآخر ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر لاہوری، قادیانی مرزائیوں کو ملک کی ساتویں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا اور اس کا اعلان اس وقت کے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اسمبلی میں اپنی تقریر میں کیا۔ بعد ازاں ۲۶ اپریل ۱۹۸۴ء کو صدر محمد ضیاء الحق مرحوم نے ایک آرڈیننس کے ذریعے شعائر اسلامی کے استعمال سے انہیں روک دیا۔

Marfat.com

یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ اب پولیس اور فوج کو آگے قدم بڑھانے کا موقع ملا۔ مختصر یہ کہ مولانا بہاء الحق قاسمی اور مولانا خلیل احمد صاحب کی گرفتاری کا مرحلہ آ گیا۔ لاہور شہر کے دروازے چونکہ بلاک تھے اور شہر والوں نے اس دربندی سے مورچوں کا کام لے رکھا تھا۔ فوج نے دربندی توڑ کر گھیرا ٹائٹ کرنا شروع کیا اور بالآخر 8 تاریخ کو مسجد کو گھیر لیا۔ اس کے باوجود مسجد میں تقریریں اور جلسے ہوتے رہے۔ مسجد میں رضا کار موجود تھے۔ مقرر دوسری راہ سے آتے اور تقریر کر کے واپس چلے جایا کرتے تھے۔ جب وہ خفیہ راستہ جو گلی کے چھوٹے دروازے سے اندر شہر کی جانب جاتا تھا۔ فوج نے معلوم کر لیا تو اس راستے پر بھی پہرہ بٹھا دیا گیا۔ اب مسجد کے اندر مولانا خلیل احمد اور مولانا بہاء الحق صاحب موجود تھے مولانا خلیل احمد قادری صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کے وارنٹ گرفتاری نکل چکے ہیں اور شام کے وقت ایک میجر کے ہمراہ چند فوجی سپاہی مولانا خلیل احمد کی گرفتاری کے لیے آئے تھے۔ مسجد میں یہ فیصلہ ہوا کہ مولانا خلیل احمد کو پرامن طریقے سے گرفتار ہو جانا چاہیے چنانچہ مولانا گرفتار ہونے کے لیے کسی طرح موچی دروازے پہنچ گئے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی فوجی افسر واپس جا چکے تھے۔ اس لیے مولانا خلیل احمد صاحب دوبارہ مسجد میں آ گئے۔

مولانا خلیل احمد صاحب قادری گرفتار کر لیے گئے

جز وقتی پروفیسر لاء کالج جناب امیر الدین قدوائی صاحب مولانا ابوالحسنات کے عقیدتمندوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مسجد وزیر خان میں تشریف لائے اور مولانا خلیل احمد صاحب سے فرمایا کہ میں میجر جنرل اعظم خاں سے مل کر آیا ہوں۔ آیئے میں ان سے آپ کی ملاقات کرا دوں۔ شاید مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ خلیل صاحب نے یہ سمجھا کہ قبلہ والد صاحب چونکہ کشمیر کے محاذ پر امداد لے کر گئے تھے اور انہیں غازیٔ کشمیر کا خطاب بھی ملا تھا۔ اس لیے میجر جنرل صاحب نے شاید قبلہ والد صاحب کی وجہ سے میرے ساتھ مصالحت کی بات کرنا پسند فرمایا ہو۔ اس لیے قدوائی صاحب کے ہمراہ جنرل صاحب کے پاس چلے جانے میں بظاہر کوئی ہرج نہیں بلکہ تحریک کے لیے مفید ثابت ہو۔ اس لیے وہ مولانا بہاء الحق صاحب کو چارج دے کر خود میجر جنرل صاحب سے ملاقات کے لیے قدوائی صاحب کے ہمراہ مسجد سے باہر آ گئے۔ باہر ایک میجر، دو کپتان اور چند فوجی موجود تھے۔ ان فوجیوں نے خلیل صاحب کو حراست میں لیا اور جیل میں لے گئے قدوائی صاحب بخیریت اپنے گھر تشریف لے گئے مولانا خلیل سے ایک فوجی کرنل نے چند سوالات کیے جن کا جواب سن کر حکم ہوا خلیل صاحب کو حوالات میں بند کر دیا جائے۔ مولانا خلیل احمد کی گرفتاری کے بعد مسجد وزیر خان کی دربندی ہو چکی تھی۔ بہاء الحق صاحب قاسمی چونکہ انچارج تھے۔ اب انہیں یہ فیصلہ کرنا تھا

Marfat.com

ہم سب کس طریقے پر قربانی دیں چنانچہ مولانا بہاء الحق صاحب نے رضا کاروں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ اب گرفتار ہونے کے لیے ہم سب کو بڑے دروازے کو کھول کر خود کو پیش کرنا ہوگا۔ نہیں معلوم فوج ہمارے لیے کیا فیصلہ کرتی ہے؟ آپ سب حضرات مجھے آگے جانے دیں، میں باہر نکلتا ہوں اگر مجھے گولی مار دی گئی تو آپ اپنے لیے خود فیصلہ کر لیں کہ آپ کس طرح گرفتاری یا قربانی دینا چاہتے ہیں۔ رضا کاروں نے جن میں سے اکثر و بیشتر بیرون جات سے آئے تھے مولانا کا فیصلہ قبول نہ کیا۔ بڑی ردو کد کے بعد یہ طے ہوا کہ پرامن طریقے سے پانچ پانچ رضا کار باہر نکلیں اور خود کو قربانی کے لیے پیش کر دیں اور مولانا سب سے بعد میں جائیں تب مولانا نے باہر کھڑے پہرہ داروں کو اس فیصلے سے مطلع کر دیا باہر والوں نے سب کو گرفتار کر لینے کا فیصلہ کیا۔ مولانا بہاء الحق صاحب نے رضا کاروں سے کہا کہ آپ سب حضرات وضو کر لیں اور باوضو ہو کر باہر نکلیں۔ پہرہ داروں نے تقاضا شروع کیا کہ جلدی باہر آؤ۔ مولانا نے انہیں سمجھایا کہ رضا کار وضو کر رہے ہیں، جونہی فارغ ہوئے سب کے سب پانچ پانچ کر کے باہر آتے جائیں گے۔ یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ تمام رضا کار گرفتار ہو چکے تو انہیں لاریوں اور ٹرکوں میں بٹھا کر جیل پہنچا دیا گیا۔ آخر میں مولانا کو گرفتار کیا گیا مگر مولانا کو قلعے میں بھیج دیا گیا اور انہیں پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ مسجد خالی ہو گئی تو اب پولیس اور فوج کو مولانا عبدالستار خان نیازی کی تلاش ہوئی چونکہ مولانا اس وقت مسجد میں موجود نہ تھے۔ تقریر کر کے اپنی آرام گاہ میں پہنچ چکے تھے۔ پولیس نے شہر کو کھنگال ڈالا مگر انہیں نیازی صاحب کا کچھ پتہ نہ چلا۔ فوج نے شہر کی ناکہ بندی کر لی۔ لاہور کے لوگ بڑے منچلے اور دلیر ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پنجابیوں کو زندہ دلانِ پنجاب کا خطاب ملا ہے۔ اس لیے پولیس کے افسر اور سی آئی ڈی کے کارندے گلی کوچوں میں جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ مخدوش حالات میں قدم بڑھانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ان دنوں پولیس کو بیگانہ وار دیکھا جاتا تھا۔ کسی کو پولیس سے ہمدردی نہ تھی بلکہ ایک حد تک غصہ اور خفگی تھی۔ اس لیے مولانا عبدالستار خان نیازی کا کھوج لگانا قدرے مشکل تھا۔ مولانا عبدالستار خان نیازی کے علاوہ مولانا محمد یوسف سیالکوٹی اور دوسرے کارکنوں کی تلاش بھی جاری تھی۔

مولانا عبدالستار خان نیازی کی روانگی

شہر کے چاروں طرف ناکہ بندی تھی مگر لاہور شہر کوئی قصبہ تو نہیں ہے کہ اسے آسانی سے گھیرے میں لے لیا جاتا۔ میلوں میں پھیلا ہوا شہر، لاکھوں انسانوں کی آبادی۔ کہاں کہاں پہرہ بٹھایا جاتا؟ پولیس کو شاید یہ خیال تھا کہ مولانا عبدالستار خان نیازی رات کی تاریکیوں میں گم نہ ہو جائیں مگر

Marfat.com

مارشل لاء اور کرفیو کی موجودگی میں رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ علاوہ ازیں مولانا نیازی ایسا انسان اس طرح چوروں کی طرح دبک کر روپوشی کے لیے تیار ہو جاتا۔ وہ روز روشن میں لاہور سے نکل گئے۔ مولانا نیازی نیک نوجوان اور بہادر انسان ہیں۔ خدا جانے کون سا وظیفہ پڑھ کر دم کیا کہ پہرہ داروں کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا اور نیازی صاحب بلا روک ٹوک شہر سے باہر چلے گئے۔

داستانیں

مولانا عبدالستار خان نیازی کی جس قدر زیادہ تلاش ہوئی اسی قدر غلط افواہوں کی گنجائش پیدا ہوئی، جب عقیدت عقل پر چھا جاتی ہے تو عقیدت مندوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ کسی بے نماز کے بارے میں کہا جائے کہ ہم نے آدھی رات کو اس کی جھونپڑی میں جھانک کر دیکھا تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ سجدہ میں ہیں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو نہریں جاری ہیں۔ ایک شمالی اور دوسری جنوب کی جانب بہہ رہی ہے ان نہروں کے کنارے فرشتے قطار اندر قطار بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ جھونپڑی چاروں سمت منور ہے اس قسم کی داستان عقیدت مند سنتے ہیں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے ہوئے سر دھنتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں مولانا عبدالستار خان نیازی تو پکے نمازی ہونے کے علاوہ بلند پایہ کیریکٹر کے انسان ہیں۔ ان کے لیے جو کچھ بھی کہا جاتا قابل یقین تھا چنانچہ شہر میں عجیب و غریب داستانیں بیان کی گئیں۔ کسی نے کہا کہ مولانا موصوف ہر روز مسجد میں جاتے ہیں۔ پہرہ دار انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ دو چار دن بعد یہ افواہ پھیلی کہ وہ کراچی میں تقریریں کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ پشاور سے لے کر کراچی تک کے شہروں کا نام لیا گیا پھر افواہ ہوئی کہ وہ شہر ہی میں موجود ہیں۔ انہیں فلاں محلے میں دیکھا گیا۔ تب اس محلے والوں کی شامت آئی۔ ہر شخص کو بلا کر ڈرایا دھمکایا اور بے عزت کیا گیا۔ پولیس افسران دانت پیستے اور آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ بالآخر جب پولیس ناکام ہوئی تو اس کے غصے کا پانی نشیب کی جانب بہہ نکلا۔ یعنی پولیس نے احرار کارکنوں کی پرانی لسٹ نکال کر میز پر رکھ لی اور ہر شخص کو گرفتار کر لیا۔ جس کا احرار سے کوئی تعلق رہا تھا۔ جن کمزور لوگوں کو پکڑ کر تشدد کا شکار بنایا گیا۔ ان سے جو چاہا کہلوایا اور اس غلط طریقے سے پولیس خود ہی پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ ایک افسر اور اس کے ماتحتوں نے ایک داستان مکمل کر کے افسر بالا کو پیش کی۔ دوسرے افسر اور اس کے ماتحتوں نے اس سے مختلف افسانہ تراشا۔ افسرانِ بالا نے دونوں کو رد کر دیا اور پھر نئے سرے سے تفتیش شروع کی۔ اس طرح افسانہ در افسانہ بنتا رہا اور معزز اور شریف شہریوں کی وہ بے عزتی ہوئی کہ خدا کی پناہ ایک پولیس افسر نے تو شرافت، انسانیت اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر وہ وہ حرکتیں کیں کہ تہذیب نے سر پیٹ لیا۔ قدرت یہ تماشہ

Marfat.com

دیکھ رہی تھی اور ڈھیل دے رہی تھی۔ ہنگامہ ختم ہوا تو اس پولیس افسر کے بُرے دن آ گئے۔ معطل ہوئے، تنزلی ہوئی اور اب گھر بیٹھے ہیں۔ جب یہ ''دل آرزو'' ڈرامہ ہو رہا تھا تو فرشتوں نے یزداں سے کہا تو ہوگا کہ ہم نہ کہتے تھے کہ یہ خاکی مخلوق بدتہذیبی کا مظاہرہ کرے گی۔ تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت میں حصہ لینے والے علماء احرار کارکنوں سے قلعے میں جس ''شرافت'' کا سلوک ہوا۔ عہدِ فرنگ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ پولیس کو مولانا عبدالستار خان نیازی کی تلاش تھی۔ وہ ملتے نہ تھے۔ لوگوں کو قلعے لے جا کر کہا جاتا تھا کہ جب تک نیازی صاحب نہیں ملتے، تمہارے ساتھ یہی سلوک ہوگا۔ بتاؤ وہ کس راہ سے نکلے اور انہیں کون شہر سے باہر لے گیا۔

سراغ ملا

جب پولیس کو سراغ مِلا بھی تو کیا کہ چوہدری عبدالرحمٰن نمبردار جو ایک نہایت ہی شریف اور معزز انسان ہیں۔ انہیں پکڑ لیا اور ان کے رشتہ داروں کو بھی پکڑ لیا جو احرار سے متعلق تھے۔ انہیں قلعے میں لے گئے اور پولیس نے عادت کے مطابق انتہائی ''شرافت'' کا سلوک کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ مولانا نیازی انہی کے گھر میں رہے ہیں اور انہی لوگوں نے مولانا کو شہر سے باہر نکلنے میں امداد دی ہے۔ چودھری عبدالرحمٰن صاحب پر یہ الزام تھا کہ وہ مولانا عبدالستار خان نیازی کو ہمراہ لے کر لاہور سے باہر چھوڑ آئے ہیں۔ چودھری عبدالرحمٰن صاحب آنکھوں سے معذور تھے۔ وہ کسی سہارے کے بغیر گھر سے باہر نہ نکل سکتے تھے، چودھری صاحب سے دریافت کیا گیا کہ نیازی صاحب کہاں کہاں رہے اور کس طرح شہر سے باہر نکلے۔ اسی افسانے کو حقیقت کا لباس پہنانے کی کوشش کی گئی مگر یہ لباس چودھری عبدالرحمٰن کی معذور آنکھوں کی وجہ سے فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔ بہرحال حاکم لوگ جو چاہیں کہیں اور جو دل چاہے کریں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب شہری آزادی دو عملی میں پھنسی ہوا نہیں ہر قسم کے اختیارات مل جاتے ہیں۔ اس قلعے میں ان دنوں مسلمانوں اور ان کے علماء سے کیا کچھ ہوا۔ اس حقیقت سے یا وہ لوگ واقف ہیں، جن پر گزری یا گزارنے والوں کو معلوم ہے اور سب سے بہتر وہ خدا جانتا ہے جو حاضر و ناظر ہے۔ آزمائش کا وقت تھا جو گزر گیا۔ اب ان دردناک قصوں کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے تحریک کے اس تکلیف دہ باب کو بند ہی رہنے دیا جائے تو اچھا ہے۔ لاہور کے قلعے میں جہاں تحریکِ ختمِ نبوت کے کارکنوں، رہنماؤں اور علماء کو رکھا جاتا تھا، کمزور دل انسان پندرہ منٹ میں گھبرا کر چیخ اٹھتا تھا مگر ہمارے معزز رفقاء علماء اور رضا کاروں نے دو دو تین تین ماہ صبر و استقامت اور ہمت سے گزار دیئے۔

Marfat.com

قارئین کرام جب حکومت کے اس افسانے کا بغور مطالعہ فرمائیں گے تو ان کی عقل اس من گھڑت افسانے پر حیرانی کا اظہار کرے گی کہ ایک بانکے سے نوجوان کو ایک نابینا ضعیف انسان مارشل لاء کے ایام میں کیونکر شہر سے باہر لے گیا اور پھر دور دراز مقامات پر لیے پھرتا رہا۔ بہرحال طاقتوروں کے افسانے میں کمزوروں کو دم مارنے کی گنجائش نہیں رہتی، چودھری عبدالرحمٰن نمبردار کو قلعے سے نکال کر موٹروں میں گھمایا گیا، پھر ایک روز مصیبت کا خاتمہ ہوا اور تمام افسانے دھرے کے دھرے رہ گئے یعنی اطلاع ملی کہ مولانا عبدالستار خان نیازی قصور میں پکڑے گئے ہیں۔ قصور لاہور سے کچھ دور بھی نہیں ہے۔ یہ خبر برق رفتاری سے پھیلی اور قلعے کے ملزموں کی گلوخلاصی ہوئی۔ مولانا عبدالستار خان نیازی نیک اور نمازی نوجوان ہیں وہ جس بھی مسجد میں نماز پڑھنے گئے۔ اس امام کی ''خوش نصیبی'' نے کروٹ لی بڑے بڑے لوگوں نے قلعے کی سیر کی جو نہ دیکھتا تھا دیکھا اور جو نہ سننا تھا سنا۔

نیازی صاحب نے ایسا کیوں کیا؟

نیازی صاحب پنجاب اسمبلی کے رکن تھے چند روز بعد پنجاب اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ نیازی صاحب اس اجلاس میں شمولیت کر کے حالات اور واقعات کو ہاؤس کے سامنے رکھنا چاہتے تھے اور یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کس مسلمان نمائندے کو قوم کی متفقہ آرزو اور مطالبے کے خلاف جانے کی جرأت ہے؟ بہرحال مولانا عبدالستار خان نیازی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں اس اجلاس میں شمولیت کرنا ہے۔ اس لیے وہ تاریخِ مقررہ سے پہلے گرفتار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اسمبلی ہال میں داخل ہونے کا پروگرام بھی بن چکا تھا مگر

صاحب تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

نیازی صاحب کی گرفتاری ان کا مقدمہ ان کی پھانسی کی سزا اور پھانسی کا حکم سننے کے بعد نیازی صاحب نے جرأت اور پامردی کا ثبوت دیا۔

میاں ممتاز محمد خان دولتانہ

میاں صاحب نے 1951ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے خلاف بحیثیت چیف منسٹر جو کچھ کیا۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ میاں صاحب نے اس تحریک کو دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی حتیٰ کہ ہر مسجد کے خطیب کو ٹوڈی قسم کے متولیوں کے ذریعے روکا گیا کہ وہ مرزائیت کا تذکرہ تک نہ کریں۔ سر ظفر اللہ خان کا نام نہ لیں اور تحفظِ ختمِ نبوت کے بارے میں اپنے خطبوں میں کچھ نہ کہیں۔ جب اس سے

Marfat.com

بھی کام نہ چلا تو افسران کے ذریعے ڈرایا دھمکایا گیا۔ مجلسِ احرار سے خواہ مخواہ اُلجھنے کی حرکتیں کی گئیں۔ تا آنکہ احرار رہنماؤں کو زبردستی گرفتار کر لیا گیا۔ سزائیں دیں۔ جب ملک میں آگ لگی تھی۔ بحالتِ مجبوری احرار رہنماؤں کو رہا کرنا پڑا۔ ان سب باتوں کے باوجود ایک مکروہ پراپیگنڈہ ہوا اور یہ کہا گیا کہ اس تحریک کی پشت پر دولتانہ کا ہاتھ ہے۔ مطلب یہ کہ تحریک بھی کمزور پڑ جائے اور دولتانہ صاحب کو بھی بدنام کیا جائے تا کہ ایک پتھر سے دو شکار کیے جا سکیں۔

اس قسم کا پراپیگنڈہ تین گروپوں نے کیا۔ ایک تو مرزائی تھے جن کو ایسا کرنا چاہیے تھا کیونکہ تحریک کی زندگی ان کی موت تھی اور تحریک کی موت میں مرزائیوں کی زندگی کا راز پنہاں تھا۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو دولتانہ صاحب کے ذاتی دشمن ہیں جو انہیں برسر اقتدار دیکھ نہ سکے اور خود اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ تیسرا سرکاری ملازموں کا وہ گروہ تھا جو دولتانہ کی بجائے کسی اور گروہ سے ہمدردی رکھتا تھا۔ بہر حال یہ لغو پراپیگنڈہ بڑی تیزی سے مگر اس کی جانب عوام نے قطعاً توجہ نہ دی اور اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اس لیے یہ پراپیگنڈہ اس وقت اپنی موت آپ مر گیا۔

تحریک تحفظ ختم نبوت کا دوسرا دور شروع ہوا تو یہ تحریک اب صرف مجلس احرار اسلام کی تحریک نہ تھی بلکہ مجلسِ عمل جس میں تمام مسلمان جماعتیں شامل تھیں، اس تحریک کو چلا رہی تھیں۔ ان نو جماعتوں میں سے ایک جماعت بھی دولتانہ صاحب کی ہمنوا نہ تھی مگر بدطینت لوگوں نے پھر بھی یہی پراپیگنڈہ کیا کہ اس تحریک کی پشت پر دولتانہ کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ ہاتھ کی بجائے میاں صاحب کا ''کوڑا'' تھا یعنی پنجاب پولیس ہر وقت تحریک کو ختم کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ جب تحریک نے زور پکڑ لیا اور مسلم لیگ کے رہنما ہر شہر اور ہر قصبے میں تحریک کی وجہ سے زچ ہو گئے اور خود ایماندار مسلم لیگی بھی یکے بعد دیگرے تحریک میں حصہ لینے لگے تو مسلم لیگ کے صوبائی رہنما شاخوں کی شمولیت کی وجہ سے بے حد الجھنوں میں پھنس گئے۔ میاں دولتانہ بہت ذی شعور اور ہوشیار لیڈر ہیں انہیں مستقبل کی پرچھائیاں جو نظر آئیں تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ تحریک کے حق میں ہوا زیادہ تیز ہوئی تو دولتانہ صاحب نے اپنے ہی ساتھیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ راہ کا روڑا بننے کی بجائے راستے سے ہٹ گئے اس سے تحریک کو بھی فائدہ پہنچا اور دولتانہ صاحب بھی مطعون ہونے سے بچ گئے۔ بالآخر میاں صاحب کو عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے تحریک کی مخالفت سے دستبرداری اور ایک حد تک ہمدردی کا دم بھرنا پڑا۔ زبانی ہمدردی 6 مارچ 1953ء تک قائم رہی۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسلمانوں کے مطالبات منظوری کی منزل میں داخل ہو رہے تھے۔ خواجہ ناظم الدین گومگو کی پوزیشن میں تھے کہ اچانک

Marfat.com

حالات نے پلٹا کھایا۔ میاں دولتانہ پر جو الزام لگایا گیا وہ قطعاً غلط تھا۔ مجلسِ احرار یا مجلسِ عمل نہ اس وقت میاں صاحب کے ساتھ تھی اور نہ بعد میں میاں صاحب کی ہمنوا ہوئی تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت کے آڑے اُس وقت کی مسلم لیگی حکومت آئی چھ مارچ 1953ء سے مسلمان قوم سے جو بدسلوکی ہوئی اس کی ذمہ داری مسلم لیگ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ میاں دولتانہ اس وقت بھی مسلم لیگی تھے اور وہ آج بھی مسلم لیگی ہیں۔ اگر صوبائی حکومت اور مرکز کی چپقلش تھی یا میاں دولتانہ اور خواجہ ناظم الدین میں کھٹ پٹ تھی تو یہ مسلم لیگ کا اپنا گھریلو جھگڑا تھا تحریک کا اس سے کوئی واسطہ یا تعلق نہ تھا گو اب یہ سوال کہ میاں صاحب نے یہ تحریک اپنی کسی غرض کے لیے چلوائی تھی بالکل ختم ہو چکا تھا مگر اب بھی بعض سیاسی بزرگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ میاں دولتانہ وہی لیڈر ہیں جنہوں نے خواجہ ناظم الدین کی مخالفت کے لیے تحریک تحفظ ختم نبوت کو چلایا تھا دنیا پاگلوں اور احمقوں سے کبھی خالی نہیں رہتی اس قسم کے کوڑھ مغز اور جاہل آج بھی موجود ہیں اور کل بھی موجود رہیں گے جو ایک لغو اور نامعقول بات کو کہتے چلے جائیں گے لوگ اسے مانیں یا نہ مانیں۔

ہوا یہ کہ پرامن تحریک میں حصہ لینے والوں پر اس لیے بے حد تشدد ہوا کہ عوام ناقابل برداشت تشدد سے بلبلا اٹھیں یا تو بھاگ کھڑے ہوں یا خود تشدد پر اُتر آئیں مگر جب مسلمانوں نے زخمی ہو کر، مر کر، عزیز جانیں دے کر بھی تشدد کا جواب تحمل، بردباری اور صبر سے دیا تو پنجاب کی مسلم لیگی حکومت نے یقین کر لیا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اس تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مطالبات بحالت مجبوری منظور کر لیے جائیں گے، تب میاں صاحب نے عوام کو یقین دلایا کہ آپ کے مطالبات مان لیے جائیں گے۔ کراچی سے نامہ پیام ہو رہا ہے۔ حالات نے ایک اور پلٹا کھایا بے پناہ قربانی کے جذبہ نے اس تحریک کو آندھی کی شکل دے دی۔ جس سے حکومت کی تمام مشینری متاثر ہو گئی۔ مرکزی رہنماؤں نے انتہائی قوت یعنی فوج اور مارشل لاء کے ذریعے نہتے عوام کو اور اس تحریک کے زور کو روک دیا۔

جب فوج آ گئی تو حالات نے نئی کروٹ لی۔

میاں دولتانہ نے 10 تاریخ کو جو بیان دیا تھا۔ ہم نے اس بیان کو کراچی جیل میں پڑھا۔ ہمیں ایسے محسوس ہوا کہ میاں صاحب جو 6 مارچ کو تحریک کی کامیابی کا مژدہ سنا رہے تھے۔ انہیں یہ بیان سنگین حالات میں بادلِ نخواستہ محض اس لیے دینا پڑا ہے کہ شاید یہ بیان انہیں برسر اقتدار رہنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ یہی میاں صاحب کی بھول تھی۔ انہیں دوہرا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ وزارت اعلیٰ کی کرسی پر فیروز خان نون تشریف لے آئے اور میاں صاحب دوطرفہ شکار ہو گئے۔ مسلمانوں نے انہیں تحریک

Marfat.com

کے مخالفوں کی فہرست میں درج کرلیا اوران کے ذاتی مخالفوں نے یہ طعنہ دیا اور الزام لگایا کہ تحریک میاں صاحب نے چلوائی تھی یعنی میاں صاحب کی اتنی بڑی جیب ہے جس میں جماعتیں سما گئیں۔نو جماعتوں اور ساری مسلمان قوم کو یہ خبر نہ ہوسکی کہ وہ میاں صاحب کی جیب میں ہیں۔حقیقتاً یہ الزام میاں صاحب پر نہیں بلکہ تمام مسلمان جماعتوں اور ساری قوم پر اتہام ہے کہ یہ سب لوگ دین کی خاطر یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لیے نہیں کر رہے تھے بلکہ سب کو میاں صاحب کی خوشنودی مطلوب تھی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔بات صرف اتنی ہے کہ میاں دولتانہ مجلسِ عمل کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے یا مقابلہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ تحریک کا رخ مرکز کی جانب تھا۔مسلمانوں کے وفود مرکز سے ملتے تھے۔مسلمانوں نے مرکز کے پاس مطالبات رکھے۔ مطالبات کا تعلق مرکز سے تھا۔مجلس عمل اگر میاں دولتانہ یا حکومت پنجاب سے الجھتی تو یہ کہا جا سکتا تھا اور اس اعتراض میں بڑا وزن ہوتا کہ مطالبات تو مرکز سے کیے جا رہے ہیں اور تحریک صوبائی حکومت کے خلاف چلائی جا رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ میاں صاحب خاموش تھے انہیں اس تحریک سے بلاوجہ الجھنے اور آ بیل مجھے مار کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔یہ الگ بات ہے کہ تحریک کو کچلنے اور شہدائے ختم نبوت کے خون سے وہ بری الذمہ نہیں ہیں۔میاں ممتاز دولتانہ اور جنرل اعظم خان نے اپنے عہدوں کی حفاظت کے لئے شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں کا کردار ادا کیا۔مجلس احرار سمیت مجلس عمل کی تمام جماعتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے تحفظ کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت اور جانوں کے نذرانے پیش کر رہی تھیں۔جن کے پیش نظر کرسی واقتدار کی بجائے نجاتِ اخروی تھی۔اِس لیے انہوں نے تحریک ختم نبوت برپا کی جو مفادات پرست سیاست دانوں کے خودغرضانہ تعاون اور طمع آمیز پشت پناہی سے پاک تھی۔اللہ تعالیٰ اِس جدوجہد کو اَپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشیں اور ہم سب کے لیے باعثِ نجات بنادیں۔آمین۔

Marfat.com

بیان صادق

من جانب مجلس احرارِ اسلام بہ جواب
جماعت اسلامی بہ سلسلہ تحریک تحفظ ختم نبوت 1953ء

محترم ماسٹر تاج الدین انصاریؒ رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

تقدیم

سید ابو معاویہ ابوذر بخاریؒ

(1)۔ تاریخی تفصیلات کے مطابق جماعت نے اپنے پختہ اور قابلِ رشک دینی مزاج اور غیرت مندانہ سیاسی موقف کے زیرِ اثر آغازِ زندگی سے لے کر تقسیم ملک تک حصولِ آزادی کے لیے مختلف اوقات میں کوئی درجن بھر تحریکات چلائی مجموعی طور پر کامیاب اور مفید و مؤثر ثابت ہوئیں اور ملک و ملت کے لیے ایک روشن مستقبل کی ضامن بن گئیں۔ بعد از تقسیم اس کے عظیم و قابلِ فخر اور انتہائی دُوررس اثرات کے حامل کارناموں میں ''تحریک مقدس تحفظ ختم نبوت'' کو بلند اور اہم ترین مقام حاصل ہے، جیسے فوج جسم و جان اور سامانِ حرب و ضرب کے ساتھ مادی طور پر ملک کا تحفظ کرتی ہے۔ اہلِ حق اعلانِ حق اور قوت ایمان کے مظاہرات کے ذریعہ ملک و ملت کے اعتقادی تصلب، فکری استحکام اور اجتماعی جوشِ عمل گویا پورے دین و سیاست کے روحانی اور ظاہری تحفظ و بقاء کا سبب بن جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ عظیم اور پاکیزہ تحریک اپنے آغاز سے قریباً بیس پچیس ۲۵ سال پہلے کی مسلسل جدوجہد کے قدرتی نتیجہ میں مشعلِ ہدایت اور مینارۂ نور بن کر نُمودار ہوئی۔ اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ تشکیلِ پاکستان کے وقت ملت اسلامیہ جن نا قابلِ ترمیم و اضافہ دینی اصول و عقائد پر اپنی زندگی کی دستوری تعمیر کے لیے بے چین اور دیوانہ ہو رہی تھی۔ ان کی اس بے قراری کو زبانِ عمل سے ظاہر کرنے کی صورت پیدا ہو یعنی کار پردازانِ تحریک پاکستان کے جذبات انگیز اسلامی نعروں کو عمل کی میزان میں تولنے کے لیے دعوتِ مبارزۃ دیتے ہوئے فرنگی کا بنایا ہوا مردم شماری کا رجسٹر اور دفتر اُلٹ دیا جائے۔ مسلمانوں کی پارلیمنٹ کلمہ اسلام کے پونے چودہ سو سالہ موروثی و امتیاز کے ذریعہ مدعی نبوت کاذبہ کے پیروکار قادیانی اور لاہوری مرزائیوں کو ان کے اپنے ہی مختلف اور اب تک کے مسلسل دعاوی کے تحت مسلمانوں سے الگ کرتے ہوئے ایک خلافِ قانون فرقہ اور جماعت قرار دے کر مسلمانوں کے پرانے زخموں کا مداوی کر دے۔

Marfat.com

(2)۔ تحریکِ چلی اور برصغیر ہندو پاک کی دھرتی پر ۱۸۵۷ء کی تحریک بغاوت کے بعد سب سے پہلے سب سے عظیم اور بے مثال خالص دینی تحریک کے طور پر قومی تاریخ کا سنگِ میل قرار پا گئی۔ اسی تحریک کی شدت وقوت اور وسعت وعظمت کے طفیل سے، بے مروت بے وفا، وعدہ خلاف اور خائن قائدین تحریک پاکستان اور ارباب اقتدار کے برسوں پرانے تمام جھوٹے اسلامی نعروں کی قلعی کھل گئی۔ تمام اعداء اسلام اور دشمنان احرار انگریز پرستوں اور مذہبی ملمع کار سرکاری ٹاؤٹوں نے تحریک کو تہ وبالا کرنے اور تحریک میں شامل تمام مسلم فرقوں کے نمائندہ زعماً اور ان کی قیادت میں ہر قسم کی قربانی کر گزرنے والے مخلص و پر جوش اور سچے مسلمانوں کو خاک وخون میں تڑپانے کے لیے وقت کی ظالم و بدعہد اور ننگِ اسلام و مسلمین حکومت ناپاک گٹھ جوڑ اور سیاسی سازش کا گھناؤنا کردار ادا کیا۔ جس کے راز اسی مبارک تحریک نے طشت از بام کیے۔ اس دور کے بھرو پیا کرم فرماؤں میں محترمہ و مقدسہ ''جماعت اسلامی'' سرفہرست شمار ہوتی ہے۔ پروپیگنڈے کے یورپین ہتھکنڈوں کی ماہر ومشاق اور اسلام کی خودساختہ ٹھیکیدار اس جماعت نے پوری موقع پرستی، خالص تاجرانہ ذہنیت اور پکی دنیا دارانہ اور دوغلی سیاست کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس کے قائد اور مندوب تحریک کے عُروج میں کسی سنہرے مستقبل کی جھلک محسوس کرتے ہوئے قریباً پونے دو سال تک نہ صرف اس کے شریک کار بنے رہے بلکہ عادت اور زبردست خواہش کے مطابق انہوں نے اپنے آپ کو تحریک کا بہت نمایاں عنصر ثابت کرنے کی پالیسی اپنائے رکھی اور جب تحریک ظلم وتشدد کا شکار ہونے لگی تو مصنوعی اعتدال ومیانہ روی اور فرضی امن پسندی وقانون پروری چھوڑ چھاڑ کر فیصلہ کن گھڑی میں وعدہ معاف، سلطانی گواہوں کا روپ دھار لیا۔ تحریک کے ظاہری خاتمہ پر حکومت کے قائم کردہ ''منیر انکوائری کورٹ'' کے روبرو تحریک میں اپنی باقاعدہ شمولیت، مجلس عمل کے مشوروں میں شرکت بلکہ منصوبہ بندی اور اس کے راست اقدام تک تمام کارروائیوں سے وابستگی کے متعلق انتہائی خیرہ چشمی کے ساتھ دیدہ دلیرانہ تاویل بازی اور انحراف کا مظاہرہ کر دیا۔ جماعت کے قائد اعظم علامہ مودودی صاحب کے بیان صفائی سے لے کر تحریک کے متعلق اس جماعت کے تمام مثبت ومنفی لٹریچر میں اپنی جھوٹی صفائیوں کے انبار لگا دیئے گئے اور حد یہ ہے کہ قائدین وفدائیانِ تحریک کی زندگی میں ہی جھوٹ کی اس پوٹ اور تاویل وحیلہ کاری کے اس پلندے کو نشان بے گناہی ثابت کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ اس

Marfat.com

خالص دینی اور قومی تحریک سے علانیہ بے وفائی وغداری کو الٹا اپنا فخریہ کارنامہ بنا کر پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا کاروبار جاری رکھا۔

(3)۔ پانی سر سے گزرتا دیکھ کر مجلس احرار اسلام کے سیاسی مبصر، محترم ماسٹر تاج الدین لدھیانوی نے جو پوری تحریک کے نہ صرف رہنماؤں میں شامل تھے بلکہ اوّل سے آخر تک تمام شرکاء تحریک کے مالہ وماعلیہ کے شاہدِ عدل بھی رہے ہیں۔ بنام خدا قلم سنبھالا اور جوابِ تُرکی بہ تُرکی کے مطابق زیرِ نظر رسالہ مرتب کر کے دین مظلوم کے بے درد دعویداروں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس کے بعد حرکت مذبوحی کے طور پر ہاتھ پاؤں تو بہت مارے گئے، لیکن آج سولہ ۱۶ برس گزر جانے پر بھی پیسے اور پروپیگنڈے کے تمام علانیہ اور خفیہ وسائل موجود ہونے کے باوجود اس جماعت کے بزرجمہروں کی برحق وصداقت اُصولی جواب کی ایک سطر تک لکھنے کی جرأت نہیں ہوسکی۔ چونکہ عوام ہنگامہ اور وقتی جوش ہیجان کے بعد ہر تحریک کی تفصیلات عموماً فراموش کر دیتے ہیں۔ اس لیے ہر سیاسی ___ موڑ پر انہیں گذشتہ واقعات کی مصدقہ تفصیلات سے مکمل طور پر باخبر رکھنا ازبس ضروری ہے۔ آج جبکہ ہر معاملہ میں دوسروں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر کے مفت کا انعام اور کریڈٹ حاصل کرنے کی خوگر اور آرزوئے اقتدار میں اپنی تقیہ نما حکمت عملی کے بل بوتے پر ہر ناجائز کو جائز بنانے والی یہ برگزیدہ اور مقدس جماعت'' ___ پھر اپنی واحد نمائندگی اور اسلامی اجارہ داری کا چکر چلانے میں اندھا دھند مصروف ہے اور اربابِ اقتدار سے لادین جمہوریت کے نام پر اسلام کی بھیک مانگ کر اور سوشلزم کے خلاف بہ زعم خویش قیادت عظمیٰ کی علمبردار بن کر دراصل تحریک تحفظ ختم نبوت کی عظمت واہمیت کو ختم کرنے کے منصوبہ پر عمل پیرا ہے تاکہ عوام اور دینی جماعتیں اس کی سابقہ فریب آمیز کارروائیوں کا حساب دستور بنانے کی مہم اس کی سیاست کا روڑا نہ بن جائے ___ محترم ماسٹر صاحب کا یہ انتہائی اہم جماعتی بیان اور قابل قدر تاریخی وَ دستاویزی وثیقہ دوبارہ شائع کیا جارہا ہے تاکہ دین کے فدائی عوام اسلام کے سب سے بلند اور سب سے اہم مسئلہ کے متعلق اس جماعت کی بے وفائی، خیانت اور اپنے نئے اجتہادی مذہب ومسلک کے مطابق اسلام کے نام پر خالص دنیادارانہ سیاست بازی سے آگاہ رہتے ہوئے ''اسلامی آئین بہ تشریح مسئلہ ختم نبوت'' کی اپنی اصل منزل مقصود کی طرف تیزی کے ساتھ گامزن رہیں۔ اس جماعت نے دنیا کی ہر اسلامی تحریک میں

Marfat.com

کیڑے نکال کر مقابلہ میں اپنی فوقیت جتلانے کا مکروہ مشغلہ ــــ تحریک ختم نبوت کے متعلق بھی بدستور جاری رکھا ہوا ہے۔ لیکن اصل حقیقت کیا تھی؟ انکوائری کورٹ میں احرام کو بیان صفائی تک کی اجازت دینے اور جماعت کو خلاف قانون قرار دیے جانے کی سراسر یک طرفہ وظالمانہ اور تباہ کن پابندیوں اور مجبوریوں سے مکمل ناجائز فائدہ اٹھا کر اس جماعت نے رائی سے کتنے پہاڑ بنائے اور سفید جھوٹوں کے انبار کو اپنی سچائیوں، پاکبازیوں اور فرضی کامیابیوں کا لبادہ کس طرح پہنایا اور خیالات ونظریات کی تردید کے واقعات وحقائق کے مسخ وانکار کی شرمناک جرأت کیسے کی؟ اس کے پوست کندہ حالات زیر نظر کتابچہ ''بیان صادق'' میں ملاحظہ کیجئے تاکہ ملکی وقومی تاریخ کا یہ باب تاویل وتحریف کی گندگی سے آلودہ ہو کر نئی نسل کی مسئلہ ختم نبوت سے بے خبری اور جہالت وبرگشتگی کا ذریعہ نہ بن جائے۔ و اللّٰہ الْمُوَفِّق وَھُوَ الْمُستعان۔!

راقم السطور: فقیر ابن امیر شریعت

سید ابو معاویہ ابوذر بخاری

خادم وناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام پاکستان

نزیل دفتر مرکزیہ مقابل مزار شاہ محمد غوث

سرکلر روڈ لاہور

دوپہر پنجشنبہ ۲۲/۱/۸۹ھ

۱۰/۴/۶۹ء

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ
ھٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاس یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُو اتَّقُو اللّٰہَ وَ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ

(۱) ___ خدا کا فضل شامل حال رہا کہ تیس پینتیس سال کی سیاسی زندگی میں مجھے بیان بازی کا مرض لاحق نہیں ہوا۔ کبھی کبھار تو ایسا ہوا کہ کسی نے بلاوجہ الجھنے کی مسلسل کوشش کی۔ تو تنگ آ کر ایک بار جو صحیح بات تھی اس کا اظہار کر دیا اور بس۔ جواب الجواب کی الجھنوں میں نہ کبھی الجھا ہوں نہ کبھی الجھنے کا ارادہ ہے۔ جماعت اسلامی کی جانب سے نوازشات کی بھرمار نے زحمت کی صورت اختیار کر لی اور پانی سر سے اونچا جانے لگا تو بحالت مجبوری مجھے اِن گزارشات کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جماعت اسلامی کی مسلسل نیش زنی سے تنگ آ کر امیر شریعت سیدؒ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے طویل صبر آزما خاموشی کے بعد لائل پور تبلیغ کانفرنس میں مولانا سیدؒ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو ان کی غلط بیانی پر شرعی انداز میں ٹوکا۔ ان کی تقریر ان الفاظ سے ہے۔

''یا اللہ! تحریکِ تحفظ ختم نبوت میں شمولیت سے اگر میرے دل میں خلوص نیّت کے علاوہ رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی ایسا خیال تھا کہ تحریک ختم نبوت کے ذریعہ سیاسی اقتدار حاصل کیا جائے تو مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر تیرا غضب نازل ہو'' اس کے بعد فرمایا کہ ''مودودی صاحب کراچی کنونشن میں میرے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا ملا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی میں راست اقدام کا ریزولیشن پاس ہوا۔ جس پر دوسرے سینکڑوں علماء سمیت انہوں نے دستخط کیے اور وہ کاغذ منیر انکوائری کورٹ میں پیش بھی ہو چکا ہے۔ وہ آخر دم تک تحریک میں شامل رہے۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ وہ تحریک میں شامل نہیں تھے تو میں انہیں دعوت مباہلہ دیتا ہوں''۔ وغیر ذالک۔

(۲) ___ حضرت شاہ صاحب کے چیلنج سے امیر جماعت اسلامی بوکھلا گئے۔ اسی بوکھلاہٹ میں ''بیان حقیقت'' کے عنوان سے ایک بیان شائع فرمایا جس میں شاہ صاحب کے مخاطب کرنے کی بجائے دور از کار غلط سلط باتیں فرما کر سبھی کو لپیٹ لیا۔ اس بیان میں مولانا موصوف نے اپنے دامن کا داغ دوسرے کے دامن لگانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے چیلنج کو مولانا سیدؒ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس بیان کے ذریعے دراصل طرح دے گئے ہیں۔

اب میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تحریک ختم نبوت کے تمام صحیح واقعات عرض کر دوں تاکہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جو غلط بیانیاں فرمائی ہیں وہ منظر عام پر آ جائیں۔ اس ناخوشگوار فرض کو میں دکھے ہوئے دل سے ادا کر رہا ہوں۔

Marfat.com

کراچی کنونشن

(۳)___ حضرت مولانا ابوالحسنات سید احمد صاحب قادری مدظلہ کی زیر صدارت آل پارٹیز مسلم کنونشن کا تاریخی اجلاس بدیں غرض کہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے بارے میں آخری فیصلہ کیا جائے۔ مورخہ ۱۶ جنوری ۵۳ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ بنگال سے لیکر صوبہ سرحد تک کے نمائندوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ اور کاروائی میں باقاعدہ حصہ لیا۔ تقریریں شروع ہوئیں تو صاحب صدر نے مسئلہ کی اہمیت اور وقت کی نزاکت کے پیش نظر شرکاء مجلس سے تقریریں مختصرا ور مطلب کی بات کہنے کی اپیل کی۔ دوسرے حضرات کے علاوہ مولانا سیّد ابوالاعلےٰ مودودی صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا کہ چند آدمی الگ بیٹھ کر باہمی مشورہ سے ہاؤس کے سامنے کوئی مناسب اور قابل عمل تجویز پیش کریں تاکہ بے ضرورت باتوں میں قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔ یہ معقول تجویز مان لی گئی تو تیرہ ۱۳ آدمیوں کو منتخب کر کے یہ کام ان کے سپرد کر دیا گیا اور اجلاس ۱۸ جنوری کے لیے ملتوی ہو گیا۔ ۱۷ کی رات کو تیرہ میں سے صرف نو یا دس حضرات جمع ہوئے اور باہمی مشورہ اور مبادلہ خیال کیا گیا۔

سب کمیٹی کی میٹنگ

(۴)___ مجھے اس وقت مندرجہ حضرات کے نام یاد ہیں جو سب کمیٹی میں شریک ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی، حضرت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی، علامہ حافظ محمد کفایت حسین صاحب، مولانا ابوالاعلےٰ مودودی، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب (بنگالی)، مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، مولانا محمد علی صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب کلکتوی، سید مظفر علی شاہ صاحب شمسی، تاج الدین انصاری۔

سب کمیٹی کی کاروائی شروع ہوئی اور تحفظ ختم نبوت کی تحریک کے سلسلہ میں مبادلہ خیال ہوتا رہا۔ مولانا سید ابوالاعلےٰ ابتدائی گفتگو کے وقت خاموش بیٹھے تھے۔ مگر جب وہ گویا ہوئے تو فرمانے لگے کہ آپ کے اس مطالبہ کو ہم نے اپنے آٹھ مطالبات کی فہرست میں نواں مطالبہ بنا کر پیش کر دیا ہے۔ اب اس تحریک کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ دستور ہی میں آپ کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ آئندہ تمام جدوجہد دستوری ہی کے نام سے ہونی چاہیے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے ارشاد کے جواب میں مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی نے فرمایا کہ مولانا صاحب آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے آپ شاید سمجھتے ہیں کہ آل مسلم پارٹیز کنونشن پنجاب سے بن کر آئی ہے اور جو مطالبات پیش کیئے جار

Marfat.com

ہیں۔ یہ بھی پنجاب والوں کے مطالبات ہیں۔ میں آپ کی آگاہی کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ ۲ جون ۵۲ء کو زیر صدارت مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی تہیو سافیکل ہال کراچی کی تمام اسلامی پارٹیوں کی جانب سے ایک کنونشن بلائی گئی تھی۔ جس میں جماعت اسلامی کا نمائندہ بھی موجود تھی۔ اس کنونشن میں یہ تجویز ہوئی تھی کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے لیے بڑے پیمانے پر آل مسلم پارٹیز کنونشن بلائی جائے۔ جس کے ذریعے مرزائیوں کو اقلیّت قرار دینے کی جدوجہد کی جائے۔ موجودہ کنونشن دراصل ہماری اس کنونشن کا نتیجہ ہے۔ جو ۲ جون کو منعقد ہوئی تھی۔ جس کی غرض وغایت واضح اور محدود تھی۔ آج مجھے یا آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اصل مطالبات سے ادھر ادھر جاسکیں۔ اگر ہم ان مطالبات کو دستوری جدوجہد سے وابستہ کر دیں تو یہ بات ضابطہ کے بالکل خلاف ہوگی۔ مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی کے ارشادات کی تائید میں میں نے اصولی اختلافات پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ جس کام کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اور جس غرض کے لیے کنونشن بلائی گئی ہے۔ اس کی بالکل جداگانہ حیثیت ہے۔ دستور اپنی جگہ ہے۔ ۳۳ جید علماء دستور کے کام میں مصروف ہیں۔ ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم اپنے احاطہ اختیار سے باہر جائیں۔ ہمیں کنونشن نے جو کام سپرد کیا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے کہ ہم طریق کار کی تجویز مرتب کر کے ہاؤس کے سامنے پیش کر دیں۔ اس کے علاوہ اگر کچھ کیا گیا تو وہ خلاف ضابطہ ہوگا۔ ہماری گزارشات کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک طویل تقریر فرمائی اور بار بار یہی فرماتے رہے۔ کہ جو کچھ کرنا ہے دستور کے نام پر کیجئے۔ ہم نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کہ اگر ہم سب مل کر صاحب دستور حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کی حفاظت کی جدوجہد میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں تو دستور کا کام بالکل آسان ہو جائے۔ دستور کی راہ میں مرزائیت اور مرزائیت نواز پہاڑ بن کر کھڑے ہیں۔ یہ مرحلہ ہو جائے تو دستور کی کامیابی قریب تر ہو جاتی ہے۔ مولانا سید ابوالاعلےٰ مودودی کو معقول بات اپیل تو کر رہی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل میں پوشیدہ خواہشات اور اقتدار حاصل کرنے کے سنہرے خواب انہیں اس بات کے تسلیم کرنے پر راضی نہ ہونے دیتے تھے۔ بحث جاری رہی۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی ناسازی طبع کی وجہ سے معذرت کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ اسی تکلیف کی حالت میں ہم انہیں دو مرتبہ اٹھا کر میٹنگ میں لائے۔ مگر انہیں اس درجہ تکلیف تھی کہ زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکے۔

مولانا محمد علی جالندھری نے کیا کہا؟

(۵)___ مولانا محمد علی جالندھری نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو مخاطب فرما کر کہا کہ

Marfat.com

مولانا؟ ''تحفظ ختم نبوت کے مطالبات ایسے مطالبات ہیں۔ جن کی پشت بر بلا کسی اختلاف کے ہر مکتب خیال کے مسلمانوں کی ہمدردیاں اور پشت پناہی موجود ہے۔ دستور میں ترمیمیں اور تنسیخیں ہو رہی ہیں یہ سلسلہ ابھی کافی وقت لے گا۔

دوسری بات جس پر آپ کو ٹھنڈے دل سے غور فرمانا چاہیے یہ جب دستور کا کام آتا ہے تو غلط یا صحیح ہیں اس بحث میں نہیں پڑتا اور صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ لوگوں کا ذہن آپ کے بے پناہ پراپیگنڈے کی وجہ سے جماعت اسلامی کی طرف سے منعطف ہو جاتا ہے۔ جماعت اسلامی سے لوگوں کو وہ ہمدردیاں نہیں ہیں جو ہمدردی اور لگاؤ مسئلہ تحفظ ختم نبوت سے ہے یا جو جذبہ مرزائیت کے خلاف ہر مکتب خیال کے مسلمانوں میں موجود ہے۔ اسی طرح آج سے چھ ماہ بیشتر یہی حال مجلس احرار کا تھا۔ جہاں رد مرزائیت کا نام آتا لوگوں کا ذہن مجلس احرار کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ اسی خیال سے ہم نے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر برکت علی محمڈن ہال میں ہی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اور دین کا یہ کام دوسری تمام دینی جماعتوں کے سپرد کر کے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اگر تحفظ ختم نبوت کا نام آتا ہے تو لوگوں کے ذہن میں آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کا تصور لازمی اور لابدی آجاتا ہے۔ اصولی اعتراض کے علاوہ اس مشکل کی طرف بھی آپ توجہ فرمائیں اور اس اہم مطالبہ کو نواں نقطہ بنانے کا خیال ترک فرمائیں۔

سب کچھ سننے کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی بات پر اڑے رہے۔ بحث نے مایوس کن صورت پیدا کر دی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا موصوف کو صاحب دستور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو اور عظمت کی نسبت دستور کا زیادہ خیال تھا۔ ان کے محاکمہ نویس نمائندے نے لکھا ہے۔

''اس مرحلہ پر مولانا محمد علی صاحب نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی اور ان سے عرض کیا کہ مولانا صاحب اگر آپ کی طرح احرار کا انداز فکر بھی یہی ہوتا اور وہ بھی یہی سوچتے کہ مجلس عمل کہاں سے آگئی یہ ردِ مرزائیت تو ہمارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ یہ کام ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو ہم کہاں جائیں۔ اگر خدانخواستہ خود غرضانہ ضد ہم بھی کرتے تو پھر کیا موجودہ صورت پیدا ہو سکتی تھی۔''؟

(۶) ___ آج ہر مکتب خیال کے علماء اور سجادہ نشین حضرات اس بنیادی مسئلہ کے لئے سر جوڑ کر بیٹھ رہے ہیں۔ اگر ہم اپنے نام کا خیال ترک نہ کرتے تو کیا مسلمانوں میں بے پناہ جوش اور عقیدت

Marfat.com

کا یہ والہانہ جذبہ پیدا ہوسکتا تھا؟

یہ تھی وہ گفتگو جو مولانا محمد علی اور ابوالاعلیٰ مودودی میں ہوئی توڑ مروڑ کر جس انداز میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمایا ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔

انصاف فرمایئے!

(۷)___ آٹھ دس معزز نمائندے مجلس میں موجود ہیں۔ بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مولانا محمد علی یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر یہ تحریک اسلامی دستور کے نام سے چلائی جائے تو احرار کہاں جائیں گے۔ مولانا محمد علی صاحب اگر ایسی گفتگو کرتے تو دوسرے معزز نمائندے جو اس میٹنگ میں موجود تھے۔ مولانا محمد علی کی کیا گت بناتے؟ کیا ان سب حضرات کو یہ حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ مولانا محمد علی کی اس قسم کی مناسب اور خود غرضانہ گفتگو سنتے تو انہیں برملا کہہ دیتے کہ احرار جائیں بھاڑ میں یہ مطالبہ تو مجلس عمل کا مطالبہ ہے۔ احرار تنہا کون ہوتے ہیں؟ وہ تو نو جماعتوں میں سے صرف ایک ہیں۔ مولانا بدایونی، مولانا تھانوی، مولانا غزنوی، علامہ حافظ کفایت حسین، مولانا عزیز الرحمٰن (بنگالی)، اور مظفر علی شمسی ایسے نڈر اور مخلص حضرات اور دیگر اکابرین موجود ہیں۔ کیا یہ سب کے سب منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے اور کسی نے زبان تک نہ ہلائی۔ کیا یہ بات قرین قیاس بھی ہے؟

(۸)___ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہی سے یہ دریافت کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ مولانا محمد علی نے یہی کہا تھا۔ جو آپ فرماتے ہیں تو ایسی لغو حرکت پر تو آپ اسی دن احرار کے خلاف ایک بیان دے کر انہیں موت کے گھاٹ اُتار سکتے تھے آپ نے ایسی مجرمانہ درگذر سے کیوں کام لیا؟ میں آپ کو بزدلی اور منافقت کا طعنہ نہیں دیتا۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے مولانا محمد علی کے خلاف تہمت تراشی ہے۔ جو آپ ایسے ''صالح'' انسان کی، شایان شان نہیں۔ آپ نے کوئی تہمت لگانا ہی تھی تو کچھ سوچ سمجھ کر افسانہ گھڑا ہوتا۔ کس سادگی سے آپ نے یہ بات مولانا محمد علی سے منسوب کی کہ اگر دستور کے نام پر کام ہوا تو احرار کہاں جائیں گے''؟

انتخابات کا سوال

(۹)___ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے جب آل مسلم پارٹیز کو جماعت اسلامی کا دُم چھلا بنانے کی کوشش میں رات کے بارہ بجا دیئے تو مولانا احتشام الحق صاحب نے سب کمیٹی کے اراکین کے سامنے ایک خدشہ کا اظہار فرمایا۔ وہ غالباً اس طویل اور غلط بحث سے اُکتا گئے تھے۔ وہ فرمانے لگے آپ حضرات میری اس خلش کو دُور فرما کر ممنون فرمائیں۔ مجھے یہ خدشہ ہے کہ

Marfat.com

آپ حضرات جو مختلف جماعتوں ں کے نمائندوں کی حیثیت سے تشریف لائے ہیں۔ مجھے یہ بتائیں کہ اگر تحریک ختم نبوت طول پکڑ جائے اور اس عرصہ میں الیکشن آجائیں۔ کیا آپ الیکشنوں میں اُلجھ تو نہ جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ تحریک تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اور دانستہ یا نادانستہ اس مقدس تحریک کے ساتھ غداری ہوگی۔ مولانا احتشام الحق صاحب کے اس سوال نے سب کو چونکا دیا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تو لبوں پر زبان پھیر کر پینترے بدلنے لگے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سوا باقی سب نے کہا کہ سوال بہت اہم ہے اور قابل توجہ ہے۔ ہم کو یہاں اقرار کرنا چاہیے۔ اس تحریک کو انتخابات کے جھمیلوں سے بالکل الگ رکھا جائے گا۔ فرداً فرداً تقریباً سب نے اقرار کرنا شروع کیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کچھ دیر تو خاموش رہے۔ پھر فرمانے لگے ''مجھے اس اقرار میں تامّل ہے میں یہ اعلان نہیں کرسکتا'' کہ جماعت اسلامی انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ مولانا احتشام الحق صاحب نے اپنے خدشہ کی مزید وضاحت فرمائی اور معاملہ کی اہمیت پر زور دیا۔ مگر جب مولانا سید ابوالاعلیٰ، مودودی نہ مانے تو مولانا احتشام الحق صاحب دل برداشتہ ہوگئے۔ اس کے بعد وہ بیٹھے تو رہے مگر کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہ فرمایا۔

مودودی صاحب کی جماعتی عقیدت

(۱۰)____ بحث معقول ہو۔ اصولی اعتراضات ہوں۔ نیتوں کا خلوص معاملہ سلجھانے کی راہیں تلاش کرتا ہو تو مشکل مراحل بھی طے ہو جاتے ہیں۔ مگر جہاں جماعتی عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ دوسرے انسان کم درجہ کے نظر آنے لگیں اور طبیعت یہ فیصلہ کر ہی لے کہ اپنے سوا کسی اور کو خواہ وہ کتنا بلند پایہ کیوں نہ ہو۔ اپنا بڑا مان کر کسی کے ساتھ یا کسی کو رہنما مان کر چلنا ہی نہیں تو پھر مشکلات ہی مشکلات اور تباہیاں مقدر ہو جایا کرتی ہیں۔ اس میٹنگ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اقتدار اور عصبیت کے گرداب میں غوطہ کھا رہے تھے۔ جب اجلاس میں تقریباً جمود طاری ہو گیا تو مولانا محمد علی صاحب نے مجھے فرمایا کہ اب کیا کریں جماعت اسلامی کے امیر تو گل محمد بنے بیٹھے ہیں۔ میں خود بھی حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ بالآخر میری طبیعت نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ضد کے سامنے سے ہٹ جانا ہی مناسب ہے۔ چنانچہ میں نے مولانا علی صاحب اور شمسی صاحب سے جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے عرض کیا کہ بھئی مولانا مودودی صاحب ضد کرتے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اگر اپنی غلط پوزیشن پر اڑ گئے تو انہیں کرنے

Marfat.com

دیجئے یہ کیا کرتے ہیں۔ ایک جماعت کے امیر ہوتے ہوئے اگر یہ محسوس نہیں کرتے اور سب کمیٹی کے حُدودِ اختیار سے باہر قدم رکھ رہے ہیں۔ تو انہیں من مانی کر لینے دیجئے۔ یہ تو مولانا احتشام الحق صاحب کی بات پر کان دھرتے ہیں اور نہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہیں۔ ہم ان سے کب تک اُلجھیں۔ سوئے ہوئے انسان کو جگایا جاسکتا ہے مگر جو شخص جاگتے میں آنکھیں بند کرلے اس کا کیا علاج ہے؟ اس مرحلہ پر مولانا محمد علی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے کہا۔ لکھوایئے! مولانا کی تجویز لکھی جانے لگی۔ بگر نامناسبت اور بے اصول پن نے تجویز کی چولیں ڈھیلی کردیں۔ کانٹ چھانٹ ہوتی رہی۔ یہ تجویز لکھی جا چکی تو بغیر کسی حادثہ کے یہ میٹنگ برخاست ہوگئی۔

کنونشن کا آخری اجلاس

سب کمیٹی کی تجویز اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

(۱۱) ___ ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کنونشن کا آخری اور فیصلہ کن اجلاس شروع ہونے سے قبل حاضرین مجلس نے سب کمیٹی کے ارکان سے دریافت کیا کہ گزشتہ اجلاس میں آپ کے ذمہ جو ڈیوٹی لگائی گئی تھی اس کا کیا بنا؟ لایئے وہ تجویز دکھایئے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی، سید مظفر علی شاہ شمسی اور دیگر موجود اراکین سب کمیٹی کو حاضرین نے گھیر لیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ وہ اس وقت تشریف لایا کرتے تھے جب اور سب آجائیں۔ سب کمیٹی کے ارکان مولانا موصوف کا انتظار کرتے تھے اور حاضرین مجلس کو ٹال رہے تھے۔ حقیقتاً سب کمیٹی کی تجویز کے مجوز مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے تحریک تحفظ ختم نبوت سے براہ راست کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس تجویز کا منطقی نتیجہ تحریک ختم نبوت کو............ جماعت اسلامی کی سپرداری میں دے کر کولڈ سٹورج (سردخانہ) میں محفوظ کردینے کے مترادف ہے جب کنونشن کے شرکاء سے ہاؤس تقریباً بھر چکا تو صدر محترم جناب مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری نے سب کمیٹی کی تجویز مانگی۔ تجویز ہاؤس کے سامنے آگئی۔ سب کمیٹی کی تجویز پر غور کرنے کی اپیل کی گئی۔ اس مرحلہ پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی تشریف لے آئے۔ تجویز پرلے دے شروع ہوئی۔ ہاؤس نے بیک آواز اس تجویز کے خلاف رائے کا اظہار کیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا محمد علی نے مولانا احتشام الحق کی معرفت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو کہلوایا کہ آپ اپنی تجویز دلائل دے کر تقریر فرمائیں۔ ہم جو سب کمیٹی کے ارکان ہیں اخلاقاً مجبور ہیں کہ آپ کو ووٹ دیں۔

Marfat.com

آپ اٹھ کر کچھ فرمائیں تو سہی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے فرمایا کہ اس تجویز کی اب ضرورت نہیں ہے۔ میں اس پر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ صاحب صدر جناب مولانا سید ابوالحسنات صاحب نے تجویز کے متعلق جچے تلے مگر مختصر الفاظ میں اظہار خیال فرما کر سب کمیٹی کو خلاف ضابطہ قرار دیا اور فرمایا کہ یہ کنونشن صرف تحفظ ختم نبوت اور اس کے متعلق مطالبات کے لیے بلوائی گئی ہے۔ سب کمیٹی کی تجویز حدود کنونشن سے باہر ہے۔ چنانچہ سب کمیٹی کی تجویز ختم ہوگئی۔

(۱۲)___ اب صدر محترم کے ارشادات کے بعد اصل مسئلہ پر از سر نو تبادلہ خیال شروع ہوا۔ سب سے پہلے مولانا عبدالحامد بدایونی نے تحریک ختم نبوت اور آئندہ پروگرام کے بارے میں ایک برجستہ تقریر فرمائی۔ یہ تقریر ہاؤس کے جذبات کی صحیح ترجمانی تھی۔ ان کے بعد صاحب صدر نے مجھے حکم دیا کہ میں وہ تمام واقعات اور مراحل جن سے تحریک ختم نبوت آج تک گزری ہے مختصراً بیان کروں۔ دس پندرہ منٹ میں وفود کی ملاقاتوں اور تحریک کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد میں نے اپنی رائے کا اظہار لگی لپٹی رکھے بغیر کر دیا۔

تجویز کس طرح تیار ہوئی؟

(۱۳)___ میں تقریر کر کے بیٹھنے لگا تو صدر محترم کی اجازت سے حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی نے مجھے ارشاد فرمایا کہ آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا اور ہاؤس کے سامنے جو رائے پیش کی ہے اسی کے مطابق تجویز بھی تو لکھیے۔ یہاں بھی یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ ہاؤس میں بحث ہو رہی تھی تو میں نے کاغذ کی ایک سلپ پر تجویز کے متعلق ایک مسودہ مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب صاحب صدر نے مجھے تجویز لکھنے اور پیش کرنے کی ہدایت فرمائی تو میں نے اسی وقت مولانا مجاہد الحسینی صاحب سے سادہ کاغذ طلب کیا اور وہیں تجویز مکمل کرنے بیٹھ گیا۔ ہاؤس کی کاروائی جاری تھی۔ زبانی تجویزیں یکے بعد دیگرے چلی آ رہی تھیں۔ میں نے اپنے مسودہ میں وہ سب کچھ شامل کر لیا۔ جو میں اپنی تجویز لکھتے وقت مختلف حضرات کی زبانی سن رہا تھا میری تجویز دراصل ہاؤس کی تجویز تھی۔ میں نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے نئے کاغذ پر تجویز کی نوک پلک ٹھیک کر کے لکھنا شروع کیا۔ تجویز لکھی گئی تو مجھے ایک بار مختصر سی تقریر کا پھر موقع دیا گیا۔ چنانچہ میں نے تقریر کے بعد تجویز پیش کی جو میری ان گذارشات کی منہ بولتی، شہادت ہے۔

تجویز

(۱۴)___ ''اس حقیقت کے پیش نظر کہ خواجہ ناظم الدین کی بے بس حکومت قوم کے متفقہ مطالبا

Marfat.com

کودرخور اعتناء نہیں سمجھتی اور اب موجودہ حکومت سے مرزائیوں کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات منظور ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔آل مسلم پارٹیز کنونشن کا یہ اجلاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بحالات موجودہ قوم کے بنیادی مطالبات کو منوانے کے لیے براہ راست اقدام ازبس ناگزیر ہے جسے بروئے کارلانے کے لیے ذیل کی صورتیں اختیار کی جائیں۔

(ا)۔ چونکہ حکومت اس وقت تک اپنی خصوصی مصلحتوں کی بناء پر مرزائیوں کو سرکاری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوئی۔اس۔لیے ازخود اس فرقہ مرزائیہ کو ملت اسلامیہ سے مکمل طور پر علیحدہ کرنے کے تمام وسائل اختیار کرتے ہوئے ان کا مکمل بائیکاٹ کردیا جائے۔

(۲)۔ اگرچہ ایک عرصہ سے مرزائی وزیرخارجہ سر ظفراللہ خاں کے خلاف قوم متفقہ طور پر برطرفی کا مطالبہ کرکے اپنی قطعی بداعتمادی اور بیزاری کا اظہار کرچکی ہے۔مگر موجودہ حکومت بہانوں سے اُسے نظرانداز کرتی رہی ہے۔

لہٰذا کنونشن اپنے اس مطالبہ میں حق بجانب ہے کہ خواجہ ناظم الدین کی کابینہ فی الفور مستعفی ہوجائے تاکہ اسلامیان پاکستان اپنے دینی عقائد اور اسلامی روایات کو مکمل طور پر محفوظ کرسکیں' متذکرہ صدر مطالبات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کنونشن کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے:۔

(ا)۔ آل مسلم پارٹیز کنونشن ملک کی مقتدر اسلامی شخصیتوں اور مختلف دینی جماعتوں کے نمائندوں کو اپنی جنرل کونسل کا رکن قرار دے۔

(ب): یہ جنرل کونسل اپنے میں سے پندرہ اراکین پر مشتمل کونسل آف ایکشن یعنی مجلس عمل منتخب کرے۔جن میں سے مفصلہ ذیل آٹھ اراکین کو یہ کونسل منتخب کرکے انہیں اختیار دیتی ہے کہ وہ جنرل کونسل کے اراکین میں سات مزید ارکان کو مجلس عمل کے لیے منتخب کریں منتخب شدہ ارکان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(ا)۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۲)۔امیر شریعت مولانا سیدعطاء اللہ شاہ بخاری۔(۳)۔مولانا عبدالحامد بدایونی (۴)۔مولانا ابوالحسنات سید احمد قادری (۵)۔مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی (۶)۔علامہ کفایت حسین صاحب (۷)۔ابوصالح محمد جعفر پیر صاحب سرسینا شریف (۸)۔مولانا محمد یوسف کلکتوی۔

(ج)۔ کونسل آف ایکشن کو اختیار ہوگا۔کہ وہ حسب ضرورت تحریک کا صدر مقام مقرر کرے اور متذکرہ مطالبات تسلیم کروانے کے لیے مناسب لائحہ عمل مرتب کرے۔

Marfat.com

(د)۔ کونسل آف ایکشن کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے بیشتر اپنے میں سے ایک نمائندہ وفد ترتیب دے۔ جو مرکزی کابینہ سے ملاقات کر کے اور اسے قوم کے آخری فیصلہ سے مطلع کرے۔ اگر مناسب سمجھے تو دوٹوک جواب حاصل کرنے کے لیے مناسب دنوں کی مہلت بھی دے۔

نیز مجلس عمل کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنے طے کردہ پروگرام کی تکمیل کے سلسلے میں عوام الناس کو بہر حال پرامن رہنے کی تلقین کرے۔

محرک۔ تاج الدین انصاری۔ موید ین۔ مولانا الحامد بدایونی قادری۔ علامہ حافظ کفایت حسین صاحب، صاحبزادہ فیض الحسن صاحب، مولانا محمد امین امیر جماعت ناجیہ سُرحد، شیخ حسام الدین صاحب، قاضی احسان احمد صاحب اور مولانا محمد علی صاحب۔

(۱۵) یہ تھی وہ تجویز جس کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے بیان حقیقت میں فرماتے ہیں کہ تاج الدین اٹھے اور ایک لکھی لکھائی تجویز پڑھنے لگے۔ ''میں اس مرحلہ پر انصاف پسند دنیا سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ میری پیش کردہ تجویز کا غور سے مطالعہ کریں اور پھر خود ہی انصاف فرمائیں کہ یہ طویل تجویز جس میں آٹھ حضرات کو منتخب کیا گیا اور بقایا سات کو نام زد کرنے کی اجازت دی گئی ہو۔ یہ تجویز میں گھر سے لکھ کر لا سکتا تھا؟ مجھ غریب کے دامن سے جماعت اسلامی کے قابل احترام امیر نے کیسی کیسی تہمتیں باندھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے؟ محولہ بالا تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی اپنے بیان میں اقرار کرتے ہیں کہ انہوں نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی (مجلس عمل) کا اجلاس

(۱۶)___ اس تجویز کے پاس ہو جانے کے بعد اسی ہاؤس میں صاحب صدر کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ جو آٹھ حضرات منتخب ہوئے ہیں۔ وہ آج رات 8:30 ساڑھے آٹھ بجے دفتر مجلس احرار اسلام بندر روڈ پر میٹنگ کریں اور بقایا سات ممبران کو بھی نام زد کریں۔ اور وفد مرتب کر کے پاس شدہ تجویز کے مطابق وزیر اعظم سے وقت لے کر ملاقات بھی کر لیں۔ دُور دراز سے آئے ہوئے لوگ گھروں کو واپس چلے گئے تو ان کا جمع کرنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اس وقت فرداً فرداً سب کو وہیں اطلاع کی گئی۔

اس مرحلہ پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری نے

Marfat.com

اعلان کیا کہ مصروفیت کی وجہ سے اگر ہم مجلس عمل (مشتمل پندرہ ۱۵، اراکین) کے اجلاس میں شامل نہ ہوسکیں تو ہم اپنی جگہ اپنی جماعت کے جس رکن کو بھیجیں گے۔ وہ ہماری طرح ذمہ دار ہوگا۔ ہاؤس نے یہ بات مان لی۔ چنانچہ اسی فیصلہ کے مطابق آخری اجلاس میں مولانا سید ابوالا علیٰ مودودی صاحب کی جگہ ان کے نائب امیر جناب مولانا سلطان احمد صاحب شریک ہوئے تھے۔ اور اجلاس کی کاروائی میں حصہ لے کر اپنی قیمتی رائے سے حاضرین کو مستفیض فرمایا تھا۔

اتفاقیہ دعوت

(۱۷) ____ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے معتقدین میں سے ایک سوداگر نے اسی رات شرکاء کنونشن کو ایک عشائیہ دیا مجھے اس وقت اراکین مجلس عمل کے یہ چند نام یاد ہیں۔ جو دعوت میں شریک ہوئے۔ مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا محمد علی، شیخ حسام الدین، سید مظفر علی شاہ شمسی۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی اور نام اس وقت میرے حافظہ سے اُتر گیا ہو۔ دعوت سے فارغ ہوکر ہم میں سے کسی نے کہا کہ لو بھئی دفتر مجلس احرار اسلام کے قریب ہی دعوت ہوئی ہے۔ میٹنگ کے لیے زیادہ آسانی ہوگی۔ مولانا محمد علی صاحب کو کہا گیا کہ وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ہمراہ لے کر دفتر میں آئیں۔ میں خود اُٹھ کر مولانا محمد علی کے ہمراہ ہولیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہم سے تھوڑے فاصلہ پر تشریف فرما تھے۔ جب مولانا محمد علی نے ان سے کہا کہ سید صاحب میٹنگ میں تشریف لے چلئے تو سید صاحب فرمانے لگے اس میٹنگ میں کیا کچھ ہونا ہے۔ (یہ سید صاحب کا تجاہل عارفانہ تھا) مولانا محمد علی نے کہا جو کچھ پاس ہوا ہے وہی سب کچھ ہونا ہے۔ سات حضرات کی نام زدگی وفد کی ترتیب ملاقات وغیرہ" سید صاحب فرمانے لگے۔ آپ یہ نامزدگیاں وغیرہ خود ہی کر لیجئے۔ یہ تو کوئی اہم کام نہیں ہے۔ میں اس میٹنگ میں ضرور چلتا مگر مجھے تو مولوی صاحبان نے دستور کے سلسلہ میں ترمیمات مکمل کرنے کا کام سونپ دیا ہے۔ شاید رات بھر مجھے کام کرنا پڑے۔ آپ اس میٹنگ کی کاروائی خود ہی کر لیجئے۔" مولانا محمد علی نے اصرار کیا کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے ضرور تشریف لے چلیں۔ اب تو زیادہ کام نہیں ہے۔ تجویز کے مطابق پروگرام بنا دینا ہے۔ سید صاحب نے مجبوری کا اظہار کیا۔ آخر میں مولانا محمد علی صاحب نے سید صاحب سے دریافت فرمایا کہ آپ کسی نام کی سفارش تو کریں۔ دو چار نام ہی لکھوائیے۔ سید صاحب فرمانے لگے۔ مولانا یہ کام آپ خود ہی کر لیں۔ بس اتنا خیال رکھیے کہ مشہور مشہور بااثر لوگوں کو نامزد کیجئے گا۔ وہاں یہ کچھ فرمانے کے بعد اب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو کچھ نہیں

Marfat.com

یاد رہا۔ اب وہ سرے سے مکر رہے ہیں۔ اور فرما رہے ہیں کہ ہم جو کنونشن سے اُٹھے تو اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ وہ سب بے ضابطہ ہے ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے یہ کب فرمایا؟

(۱۸) جب دودھ پینے والے مجنوں سے کٹورا بھر خون مانگا گیا۔

قبائے لالہ خونیں قبائیست

کہ بربالائے نامرداں درازاست

اس کے برعکس مجلس عمل کے ڈکٹیٹر اوّل اور آل مسلم پارٹیز کنونشن پاکستان کے صدر جناب مولانا ابوالحسنات محمد احمد صاحب قادری مدظلہ، نے انکوائری کورٹ میں اعلان کیا کہ "ہم تحریک ختم نبوت کے ذمہ دار ہیں"۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مجلس عمل (راست اقدام کمیٹی)

(۱۹) ___ ۱۰/ جنوری کو دفتر مجلس احرار اسلام میں تقریباً ۹ بجے شب اراکین نے باقی سات اراکین کو نامزد کر کے پندرہ اراکین کی فہرست مکمل کر لی اور ایک وفد مرتب کر کے اسے اختیار دیا گیا کہ کنونشن کا ریزولیوشن اور ۳۰ یوم کا میعادی الٹی میٹم وزیراعظم کے سپرد کر دے۔ جن سات اراکین کی نامزدگی کے بعد پندرہ اراکین کی فہرست مکمل کی گئی۔ ان کے ناموں کو روزنامہ تسنیم میں ۲۲ جنوری کو آخری صفحہ پر چوکھٹے میں شائع کیا گیا۔ یہ ہے جماعت اسلامی کے آرگن روزنامہ تسنیم لاہور مورخہ ۲۲ جنوری کا چوکھٹا۔

مولانا ابوالحسنات، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مودودی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا احتشام الحق تھانوی، علامہ کفایت حسین، مولانا اطہر علی (بنگال)، پیر ابوصالح محمد جعفر، مولانا اختر علی خاں (زمیندار) پیر غلام مجدد سرہندی، صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ)، مولانا محمد یوسف کلکتوی، مولانا نورالحسن بخاری۔

جماعت اسلامی کی جانب سے مرکزی کارروائی کی تصدیق

(۲۰) ___ کراچی سے واپسی پر ۲۶/ جنوری کو آل مسلم پارٹیز کنونشن کا ایک اہم اجلاس زیر صدارت مولانا ابوالحسنات محمد احمد صاحب قادری زمیندار منشن لاہور میں 1:30 ڈیڑھ بجے منعقد ہوا۔

Marfat.com

جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی، تاج الدین انصاری، مولانا غلام محمد صاحب ترنم مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، صاحب زادہ سید فیض الحسن صاحب مولانا اختر علی خاں صاحب مالک زمیندار، حافظ خادم حسین، مولانا خلیل احمد، مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا ارشد پناہوی، سید مظفر علی شمسی۔ مولانا محمد بخش صاحب مسلم اس اجلاس میں جہاں جماعت اسلامی کے نفس ناطقہ جناب مولانا نصر اللہ خاں صاحب عزیز (جن کی مساعی جمیلہ معاملہ فہمی اور ذاتی تعلقات کی وجہ سے جماعت اسلامی کو عوام سے روشناس ہونے کا موقع ملا جو ''کوثر'' و ''تسنیم'' اور ''ایشیا'' کے مدیر ہیں) موجود تھے مجھے صدر محترم نے حکم دیا کہ میں کنونشن اور کونسل آف ایکشن کی کاروائی بیان کروں۔ بے کم و کاست جو کچھ ہوا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ اس اجلاس میں مجلس عمل میں پنجاب نے مندرجہ ذیل تجویز اتفاق رائے سے منظور کی۔ جسے دوسرے دن روزنامہ ''زمیندار'' اور پنجاب کے دوسرے اخبارات نے شائع کیا۔ صوبہ پنجاب کے بعض ذمہ دار اور کارکنوں کو بھی اس اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔

قرارداد

(۲۱)___ آل مسلم پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل کا یہ اجلاس مرکزی کنونشن کی پاس کردہ قرارداد کی پر زور تائید کرتا ہے اور مرکز کو یقین دلاتا ہے کہ مسلمانانِ پنجاب مرکز کی آواز پر جانی و مالی قربانی سے ہرگز دریغ نہ کریں گے۔ اسی کاروائی کے ہمراہ مرکزی کنونشن کی قرارداد اور جو وفد وزیر اعظم سے ملا۔ اس کے شرکاء کے نام بھی درج ہیں۔ یہ تمام کاروائی تقریباً سب اخبارت نے شائع کی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے

(۲۲)___ کہ مولانا نصر اللہ خاں صاحب جماعت اسلامی کے نمائندہ نے مرکزی کنونشن کی کاروائی پر نہ صرف مہر تصدیق ثبت کی بلکہ وہ ایک قرارداد کے ذریعے اعتماد کلی کے اعلان کے بعد اثیار و قربانی کا یقین دلانے میں بھی پیش پیش تھے۔ اس حقیقت کی موجودگی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اس طرح صاف مکر جانے کی جرأت کس طرح ہوئی؟ شاید انہیں یہ خیال گذرا ہو کہ احرار کے دفاتر میں تو پولیس نے جھاڑو پھیر ہی دیا ہے۔ اب جو دل چاہے اقرار کرو اور جہاں جی چاہے مکر جاؤ۔ کوئی ثبوت نہیں ہے۔

مگر میں تو روزنامہ تسنیم اور دوسرے اخبارات سے صحیح مواد فراہم کر رہا ہوں تا کہ حضرت

Marfat.com

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ''راست گوئی'' سب پر عیاں ہو جائے۔ مولانا موصوف اللہ کے خوف اور اللہ کے رسول کی شفاعت کے ذکر مبارک کے ساتھ ساتھ جب دوسروں کی نیت پر ناروا حملے کرتے ہیں انہیں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ ان کے تقدس کے شیش محل پر اگر کسی مظلوم نے حق گوئی کا پتھر مار دیا تو ان کا شیش محل چکنا چور ہو جائے گا۔ بہر حال جہاں انہیں دوسروں کی نیت پر حملہ کرنے کا حق ہے۔ ہم ان سے اپنا کم از کم حق مانگتے ہیں۔ کہ وہ ہمیں اصل حقیقت بیان کرنے کی اجازت تو دیں۔

حقیقت حال

(۲۳)____ ۱۸ جنوری تک جماعت اسلامی تحریک ختم نبوت کو نواں ۹ نقطہ بنا کر ہضم کر جانے کی ترکیبیں سوچتی رہی۔ مگر جب ملک کے نمائندوں نے جو پاکستان کے کونے کونے سے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عقیدت سے سرشار ہو کر کراچی میں جمع ہوئے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نیک ارادوں کو ناکام بنا دیا۔ تو جماعت اسلامی دو ذہنی میں مبتلا ہو گئی۔ تحریک کا شباب دیکھ کر جماعت اسلامی اس سے الگ ہونا، نہیں چاہتی تھی۔ وہ پانچویں ۵ سوار کی حیثیت سے پیچھے پیچھے چلنا چاہتی تھی۔ بدیں خیال کہ تحریک کامیاب ہو تو آگے بڑھ کر اعلان کر دیا جائے کہ دیکھا۔ ہم نے پالا مار لیا اور اگر کسی صورت جماعت اسلامی اس مقدس تحریک کو سبوتاژ کر سکے تو پھر یہ اعلان کر دیا جائے۔ کہ اس تحریک میں شامل ہونے والے بے وقوف تھے اور چلانے والے خود غرض اور غدّار تھے۔ اس دو ذہنی نے جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو دین اور دنیا دونوں میں کہیں کا نہ رکھا۔

جماعت اسلامی کیا کرتی رہی؟

(۲۴)____ ۱۴ جنوری کو جماعت اسلامی نے موچی دروازہ لاہور میں جلسۂ عام کیا۔ اگر مولانا مودودی صاحب واقعی مجلس عمل آل مسلم پارٹیز کنونشن سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ تو ایمانداری سے انکا یہ فرض تھا کہ وہ اس جلسہ عام میں مسلمانوں کو اپنے ارادہ سے خبردار کرتے اور انہیں بتاتے کہ بدنیت اور خود غرض لوگ مقدس تحریک کے نام پر ملک اور ملت سے غداری کرنے والے ہیں۔ لوگو خبردار ہو جاؤ..... مگر..... مولانا سیدنا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کیا فرمایا؟ مولانا موصوف نے مطالبات کو جائز قرار دیتے

Marfat.com

ہوئے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر ان مطالبات کو نہ مانا گیا تو ہندو مسلم فسادات کی یاد تازہ ہو جائے گی اور ذمہ داری گورنمنٹ پر ہوگی۔

(۲۵)___ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں بڑی ہوشیاری سے ہندو مسلم فساد کا ذکر اس انداز میں بیان کیا کہ ہو سکے تو وہ ہماری پر امن کوششوں کو ناکام بنا دیں اور امن پسند قوم کا ذہن فسادات کی جانب منتقل کر دیں۔ کراچی کنونشن کے آخری اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا موصوف نے اپنے بیان میں جو ارشاد فرمایا کہ دوسرا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ اگر میں اس وقت علیحدہ ہو جاؤں تو صرف اپنا ہی دامن اس فتنہ سے بچا لے جاؤں گا۔ اس بناء پر میں نے کنونشن سے علیحدگی کا ارادہ ترک کر دیا'' مولانا موصوف کس دل گردہ کے بزرگ ہیں جو ختم نبوت کی مقدس تحریک کو فتنہ کا نام دے رہے ہیں۔ یہ گستاخانہ جرأت تو مرزائیوں ایسے منہ پھٹ گروہ کو بھی آج تک نہ ہوئی تھی؟

ہر کس از دست وگر نالہ کند
سعدی از دست خویشتن فریاد

بہر حال مولانا موصوف کے اس بیان میں کوئی جان نہیں۔ تحریک میں شامل رہنے کی وجہ آج بیان فرمائی جا رہی ہے یہ بھی افسانہ اور محض افسانہ ہے۔ یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ مولانا خود اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو قوم کو اُکسا دیا جائے اور اپنا دامن حتی الوسع بچا لیا جائے۔

مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ انہوں نے خطوط لکھ کر صدر مجلس عمل دلائی کہ ڈائریکٹ ایکشن کی جو تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ بالآخر سخت نقصان دہ ثابت ہوں گی۔ گویا مولانا اندر خانہ تو نصیحت کرتے تھے۔ مگر جب جلسہ عام میں تشریف لاتے تھے تو ہندو مسلم فسادات کی یاد تازہ کرنے کا بندوبست فرما رہے تھے۔

جماعت اسلامی کیا چاہتی تھی؟

(۲۶)___ مارچ کے دوسرے ہفتہ میں پارلیمنٹ کا اجلاس کراچی میں ہو رہا تھا۔ جماعت اسلامی اس اجلاس پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھی۔ جماعت اسلامی یہ چاہتی تھی کہ اس اجلاس پر ہلہ بول دیا جائے۔ گولی چلے یا خون خرابہ ہو۔ اسے اس بات کی پروانہ تھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی حیلوں..... بہانوں سے نوٹس کی تاریخ کو ۹ تاریخ تک بڑھانا چاہتی تھی۔ جماعت اسلامی کے نمائندے چونکہ مجلس عمل کو اپنے دلی خیالات سے آگاہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ڈائریکٹ

Marfat.com

ایکشن کی تاریخ کو بڑھانے کے لیے دوسری بودی قسم کی دلیلیں پیش کرتے تھے۔

آخر بھید کب کھلا؟

(۲۷)___ ۲۶، فروری کو جس دن مجلس کا آخری اجلاس کراچی میں بلوایا گیا۔ جماعت اسلامی کے نائب امیر جناب مولانا سلطان احمد صاحب اس اجلاس میں جماعت کی جانب سے تشریف لائے اور ذمہ دارانہ حیثیت سے اجلاس میں شرکت فرمائی۔ اس روز وہ اپنے دلی جذبات کو چھپا نہ سکے وہ فرمانے لگے کہ ''آپ آج کی بجائے ۹ مارچ کو الیکشن کا اعلان کرتے تو ہم آپ کو اسمبلی ہال پر ہنگامہ کر کے دکھاتے اب بھی اگر آپ حضرات ۹ تاریخ تک کے لیے اپنا پروگرام ملتوی کر دیں تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ کم از کم پچیس ۲۵۰۰۰ ہزار کا ہجوم اسمبلی ہال میں خود لے جائیں گے۔ اور ایسا ہنگامہ کر دکھائیں گے جو تاریخ میں یاد رہے''۔

ہم سب نے ان کے خیالات پر تعجب کا اظہار کیا اور مجھے یاد ہے کہ میں نے ان کی خدمت میں صفائی سے عرض کیا کہ ہم ہرگز ہنگامہ نہیں چاہتے۔ ہم تو تحریک کو پرامن طریقے پر چلانا چاہتے ہیں۔ اور اب تاریخ کا بدلنا بھی میرے اور آپ کے اختیار سے باہر ہے'' جب پروگرام بننے لگا۔ اور طے ہوا کہ پانچ پانچ رضا کار غیر آباد راستوں سے وزیر اعظم اور گورنر جنرل کی کوٹھیوں پر جائیں تو جماعت اسلامی کے نمائندے مولانا سلطان احمد صاحب نے فرمایا یہ طریقہ درست نہیں۔ میں یہ مشورہ دوں گا کہ رضا کار بارونق سڑکوں پر سے جانے چاہئیں۔ اور انکا جلوس شہر کے آباد حصوں سے گزرنا چاہیے۔ ہم نے عرض کیا کہ اس طرح ہنگامہ اور بدامنی کا اندیشہ ہے۔ عوام کو کس طرح سنبھالا جائے گا۔ اور اگر پولیس نے خود ہی اپنے آدمی جلوس میں داخل کرا کے فساد کرا دیا تو تحریک کو دھکا لگے گا۔ مولانا سلطان احمد صاحب تنہا شخص تھے۔ جو اس وقت ہنگامہ پسندی کا اظہار کرتے تھے۔ مگر کسی کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے۔ اور بالآخر انہیں مجلس عمل کے مجوزہ پروگرام کی تائید کرنا پڑی۔

(۲۸)___ آخر کار جماعت اسلامی کے اپنے ذمہ دار نمائندہ نے آخری اجلاس پر مہر تصدیق ثبت فرما کر گھر کی راہ لی اور اپنے چالیس ۴۰ ساتھیوں میں آرام سے جا بیٹھے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ انہیں کوئی گرفتار کرنے نہ گیا۔ مگر ہم سب رات ہی کو دھر لے گئے۔ صبح کی آذان ہوئی تو اپنے صدر محترم مولانا ابوالحسنات کے ہمراہ کراچی جیل میں تھے۔

۱۸ جنوری سے لیکر ۲۶ فروری تک مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تحریک کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ وہ یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ اگر حکومت مسلمانوں کے مطالبات آخری وقت بھی تسلیم

Marfat.com

کر لیتی ہے تو جماعت اسلامی تحریک میں موجود ہے۔ کراچی میں مولانا سلطان احمد نائب امیر جماعت اسلامی یعنی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے خلیفہ صاحب فوج ظفر موج کے کمانداروں میں بہ نفس نفیس موجود ہیں۔ خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب قادیانی مسئلہ لکھ کر تحریک میں شمولیت کا دستاویزی ثبوت لئے کھڑے ہیں۔ حتیٰ کہ مارشل لاء کے نفاذ سے ایک روز پہلے گورنمنٹ ہاؤس بیچ کی دیوار پر کھڑے گورنمنٹ کو اس امید پر آنکھیں دکھا رہے ہیں کہ شاید مسلمانوں کے متفقہ مطالبات دو ایک روز تک مانے جانے والے ہیں مگر.....

جب مارشل لاء کا اعلان ہونے لگا

(۲۹)___ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دیوار کے اُس پار کود گئے اور فرمانے لگے کہ میرا اس تحریک سے کیا واسطہ؟ یہ تو چند خود غرض، بے ایمان اور غدّاروں کی تحریک ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ دیوار کے اُس پار کودتے وقت مولانا کا دامن کسی کیل میں پھنس کر چاک ہو گیا۔ جسے وہ دو ۲ سال تک جیل میں بیٹھ کر رفو کرتے رہے۔ آگے سے پھٹا ہوا دامن چیرہ دستیوں کی اب بھی غمازی کرتا ہے اور مولانا ہیں کہ اپنی صفائی میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اور کہے چلے جا رہے ہیں کہ میں پاکباز ہوں۔ میری جماعت صالحین کی جماعت ہے باقی سب چور ہیں، غدار ہیں، خود غرض ہیں ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

پہلے ہی کیوں نہ بھانپ لیا؟

(۳۰)___ اپنے بیان کے آخر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بالکل بچوں کی سی بات کہہ ڈالی۔ فرماتے ہیں کہ ''یہ لوگ میری پرانی تحریریں جو کنونشن سے پہلے کی ہیں۔ نکال نکال کر میری گمراہی و بے دینی کا یقین دلاتے پھر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص قادیانیوں سے بھی بدتر ہے۔ میں اس طرح کی فضول باتوں کا کیا جواب دُوں۔ مگر پبلک کو ان سے صرف اتنی بات پوچھنی چاہیے کہ مودودی اگر ایسا ہی سخت گمراہ تھا تو ۵۳ء کی کنونشن اور مرکزی مجلس عمل میں آپ نے اس کی شرکت کیسے گوارا فرمائی تھی۔ وغیرہ''۔

حضور والا! کنونشن میں شرکت کے بعد ہی مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ آپ جو اسلام اسلام پکار کر اسلامی دستور کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ آپ کیا ہیں۔ آپ کی اصل خواہش کیا ہے؟ پبلک نے آپ کو تحریک

Marfat.com

ختم نبوت میں اچھی طرح جان پہچان لیا ہے۔اب آپ یہ بھی دیکھ لیں گے کہ پبلک آپ سے کیا کچھ دریافت کرتی ہے۔ آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ اپنی صفائی میں آپ نے کوئی معقول دلیل پیش نہیں فرمائی۔کسی جیب تراش نے پکڑے جانے کے بعد کبھی یہ صفائی پیش نہیں کی کہ مستغیث نے مجھے قریب ہی کیوں آنے دیا تھا؟ آپ ایسے پڑھے لکھے ذمہ دار انسان سے اس قسم کی بے معنی باتوں کی کبھی توقع نہیں تھی۔ بہرحال، آپ دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ جتنا زور لگایئے گا۔ اُسی قدر زیادہ دھنستے چلے جایئے گا میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ اپنی غلطی یا تحریک ختم نبوت سے غداری کا اقرار کرنے سے رہے۔ بحث کے لیے آپ کے پاس وہ سب سامان موجود ہے۔جس سے آپ کافی عرصہ بحث جاری رکھ سکتے ہیں۔مگر ہمیں اس بحث سے مطلب؟

جہاں تک پبلک کی معلومات کا تعلق ہے۔ہم نے پبلک سے یہی کہتے سنا ہے کہ آپ نے تحریکِ ختم نبوت سے غداری کی ہے۔اُس وقت آپ اور آپ کی جماعت منافقت سے کام لے رہے تھے اور اب آپ صاف مکر رہے ہیں۔وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوابُ۔

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر؟
جو چپ رہے، گی زبان خنجر؟ لہو پکارے گا آستیں کا!

مولانا مودودی کراچی جاتے ہوئے منٹگمری اسٹیشن پر پہنچے تو آپ سے ملاقاتیوں نے سوال کیا۔

''آپ ''الاعتصام'' کے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟''

آپ نے جواب میں فرمایا''

''میں ہر معقول سوال کا جواب دینے کو تیار ہوں''

''محترم مدیر الاعتصام مورخہ ۱۹، اگست کے اداریہ میں رقم طراز ہیں''۔

''جماعت اسلامی کے امیر کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم کا جواب دینا سیاسین کا شیوہ ہوسکتا ہے۔ کسی دینی و مذہبی جماعت کے سربراہ کا نہیں علاوہ ازیں معقولیت و غیر معقولیت کا سہارا ہمیشہ وہی لوگ لیتے ہیں جو جواب سے عاجز آچکے ہوں۔ یا ان کا غرور و نخوت انتہائی درجہ کو پہنچ گیا ہو۔ کیا آ شمار بھی دو گرہوں میں سے کسی ایک میں تو نہیں ہوتا۔؟''

Marfat.com